

سلسلہ

پرویز

طالع اسلام ٹرسٹ، کلکتہ لائبریری

جملہ حقوق محفوظ

کتاب	-----	سلسبیل
مصنف	-----	غلام احمد پرویز
ایڈیشن	-----	تیسرا (ترتیب نو) 1997ء
ناشر	-----	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	-----	25-B گلبرگ II لاہور

طلوع اسلام ٹرسٹ کی کتب سے فروخت شدہ
آمدنی قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

فہرست مضامین

پیش لفظ

۱۔ میثاقِ خداوندی

۲۔ ایک نورانی صبح

۳۔ عبادت

۴۔ زکوٰۃ

۵۔ لارڈ برٹنڈرل سے ملاقات

۶۔ نجات

۷۔ ثواب

۸۔ نظریۂ ارتقاء اور قرآن

۹۔ مملکت کا قرآنی تصور

۱۰۔ وہ مرد درویش

صفحہ

۴

۸

۱۶

۲۲

۲۲

۵۳

۵۸

۸۲

۸۹

۱۱۴

۱۲۱

صفحہ

۱۳۰

۱۳۶

۱۴۵

۱۵۴

۱۶۱

۱۶۲

۲۱۲

۲۱۵

۲۲۸

۲۶۹

پروفیسر ٹی بی چوہدری سوالات - ۱۱

اُردو زبان میں نماز - ۱۲

قرآن کے باطنی معانی - ۱۳

لاہور کا ایک علمی مذکرہ - ۱۴

انسان اور خارجی کا مینا - ۱۵

اسلام ہی کیوں سچا دین ہے - ۱۶

انسان - ۱۷

دینِ خداوندی کے دشمن - ۱۸

اسلام کیا ہے - ۱۹

مشرک - ۲۰

ماہنامہ

پیش لفظ

”تاریخ کے ہر بے حس موڑ پر ایسے محروم الارث بچے ملیں گے جو اپنے ماضی کے ترکے کو خود چھوڑ چکے ہوں (کیونکہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے کے قابل نہیں تھے) اور جو کچھ مستقبل میں سامنے آنے والا ہو، اس کی نمود میں ابھی دیر ہو۔“

یہ تھے وہ حقیقت افروز اور فکر انگیز الفاظ جو جرمنی کے مشہور شاعر انقلاب ریلکے (RILKE) نے بیسویں صدی کے طلوعِ سحر کے وقت آنے والی نسل کے ذہنی اور قلبی اضطراب کو سامنے رکھ کر انتہائی درد و کرب میں ڈوب کر کہے تھے۔ جرمنی کی نئی نسل ان دنوں جس کرب و اضطراب میں مبتلا تھی، ہمیں اپنے پیش نظر موضوع میں اس کا تذکرہ مقصود نہیں۔ ہمارے سامنے خود اپنی ملت کی وہ داستانِ غم ہے جو انیسویں صدی کے آواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں اس برصغیر کے ہر قلبِ حساس کو خون کے آنسوؤں میں تھی۔ جن دنوں جرمنی کا یہ شاعر انقلاب اپنی نئی نسل کے داخلی ہیجان و اضطراب کا مرنیہ پڑھ رہا تھا، انہی دنوں ہمارے ہاں بھی، رنگون سے لے کر پشاور تک، ذہنی شکست اور فکری جمود کی دردناک تاریکیاں چھا رہی تھیں۔ اور نئی نسل قلب و نگاہ کی شدید کشمکش میں مبتلا دکھائی دے رہی تھی۔ وقت کے تقاضوں نے ہمیں اس نازک مقام پر لا کھڑا کیا تھا جہاں فکر و بصیرت کی روشنی میں ہی مستقبل کے سفر کا تعین ممکن تھا لیکن ہماری تربیت گاہیں، مسلک تقلید اور قدامت پسندی کی مقدس بارگاہوں سے جو ورثہ پارہی تھیں اس میں اور تو بہت کچھ رطب و یابس موجود تھا، فکر و بصیرت کی روشنی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ پوری ملت ذلت اور شکست کے زخموں سے مضمحل اور بے حال ہوئی جا رہی تھی اور ملت کے پیشوا موت کا وہی پرانا راگ الاپ رہے تھے کہ آنکھیں بند کئے اسلاف کی ان پامال راہوں پر قدم اٹھاتے چلے جاؤ اور جو کچھ لٹا ہے لٹ جائے دو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خوش فہمیوں اور خود فریبیوں کی اس گردشِ دلدلاہی میں افرادِ ملت کے سامنے نہ کوئی منزل رہی اور نہ دلوں میں ذوق

سفر کی امنگیں اور دولے۔

حیاتِ ملی کا یہی وہ صبر آزما اور جانگسل مرحلہ تھا جب اس کے مطلعِ تقدیر پر صبحِ امید کا ایک روشن ستارہ جلوہ بار ہوا۔ یہ سرسید علیہ الرحمۃ کی جلیل القدر اور گرانیہ شخصیت تھی جس نے زمانے کے چیلنج کو مردانہ وارلیک کہتے ہوئے ابھرتی ہوئی نئی نسل کی تعلیم و تربیت کا جہات آفریں منصوبہ ترتیب دیا اور ملت کے بے بال دہر شاہیں بچوں کو ذوقِ پرواز سے مالا مال کرنے کی گراں قدر سعی و کادش کی۔ دوسری طرف اس میحائے ملت نے فکر و اجتہاد کے صدیوں کے بند دروازوں کو مومنانہ فراست اور جرأت سے کھول کر رکھ دیا۔ اس قابلِ رشک ”جرم“ کے لئے سرسید کو مذہبی پیشوائیت کی بارگاہ سے کتنی بڑی ”سترا“ قبول کرنی پڑی، یہ بجائے خود ایک المناک داستان ہے لیکن سرسید کی اس جرأت و فراست پر ملت کا سلام ہو کہ اس نے سب کچھ مردانہ وار گوار کیا اور کارِ دینِ ملت کو ذمہ نئی شکست اور موت کے قبرستانوں سے بچا کر فکر و بصیرت، ذوقِ انقلاب اور جو ششِ کردار کی درخشندہ اور بسیط کارگرِ حیات میں لے آیا ہمارا نشاۃ ثانیہ کی یہ پہلی منزل تھی اور یہ پہلا میرِ کارِ دواں جب دنیا سے رخصت ہو رہا تھا تو اس کی قوم اپنے نئے ماحول کی ابھرتی ہوئی روشنی میں درخشندہ مستقبل کی منزلوں پر رنگِ امید چمائے ہوئے تھی۔

سرسید قوم کو نئی منزلوں کا ذوقِ سفر عطا کر کے رخصت ہو گئے۔ علی گڑھ کی تربیت گاہ ان کے فکر و عمل کا دوزخِ نگار شاہکار بن کر قوم کا گراں قدر ورثہ قرار پا گئی اور اس کی کشتِ نازِ علم و بصیرت سے ہزاروں لالہ دگل ابھر بھر کر نئی بہادری کے نقیب بننے لگے۔ انہی لالہ زاروں سے نور و نگہت کی دکنائیاں لے کر ایک نیا گلِ سرسبد مسکرایا اور انقلابِ نو کے اس طائرِ پیشین نے اپنے نغمۂ انقلاب سے فضاؤں چمن میں زندگی کی فیمیم جانفرا کو متحرک کر دیا۔ یہ گراں پایہ شخصیت علامہ اقبال کی تھی جنہوں نے نئی نسل کے قلب و نگاہ کو اپنی بصیرتِ قرآنی سے منور کیا۔ اس کے ذوقِ عمل کو نئی حرارت عطا کی اور اس کی امنگوں اور دلوں کو موجِ دریا کی طرح بڑھنے لیکن اقدارِ حیات کے ساحلوں میں پابند رہنے کی حکمت سمجھائی۔ اقبال کے نغمے قرآن کی دھڑاں انقلاب کے پتے ترجمان تھے اور ان کی حیاتِ بخشیں اور روحِ نوازیوں میں عظمتِ رفتہ کی باز آفرینیوں کے لئے ایک مردِ مومن کی تڑپ اور سوز و ساز انگہ دائیاں لے رہا تھا۔ ایسا حکیم انقلاب صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور اس کے سانچے رحلت پر یہ اندیشے ابھر آئے تھے کہ اس کے فکر و بصیرت کی عطا کردہ روشنی کہیں مذہبی پیشوائیت کے پھیلائے ہوئے اندھیروں کی زد میں نہ آجائے۔

لیکن الممتۃ لشد کہ یہ اندیشے غلط ثابت ہوئے اور عین اس وقت جبکہ ”دگر دانائے رازِ آید کہ ناید“ کے دھڑکے ملت کے سینے میں ایک کشمکشِ اضطراب برپا کئے ہوئے تھے، ”طلوعِ اسلام“ کی پہلی کرن دارِ سلطنتِ دہلی سے

ابھری۔ اور اس کی یتاب نگاہوں کے سامنے آگئی۔ یہی تھی وہ ”دولت پرویز“ جسے اقبالؒ کی ”لادوں کی بہا“ بننا تھا۔ کچھ مدت پہلے ہی تو اس مردِ قلندر نے کہا تھا کہ

بہا میری لڑا کی دولتِ پردیز ہے ساقی

اور موت سے پہلے یہی ”دولت پرویز“ طلوعِ اسلام کی پہلی اشاعت کی صورت میں اقبالؒ کے ہاتھوں میں تھی۔ اقبالؒ و پرویز کے فکری تعلقات، ان کے قلبِ دنگاہ کی ہم آہنگی اور ہم لڑائی، قرآن سے عشق کا گہرا رشتہ اور ملت کی عظمت رفتہ کی باز آفرینی کے لئے ربطِ باہمی کی ٹرپ اور غلش، یہ سب کچھ اس خوش آئند حقیقت کی نشاندہی کر رہا تھا کہ اقبالؒ نے خونِ جگر سے جس شمع کو روشن کیا تھا، وہ بجھ نہیں سکے گی بلکہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کی وضو نشانی بڑھتی اور پھیلتی چلی جائے گی۔ چنانچہ جب علامہ مرحوم کی وفات کے بعد بھی مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے معرکہ دین و وطن کی بحث کو از سر نو چھیڑ دیا تو پرویز صاحب نے اپنے جوابی بیان میں مولانا مرحوم کو یہ حقیقت یاد دلاتے ہوئے لکھا تھا کہ اگرچہ مے کدہ سے اٹھ کے چل دیا ساقی وہ مے، وہ خم، وہ صراحی، وہ جام باقی ہے

اللہ کا احسان ہے کہ اس جام و سبکو کی گردش کا سلسلہ اب بھری محفلوں میں جاری و ساری ہے اور صرف اقبالؒ کے پاکستان میں ہی محدود نہیں بلکہ اس کی کیف انگریزیاں امریکہ، برطانیہ اور سعودی عرب تک کیف و مستی کی بساط بچھائے ہوئے ہیں اور ہماری نئی نسل کے ”سیلم بیٹے“ اور ”طاہر بیٹیاں“ دینِ خداوندی سے جذب و اہٹاک کی سچی ٹرپ دلوں میں لئے اس خمکہ قرآنی کا رخ کر رہی ہیں جو حیاتِ انسانی میں حسین ترین انقلاب لانے کا داعی ہے۔

اپنی اس جہاں آراء و دعوتِ قرآنی کی بنا پر آج پرویز صاحب کو عصرِ حاضر کے ایک شہرہ آفاق مفکرِ قرآن کا مقام و منصب حاصل ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے اربابِ فکر و نظر ان کی وساطت سے قرآن کی دعوتِ انقلاب کے مضمرات کو سمجھنے کے لئے متمتعی دکھائی دے رہے ہیں اور اسی بنا پر دعوتِ قرآنی کے ان شاہ پاروں کو جو پرویز کے قلم سے منظرِ اشاعت پر آئے، انگریزی زبان میں منتقل کرنے کا کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ معراجِ انسانیت، جوئے نور، برقی طور، شعاعِ مستور، ابلیس و آدم، من دیزواں، انسان نے کیا سوچا؟، نظامِ ربوبیت، سیلم کے نام خطوط، طاہرہ کے نام خطوط، لغات القرآن، مفہوم القرآن، اسبابِ زوالِ امت دعوتِ قرآنی کے وہ نمایاں شاہکار ہیں جن میں سے بعض کئی کئی ایڈیشنوں میں منظرِ اشاعت پر آچکے ہیں۔ اسلام کیا ہے؟ ان کی تازہ تصنیف ہے۔ جسے بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ یہ سب قلمی کاوشیں، قرآنی فکر و بصیرت کے درخشاں چراغ ہیں جو ہر محفلِ انسانی کو نئی روشنی عطا کرتے رہیں گے اور علم و بصیرت کی ہر بارگاہ ان سے کسبِ نور کی سعادت حاصل کرے گی۔

ان گرانقدر تصانیف کے علاوہ گزشتہ پچیس تیس برس میں جو اہم مسائل انسانی زندگی میں ابھرے، ان پر قرآن کا نقطہ نظر پرویز صاحب کے ان مضامین، مقالات، خطابات اور تقاریر کی صورت میں سامنے آتا رہا جو مختلف اوقات میں ریڈیو پر نشر ہوتے، پبلک اجتماعات میں سنے گئے اور طلوع اسلام کے کالموں میں شائع ہوتے رہے۔ مدت ہوئی ان شاہکار کو ”فردوسِ گم گشتہ“ کے نام سے شائع کیا گیا تھا۔ جب یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ بک گئی، تو کئی سال کے وقفے کے بعد پچھلے سال ان مقالات کی بڑھتی ہوئی تعداد کو ایک نئی ترتیب دی گئی۔ اس سلسلہ ترتیب کا پہلا حصہ ”فردوسِ گم گشتہ“ کے دوسرے ایڈیشن کے نام سے پچھلے سال شائع کر دیا گیا تھا۔ زیر نظر کتاب ”سلسیل“ اسی کا دوسرا حصہ ہے اور اس میں پرویز صاحب کے بڑے گرانقدر مضامین آگئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ پرویز صاحب کے دیگر شاہکاروں کی طرح یہ اہم تالیف بھی قارئین کو عصر حاضر کے پیش آمدہ مسائل کے بارے میں ایک نئی روشنی عطا کرے گی جس سے مسائلِ زندگی کے بہت سے گوشے نکھر کر سامنے آجائیں گے اور قلب و نگاہ کو ایک نئی آب و تاب میسر آئے گی۔

اس کے بعد مقالاتِ پرویز کا تیسرا مجموعہ بھی اپنے وقت پر شائع ہوگا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شمعِ قرانی کو تاویل

روشن رکھے۔ والسلام۔

۲۵۔ بی، گلبرگ، لاہور۔

مارچ ۱۹۶۷ء۔

(صفدر سلیمی)

ناظم ادارہ طلوع اسلام

میثاقِ خداوندی

(جولائی ۱۹۴۹ء)

عام طور پر قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی حکومت کی ملازمت اختیار کرتا ہے تو اسے ایک ایسا منشور دیا جاتا ہے جس میں اس کے تمام فرائض اور ذمہ داریوں کی تصریح اور اس کے حقوق و واجبات کی تفصیل درج ہوتی ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس منشور کی ایک ایک شق کو بغور پڑھے اور اس کے بعد اپنے عرصہ ملازمت میں ان پر کاربند رہے۔ گویا یہ منشور ایک عہدنامہ ہوتا ہے جو حکومت اور اس کے عمال کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں اگر کہیں اسلامی حکومت قائم ہو تو اس کے عمال کو کس قسم منشورِ حقوق و فرائض کا پابند ہونا پڑے گا اور وہ کون سا عہدنامہ ہوگا جس کی پابندی ان پر لازم ہوگی؟ اس منشور کی ترتیب کے لئے ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اسلامی حکومت کا مدار قرآنی آئین پر ہوگا اور قرآن نے ان تمام فرائض و واجبات کی بھی تصریح کر دی ہے جو اس حکومت کے اربابِ نظم و نسق پر عائد ہوں گے۔ لہذا یہ منشور قرآن کے مطالعہ سے آسانی مرتب ہو سکتا ہے۔ ذیل میں ہم اسی قسم منشور کا ایک خاکہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ عمالِ حکومت اسلامیہ کا یہ عہدنامہ ان کے اور حکومت کے اقتدارِ اعلیٰ (یعنی ان کے خدا) کے مابین ہوگا، اس لئے ہم نے اس کا عنوان ”میثاقِ خداوندی“ مناسب سمجھا ہے۔

یہ میثاق یوں مرتب کیا جاسکے گا۔

۱۔ بنیادی اصول | تم ایک ایسی حکومت کے اربابِ حل و عقد کے ذمہ میں داخل ہو رہے ہو جو اس ابدی صداقت پر قائم ہے کہ حکومت کی سزاوارہ صرف خدا کی ذات ہے۔ (۱۲/۴۰)

اس سے مفہوم یہ ہے کہ تمہیں اپنے معاملات اور کاروبار، احکام اور فیصلوں میں ان غیر متبذل قوانین کا اتباع کرنا ہوگا جو

خدا نے حکیم و بصیر نے انسانی معاملات کے حل اور اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے (قرآن میں) عطا فرمائے ہیں اور اس اصل الاصول کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا ہوگا کہ تم اپنے ہر کام کے لئے اس خدا کے سامنے جوابدہ ہو گے جو نگاہ کی خیانت اور دل کے رازوں تک سے باخبر ہے۔“ (۴۶/۱۹)

تم یہ عہد اپنے خدا کے ساتھ استوار کر رہے ہو۔ اس لئے اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ اس کو ہر حالت میں نباہنا ہوگا۔ وہ خدا جس کا ارشاد ہے کہ

”نصیحت وہ صاحبانِ علم و عقل حاصل کرتے ہیں جو اللہ کے ساتھ بندھے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اقرار کو کبھی نہیں توڑتے۔“ (۱۳/۲۰)

۲۔ مقصدِ اولیٰ | تمہاری زندگی کا بنیادی اصول

امر بالمعروف و نہی عن المنکر (۳۱/۱۷)

ہونا چاہیئے۔ یعنی خدا کے احکام کی تنفیذ۔ جس چیز کا حکم اس نے دیا ہے اس کا رائج کرنا اور جس سے اس نے منع کیا ہے، اس سے لوگوں کو روکنا۔

اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے ضروری ہوگا کہ پہلے تم خود ان احکام کی پابندی کرو۔ اگر تمہارے قول اور فعل میں تضاد اور احکام اور کردار میں تخالف ہوگا، یعنی جو حکم تم نافذ کرو گے، اس کی شہادت خود تمہارے عمل سے نہیں ملے گی، تو وہ ایمان داری نہیں، منافقت ہوگی اور حکومت خداوندی میں منافقین کا کوئی کام نہیں۔ اس حکومت کا پہلا حکم یہ ہے کہ

”اے ایمان والو! تم وہ کچھ کہتے کیوں ہو جو خود کر کے نہیں دکھاتے۔ یاد رکھو اللہ کے نزدیک یہ طرزِ عمل بڑا مذموم ہے کہ تم زبان سے وہ کچھ کہو جس کی تائید تمہارے عمل سے نہ ہو۔“ (۶۱/۳۰-۳۱)

تمہیں لوگوں کے مقدمات میں ثالث بننا ہوگا۔ ان کے نزاعی امور کے فیصلے کرنے ہوں گے۔

۳۔ عدل | لوگ اپنے معاملات تمہارے پاس لائیں گے۔ اس باب میں ہمیشہ یاد رکھو کہ

”اللہ کا حکم یہ ہے کہ جب تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرو تو ہمیشہ عدل و انصاف سے کام لو۔“

(۴/۵۸)

خواہ یہ فیصلہ تمہارے دوستوں یا رشتہ داروں کے بھی خلاف کیوں نہ جائے کیونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ

”جب تم بات کرو تو عدل و انصاف کی کرد، خواہ وہ تمہارا قریبی ہی کیوں نہ ہو اور (اس طرح)

اللہ کے حمد کو پورا کرو۔“ (۶/۱۵۳)

بالحاظ اس امر کے کہ فریقِ متعلقہ امیر ہے یا غریب، حتیٰ کہ اس کی زرخواہ تمھاری اپنی ذات پر بھی کیوں نہ پڑے۔

”اے ایمان والو! انصاف کی پوری محافظت کرنے والے اور فقط اللہ کی خاطر شہادت دینے

والے بنو۔ خواہ معاملہ خود تمھاری اپنی ذات، ماں باپ یا قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں

نہ جائے، خواہ غریب ہو یا امیر، اللہ کا دونوں پر (تمھارے رجحانات کی نسبت) زیادہ حق ہے۔

سو تم اپنے رجحانات و میلانات کی پیروی مت کر دنا کہ تم عدل کر سکو۔ اگر تم سچائی سے اعراض بر تو

گے یا گول مول بات کر دے تو یقیناً جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ (۲/۱۲۵)

عدل! نہ صرف اپنے لوگوں کے ساتھ بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل۔

”اے ایمان والو! اللہ (کے عہد نامہ کی) حفاظت کرنے والے اور انصاف کی شہادت دینے والے

بن جاؤ۔ (یاد رکھو) کسی قوم کی دشمنی بھی تمھیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم انصاف کا دامن ہاتھ سے

چھوڑ دو۔ (ہر حال میں اور ہر شخص کے ساتھ) انصاف کرو۔ یہی روش تقویٰ سے قریب تر ہے۔“ (۵/۸)

صرف عدل ہی نہیں بلکہ مستحق لوگوں سے احسان بھی کرو کیونکہ

” (تمھارا) اللہ عدل اور احسان (دونوں کا) حکم دیتا ہے۔ (۱۶/۹۰)

یاد رکھو! اس ادارہ حکومت کی رکنیت قبول کر کے تم نے ایک بار عظیم اپنے ذمہ لیا

۵۔ امانت

کو بھی جو دیلے تمھارے سپرد کی جائیں۔

”اگر تم میں سے ایک شخص دوسرے کا اعتماد کرتا ہے، تو جس پر اعتماد کیا گیا ہے، اسے چاہیے کہ

اپنی اس امانت کو بچن و خوبی پورا کرے۔ (۲/۲۸۳)

دوسری جگہ ہے۔

”امانات کو ان کے اہل تک پہنچایا کرو۔“ (۴/۵۸)

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہر منصب اور عہدہ کے لئے معیارِ انتخاب اہلیت و قابلیت ہونا چاہیے نہ کہ اعزہ نوازی

و اقربا پروری، مناصب و مدارج جن کا انتخاب تمھارے ذمہ رکھا گیا ہے، خدا کی امانت ہیں۔ ان امانات کو ان لوگوں

تک پہنچاؤ جو اس کے اہل ہوں۔ نا اہل لوگوں کو بھرتی نہ کئے جاؤ۔

جن جن معاملات میں تم پر اعتماد کیا جاتا ہے، اس اعتماد میں پورے اترو۔ اور اپنے اعتماد کو ہمیشہ نبھاؤ۔
کیونکہ تم جانتے ہو کہ اعتماد شکنی غداری ہے اور غداری سے قومیں تباہ ہو جایا کرتی ہیں۔ (۸/۲۶)
اور شرانگیز سازشوں میں نہ الجھو کیونکہ مآلِ کار۔

”شرانگیز سازش خود اس کو پھانس لیا کرتی ہے جو اسے وضع کرتا ہے۔“ (۲۵/۲۳)

حسنِ نظم و نسق کا راز باہمی تعاون میں ہے لیکن تعاون فلاح دہبود کے کاموں میں
۶۔ باہمی تعاون ہونا چاہیے نہ کہ فتنہ و فساد کے کاموں میں۔ لہذا

”نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں باہمی تعاون کرو۔ برائی اور سرکشی کے معاملات میں تعاون نہ کرو۔“

(۵/۲)

تم تمام عمالِ حکومت ایک ہی برادری کے افراد اور ایک ہی مشین کے پُرزے ہو۔ اس لئے تم میں باہمی رقابتیں اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں ہرگز نہیں ہونی چاہئیں۔ اگر تمہیں بعض مصالِح وقت کی بناء پر۔

”باہمی خفیہ مشورے بھی کرنے ہوں تو یہ مشورے جرم و بغاوت کے مشورے نہیں ہونے چاہئیں

بلکہ نیکی اور تقویٰ کے مشورے ہونے چاہئیں۔ (۵۸/۹)

اور نیکی اور تقویٰ کے معاملات میں اس کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ کوئی کہے تو دستِ تعاون بڑھایا جانے بلکہ خود بخود آگے بڑھو اور دوسروں کو اس میں شریک ہونے کی تاکید کرو۔ اس لئے کہ کامیابی انہیں کے لئے ہے۔

”جو ایک دوسرے کو حق و استقامت کی تلقین و تائید کرتے رہتے ہیں۔“ (۱۰۳/۳)

ہر ایک کو اپنا اپنا کام اپنی صوابدید کے مطابق کرنے دو۔ خواہ مخواہ دوسروں کے شعبوں میں دخل اندازی نہ کرو۔
لیکن اگر دیکھو کہ کسی معاملہ میں آپ کا کوئی ہم جلیس حقیقتِ حال سے بے خبر ہونے کی وجہ سے غلط فیصلہ کر رہا ہے

تو اسے اصل حالات سے باخبر کر دو۔ اس قسم کی دخل اندازی (سفارش) موجبِ فلاح و فوز ہوگی۔ اس لئے کہ

”جو کوئی بھلی بات میں سفارش کرے گا تو اس کو اس میں حصہ ملے گا اور جو کوئی برائی کی سفارش

کرے گا تو اس کی پاداش میں بھی اس کا حصہ ہوگا۔“ (۴/۸۵)

معاملات کے فیصلے یوں ہی اڑتی ہوئی خبروں پر نہ کر دیا کرو بلکہ ذاتی تحقیق کے بعد نتیجہ
نظم و نسق تک پہنچا کرو۔ اس لئے کہ اللہ کا حکم ہے کہ

”جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو تم سے ذرائعِ علم، یعنی سماعت اور

بصارت اور قلب کے متعلق باز پرس ہوگی۔ (۱۷/۳۶)

اور جب کسی معاملہ میں پوری تحقیق و تفتیش کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچ جاؤ تو پھر تذبذب میں نہ پڑ جاؤ بلکہ عزم راسخ سے اسے نافذ کر دو اور اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

”اور جب تم عزم کرو تو پھر خدا پر بھروسہ کر کے (اس فیصلہ کو نافذ کر ڈالو۔) (۳/۱۵۹)

اور اس راہ میں جس قدر مشکلات و موانع کا سامنا ہو، نہایت دل جمعی اور ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کرتے جاؤ۔

”جو کچھ تم پر آئے ہمت سے مقابلہ کرو۔ یاد رکھو ثابت قدمی عزم الامور میں سے ہے۔ (۳۱/۱۷)

اگر فتنہ پردازوں اور فساد انگیزوں کا سامنا ہو تو انہیں اپنے حسن سلوک سے رام کرنے کی کوشش کرو۔

برائی کی مداخلت نیکی سے کرو۔ (۲۳/۹۶)

لیکن اگر وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں اور اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں تو انہیں ان کے جرائم کی سزا دو لیکن

اس میں بھی اس کا خیال رکھو کہ

”سزا جرم کے مطابق ہونی چاہیئے۔“ (۲۲/۴۰)

اگر اس کے بعد دیکھو کہ وہ اپنے کئے پر نادم ہیں اور آئندہ کے لئے اپنی غلط روش میں اصلاح کرنے پر بہ حسن نیت آمادہ ہیں تو انہیں ان کی سابقہ غلطیوں پر معاف کر دو۔

”تم میں سے جو شخص غلطی کرے اور پھر اس پر نادم ہو جائے اور اپنی اصلاح کر لے تو اللہ بخشنے

والا مہربان ہے۔“ (۶/۵۴)

یاد رکھو! لوگوں سے معاملہ داری میں اپنی طبیعت کو بے قابو نہ ہونے دو کہ

”جو لوگ اپنے غصہ کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں اور لوگوں (کی ندامت پر انہیں) معاف کر دیتے

ہیں تو اللہ (ایسے حسن عمل کو) محبوب رکھتا ہے۔“ (۳/۱۳۳)

جب کسی مقصد کے لئے کسی کو متعین کرو تو پہلے دیکھ لو کہ وہ اس مقصد

۸۔ انتخاب رفقاء کے کار | کے لئے موزوں بھی ہے۔ اس موزونیت کے لئے جسمانی اور قلبی دونوں

صلاحیتیں ضروری ہیں کہ ۱۔

”بہترین اجیر وہ ہے جو جسمانی طور پر مضبوط بھی ہو اور امین بھی۔ (۲۸/۲۶)

جب اللہ نے حضرت طاہر کو کمان کے لئے منتخب کیا تھا تو اس انتخاب کی دلیل یہی تھی کہ ان میں

”علمی قابلیت اور جسمانی توانائی دونوں وافر طور پر موجود ہیں“ (۲/۱۳۷)

اپنے عمالِ ماتحت کو تمام معاملات ہنایت نرمی، خندہ پیشانی اور وضاحت سے سمجھاؤ۔
”انہیں اللہ کی راہ کی طرف حکمت اور موعظت سے بلاؤ اور جب بحث کرو تو عمدہ دلائل سے کرو“
(۱۶/۱۲۵)

اسے کبھی فراموش نہ کرو کہ اختلافِ مدارج محض تقسیمِ کار کے لئے ہے۔ جن لوگوں کو تم اپنے ماتحت سمجھتے ہو، وہ ذلیل نہیں ہیں۔ جس طرح تمہیں ایک کام سونپا گیا ہے اسی طرح ان کے سپرد بھی ایک فریضہ کیا گیا ہے۔ عزت کا معیار یہ ہے کہ تم میں سے کون اپنے اپنے فرائض کو بہ حسنِ دخیبی سرانجام دیتا ہے۔

”خدا کی نگاہ میں تم میں سب سے زیادہ واجبِ العزت وہ ہے جو سب سے بہتر طریق پر اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ (۴۹/۱۳)

اپنے ماتحتوں کے آرام و آسائش کا ہمیشہ خیال رکھو اور اس کا اطمینان کرو کہ انہیں ان کے کام کا پورا پورا معاملہ مل رہا ہے۔

”اور جب ماپو تو ماپ کو پورا کرو اور سیدھے ترازو سے تولو، یہ بہت عمدہ روشِ زندگی اور مالِ کل بہترین نتائج کی حامل ہے۔ (۱۷/۳۵)

۹۔ **حُسنِ سلوک** | تم خلقِ خدا کے خدمت گزار ہو۔ لوگ تمہارے پاس اپنی شکایات لے کر آئیں گے۔ ان سے بے رنجی مت برتو۔ (۳۱/۱۸)

خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرو اور

”جب تمہیں کوئی ہدیہ سلام پہنچائے تو (اول تو اس سے بہتر طریق پر جواب دو (ورنہ کم از کم) ویسا جواب تو ضرور دو۔ یاد رکھو! اللہ ان تمام باتوں کا خیال رکھتا ہے (کہ سیرت کی تعمیر اپنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتی ہے)“ (۴/۸۶)

ان سے جوابات بھی کرو صاف، واضح اور اس طریق سے کرو کہ وہ سیدھی ان کے دل تک اتر جائے۔ ہمیشہ نرمی سے گفتگو کرو۔ (۴/۶۳)۔ کبھی بہم اور زود معنی باتیں نہ کرو (۲۲/۱۰) جھوٹ کبھی نہ بولو (۳۳/۳۰) اگر کوئی بات صنفِ راز میں کہنے کی ہے تو کہہ دو کہ اسے نہیں بتایا جاسکتا۔ خواہ مخواہ جھوٹ کو سچ کا نقاب نہ اڑھاؤ۔

”کبھی حق کا باطل کے ساتھ التباس نہ کرو۔ نہ ہی جان بوجھ کر سچ کو چھپاؤ۔ (۲/۴۲)

جب وعدہ کرو تو ہمیشہ اس کا ایفا کرو۔ (۵/۱) نرم خور ہو اور
 ”اگر نہ چلو۔ اللہ شیخی خورے متکبر کو پسند نہیں کرتا۔ (۳۱/۱۸)
 لوگوں سے چیخ کر نہ بولو (۳۱/۱۹) یاد رکھو۔

”سب آوازوں سے بُری آواز گدھے کی ہے۔ (۳۱/۱۹)

تمہاری سوسائٹی کی عام حالت ایسی ہونی چاہیے کہ اس میں
 ایک جماعت دوسری جماعت کی اتنی ہی نہ اڑائے، نہ ہی ایک دوسرے پر بہتان لگائے، نہ ان کے
 نام دھرتے رہو۔ بدظنی سے ہمیشہ مجتنب رہو۔ بعض وقت بدظنی جرم تک پہنچ جاتی ہے۔ دوسروں کی
 ٹوہ میں نہ لگے رہو۔ ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔“ (۱۲-۱۱/۴۹)

اگر کسی نے اپنے علم و عمل سے کسی مقام بلند کو حاصل کر لیا ہے تو اس کا حسد نہ کرو۔ (۴/۵۵) بلکہ کوشش کرو کہ تم بھی علم
 اور محنت سے اس قسم کا مقام حاصل کرو۔ اسلامی حکومت میں
 ”ہر شخص کو اس کی کوشش کا صلہ ملتا ہے۔ (۵۳/۳۹)

۱۰۔ مختصراً | اپنے تمام ارادوں اور فیصلوں، کام اور تدبیروں میں ہمیشہ اس اصل اصول کو پیش نظر
 رکھو کہ جس حکومت کی مشینری کے تم پُرزے ہو اس کا قیام اس مقصد کے حصول

کے لئے عمل میں لایا گیا ہے کہ

”وہ قیام صلوة (سے شرف انسانیت کے ارتقار کا ذریعہ بنے) ادائے زکوٰۃ (سے تمام لوگوں کی

معاشی ضروریات کی بہترین کیفیل ہو) ہمیشہ نیکی کو پھیلانے اور برائی کو رد کرنے کی تدابیر کرے اور تمام

امور میں خدا کی طرف رجوع کرے۔ (۲۲/۴۱)

اور ایسا کبھی نہ کہو کہ جب دوسرے لوگ غلط راہ پر چل رہے ہیں، تو میں بھی کیوں نہ ان ہی کی راہ چلوں۔ یاد رکھو!

تم پر (سب سے پہلے) تمہاری اپنی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو غلط راہ پر چل رہا ہے، وہ تمہیں

کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا بشرطیکہ تم سیدھی راہ پر چل رہے ہو۔ تم سب کو خدا کی طرف لوٹنا ہے۔

(اس لئے کہ تم تمام اراکین حکومت خداوندی اپنے معاملات میں خدا کے سامنے جواب دہ ہو)

وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے تھے (۵/۱۰۵)

یہ ہے مختصر سا خاکہ اس منشور کا، جو اسلامی حکومت کے عمال کو دیا جائے گا تاکہ وہ اس کے مطابق کام کریں اور یہ ہے وہ عہد نامہ جس پر انھیں کاربند رہنا ہوگا۔
 کس قسم کی جنت ہوگی وہ سرزمین جس پر ایسی حکومت قائم ہو جس کے عمائد و اراکین اور اربابِ بےست و کشاد اس میثاقِ فداوندی پر عامل ہوں۔

ایک نورانی صبح

(جولائی ۱۹۴۹ء)

(علامہ حافظ سید محبت الحق مرحوم کا تعارف)

۱۹ جون ۱۹۴۹ء (اتوار) کی صبح بھی میرے لئے کیسی سہانی صبح تھی! یمن و سعادت کی صبح، خیر و برکت کی صبح، بہجت و مسرت کی صبح، فخر و مباہات کی صبح۔

آج آپ کو رجعت الی القرآن (BACK TO QURAN) کی آواز چاروں طرف سے سنائی دیتی ہے لیکن آج سے ستر، اسی برس اُدھر، یہ آواز بڑی غیر مألوس اور نا آشنا نئے گوش تھی۔ قوم کے افق ذہنی پر غیر قرآنی تصورات بُری طرح مسلط تھے۔ اعمالِ حیات، یکسر غیر اسلامی رسوم و قیود کے پابند ہو چکے تھے۔ حقیقت، عجم کی نگاہ فریبِ دستانوں میں کھو چکی تھی۔ قرآن سرفِ ثواب کی خاطر تبرکاً پڑھا جاتا تھا یا مرتے وقت مُردوں کو سنایا جاتا تھا کہ از بسینِ اُوّسال بمیری — عام مسلکِ زندگی یا تور دایت پرستی تھا یا زاویہ نشینی۔ دین نام تھا چند لفظی عقائد اور رسوم و مظاہر کی پابندی کا۔ مذہبی بحیثیت مشعل تھیں یا تو آئین باطنی و بالجمہر جیسی فروعات پر اور یا حدوث و قدم مادہ اور تجسیم و تنزیہ جیسے منطقی گورکھ دھندوں پر۔ ایسے ماحول اور اس قسم کی فضا میں اگر کسی گوشے سے یہ آواز بلند ہو کہ مسلمانوں! تمہاری زندگی کا راز قرآن اور فالص قرآن کو سمجھنے اور اس پر بے غل و غش عمل کرنے میں ہے تو کس قدر با عظمت ہو گا وہ گوشہ جہاں سے یہ آواز بلند ہوئی ہو گی اور کیسی بے باک و پر غلوس ہو گی۔ وہ زبان جس نے اس آواز کو بلند کرنے کی جرأت کی ہو گی۔ فی الحقیقت ایک بڑے انسان کی عظمت کا راز ہی اس میں ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے عوام کی رو کے ساتھ نہیں بہہ جاتا بلکہ ادراکِ حقیقت کے بعد، ان کے ذہنی رجحانات کے دھارے کا رخ موڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ گوشہ تھا عظیم آباد (پٹنہ) کا ایک محلہ اور یہ آواز تھی ”مولانا حافظ محبت الحق صاحب“ کی جن کی ذات کے ساتھ انتساب سے ”شمس العلماء“ کے خطاب نے بعد میں فخر حاصل کیا۔ اس مرد مومن نے قریب ستر اسی برس اُدھر یہ آواز بلند کی اور پھر ساری عمر اسی دعوت کے عام کرنے میں صرف کردی۔ اس آواز کی کس قدر مخالفت ہوئی ہوگی اس کا ہم صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ آج مسلمانوں میں لقمہ مذہبی تشدد باقی نہیں رہا جو آج سے ستر اسی برس اُدھر تھا۔ اس زمانہ میں عوام کے میلانات و معتقدات کے خلاف لب کشائی کرنا جان کا خطرہ مول لینا تھا اور پھر لب کشائی بھی ایسے نازک مسئلہ میں جس سے مخالفین، عوام کے نازک ترین جذبات کو فوراً مشتعل کر دیں، یعنی ”انکارِ حجتِ حدیث“ اور دعوتِ اکیلیتِ قرآن۔ اس مسئلہ کی نزاکت کا تو یہ عالم ہے کہ آج جب کہ (جیسا کہ ابھی لکھا جا چکا ہے) مذہبی تعصب بہت کم ہو چکا ہے، عوام اور سب کچھ برداشت کر لیں گے لیکن جس شخص کے ساتھ ”منکرِ حدیث“ کا لیبل چسپاں کر دیا جائے اسے کسی صورت میں بھی ”مسلمان“ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ چنانچہ عوام کی پہلی دھکتی ہوئی رگ ہے جس سے ہماری ملائیت فائدہ اٹھاتی رہتی ہے۔ جب کبھی ان کے کسی مسلک کو قرآن کے خلاف ثابت کیجئے، وہ اپنے مسلک کی تائید میں فوراً کوئی نہ کوئی روایت پیش کر دیں گے اور جوں ہی آپ نے یہ کہا کہ جو روایت قرآن کے خلاف جاتی ہو، اسے کیسے صحیح مان لیا جائے، وہ فوراً منکرِ حدیث کا لیبل چسپاں کر دیں گے۔ اس کے بعد کوئی شخص اس کی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ ہماری سلطانی دُلقانی دِپیری کی ساری عملد اسی بنیاد پر قائم ہے اور اس کی حفاظت عوام کے انہی نازک جذبات کے اشتعال سے کی جاتی رہی ہے اور آج بھی کی جا رہی ہے۔ غور فرمائیے کہ آج سے ستر اسی برس اُدھر اس آواز کا بلند کرنا کتنے بڑے حوصلہ اور ہمت کا کام ہوگا۔ یہ دہی کر سکتا تھا جسے اللہ نے قرآن کا عشق عطا فرمایا ہو، کہ آگ میں کود جانا عشق ہی سے ہو سکتا ہے، عقل کی مصلحت کو شیوں سے نہیں۔ یہ تھی وہ آواز جو آج سے ستر اسی برس اُدھر شمس العلماء حافظ سید محبت الحق صاحب نے بلند کی اور پھر ہزار مخالفتوں کے باوجود اسے مسلسل و متواتر جاری رکھا۔ جب یہ آواز پہلی مرتبہ بلند ہوئی ہوگی تو شاید حافظ صاحب قبلہ کو ایک متنفس بھی اپنا ہم نواز نہ ملا ہوگا۔ دعوتِ حق و صداقت میں یہ مقام بڑا صبر آزما اور جرأت طلب ہوا کرتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ انسان تنہائی میں اپنے آپ کو بے یار و مددگار پاتا ہے بلکہ بعض اوقات یہ تقاضائے بشریت یہ کھٹک پیدا ہو جاتی ہے کہ جب کوئی بھی میری تائید نہیں کرتا، تو ہو سکتا ہے کہ میں ہی غلطی پر ہو۔ اس مقام سے صحیح و سلامت گزر جانا اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان کو اپنے مسلک کی حقانیت پر یقین محکم ہو۔ لہذا اس تمام تلک و تاز اور سعی و کوشش میں ایمانِ محکم اور جرأتِ کامل ہی انسان کو ان دشوار گزار وادیوں سے پار لے جا

سکتی ہے۔ سو کس قدر محکم تھا ایمان اس اللہ کے بندے کا اور کس قدر بلند تھا حوصلہ اس مردِ مومن کا، جس نے اپنی ساری عمر اسی دعوت اور پکار میں بسر کر دی کہ مسلمان پھر سے قرآن کی طرف آجائیں اور اپنے فردوسِ گمشدہ کو حاصل کر لیں۔

راقم الحروف کو قبلہ حافظ صاحب سے غائبانہ تعارف کا شرف ان کی گراں قدر تصانیف بلاغ الحق، دعوت الحق، مہاج الحق، شرعۃ الحق کی وساطت سے ہوا۔ اس کے بعد غالباً ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے کہ طلوع اسلام کی طست سے میرے بعض مضامین آپ کی نظر سے گزرے اور آپ نے انہیں اس انداز سے سراہا کہ مجھ میں آپ سے خط و کتابت کی جرأت پیدا ہو گئی۔ ۱۹۴۱ء میں میری کتاب ”معارف القرآن“ کی پہلی جلد شائع ہوئی تو میں نے لرزے ہوئے ہاتھوں سے ایک نسخہ آپ کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس کی رسید جن الفاظ میں مجھ تک پہنچی، وہ میرے لئے سرمایہ ہزار فخر و سعادت ہے۔ یہ خط اسی زمانہ میں طلوع اسلام میں شائع ہو گیا تھا۔ اس کے یہ فقرے مجھے کبھی نہیں بھولنے کے

”جہاں تک کتاب کو دیکھا اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح عکسی قرآن چھپنا شروع ہوا ہے، آپ نے میری عقیدت اور خیالات کا عکسی مرقع شائع فرمایا ہے۔ اس قدر اتحاد خیالات بھی کیسا حیرت انگیز نہیں ہے؟ اب ان کی تعریف کرنا اپنی تعریف کرنا ہے اور لا تزکوۃ انفسکم کے اعاطہ کے اندر ممنوع ہے۔ (۲۶ ستمبر ۱۹۴۱ء)

اس کے بعد کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد ایک اور گزری نام میں یوں نوازا۔

”میں نے معارف القرآن بالاستیعاب پڑھا۔ سبحان اللہ کیا کتاب لکھی ہے۔ محض جزئیات میں کہیں کہیں اختلاف ہونا یہ تو فطرتِ انسانی ہے جو ناقابلِ توجہ ہے۔ اس کتاب میں چند خصوصیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ سارے خیالات و اختلافات کو پیٹھ پیچھے بھینک کر خدا اور خدا کی صراطِ مستقیم نصب العین رہی ہے۔ میں کیا، خدا سے قبول کرے، مقبول کرے اور قوم کی نسبت اپنے ساتھ جوڑ دے، جو اس کتاب کا نصب العین ہے۔ دوسرے اختلافات و نزاعات باہمی نے جو قرآن کے معنی بدل دیتے ہیں جو فطال علیہم الامد فقست قلوبہم کے اصول پر معافی قرآن منحرف بنادیا گیا ہے، اس کی اصلاح ہو گئی ہے۔ تیسری ضرورت اور پوری ہونے کی اُمید ہے کہ قرآن کا صحیح ترجمہ جس کی ضرورت قوم کو شدید اور اشد ہے، وہ انشاء اللہ پوری ہو جائے گی مگر افسوس یہ ضرور

ہے کہ یہ ضرورت کئی جلدوں میں پوری ہوگی۔ اس لئے اگر آپ کو ساری جلدوں کی تصانیف سے فرصت ہوگئی ہو تو اس کا موقع ہے۔ ساری کتاب جو ابھی غیر مطبوعہ ہے، اس سے قرآنی الفاظ کے معانی کی صحت کر کے قرآن کا ترجمہ شائع کیا جائے جو سارے ترجموں پر حکم ہوا اور جس کی تبلیغ آسان اور عام ہو سکے اور اس انقلابی دور میں جس کے مقبول اور مصلح ہونے کی فضا خدا نے پیدا کر دی ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ آپ مع الخیر ہوں۔ میں بھی اب تک جوں توں زندہ ہوں۔ قوم نہ بدلے گی، اس کا حال نہ بدلے گا، جب تک اس میں روحانیت اور پاک باطنی نہ آئے گی اور یہ بغیر خدا کی فاصلہ محبت کے حاصل نہیں ہونے کی۔ ضرورت ادھر توجہ کرنے کی بھی ہے۔ اس کی صورت یہی ہے کہ قوم کو قرآن کی تلاوت معانی و مفہوم کے ساتھ کرنے کی تبلیغ کی جائے، زبانی بھی، عملی بھی، ایسی طرح سے نہیں بلکہ مسجدوں میں بیٹھ کر چند لوگوں میں بطور مشورت پیش کرنے کا رنگ اختیار کیا جائے۔ افسوس کہ اس کے لائق میں اب نہیں رہا۔

اس کے بعد یہ تعلق ایسا قائم ہوا کہ میں نے اس حقیقت کو اپنے سامنے محسوس پیکر میں دیکھ لیا کہ جو قلبی تعلق قرآن کے رشتہ سے استوار ہوتا ہے، اس سے زیادہ گہرا اور محکم تعلق اور کسی صورت میں ممکن نہیں۔

لیکن یہ تعلق غائبانہ ہی رہا تا آنکہ تقسیم ہند کے بعد، میں ہندوستان (دہلی) سے پاکستان (کراچی) آگیا۔ مجھے یہاں پہنچ کر سب سے بڑا تعلق علامہ اسلم حیدر راج پوری مدظلہ کے فیوضِ صحبت سے محرومی اور قبلہ حافظ صاحب سے شرفِ نیاز کے حصول کے امکانات کی کمی کی وجہ سے تھا۔ میری طلبِ صادق تھی، اس نے کشش پیدا کی۔ علامہ اسلم صاحب خود میرے ہاں تشریف لاتے اور قریب آٹھ نو ماہ تک یہیں فروکش رہے۔ قبلہ حافظ صاحب بھی اپنے اعزہ کے ہمراہ بہار سے کراچی تشریف لے آئے۔ مجھے اس خبر سے کس قدر خوشی ہوئی ہوگی، آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں؟ قریب دس سال کی غائبانہ ملاقات نے بالمشافہ نیاز کی صورت اختیار کی۔ للہ الحمد کہ اس مردِ مومن کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ قریب سو سال کا سن، لانا بقا، اس کبرِ سخی میں بھی چہرے کا جلال، ایک پاکباز زندگی کا آئینہ دار۔ ایک آنکھ پہلے جاتی رہی تھی، دوسری سے بھی بینائی کم ہو رہی ہے لیکن چشمہ کی مدد سے اب بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اگرچہ بہ تکلف، ثقیل سماعت ہے۔ پیری کا صنف اور اس سے پیدا شدہ مختلف عوارض لیکن اس کے باوجود نماز کی پابندی کا وہی التزام جو شروع سے چلا آتا تھا قائم ہے۔ بڑی محبت سے ملے۔ فرمایا کہ تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا۔

اللہ کا احسان ہے کہ اس نے میری یہ آرزو پوری کر دی۔ پھر میری حوصلہ افزائی کے لئے کہا کہ میں نے جب دعوت الی القرآن کی ابتدا کی تھی تو ہمیشہ یہ خیال میرے دامن گیر رہا کہ تا تھا کہ یہ معلوم یہ آواز پس ختم ہو جائے گی یا اس دیئے سے آگے دیا بھی جلے گا۔ اللہ نے میری آواز سن لی۔ میری زندگی ہی میں یہ دعوت عام ہوئی اور تم سے متعارف کے بعد اس کی بھی تسلی ہو گئی کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اب میں اطمینان کی موت مروں گا۔

اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں مجھے کوئی دن ایسا یاد نہیں پڑتا کہ میں ملاقات کے لئے حاضر ہوا ہوں اور مزاج پر سی کے بعد قرآن کے علاوہ کسی اور موضوع پر سلسلہ گفتگو چھڑا ہو۔ پچھلے بیسے ان پر طیریا کا شدید حملہ ہوا۔ ایک تو کبرسنی کی نقاہت، اس پر مرض کا سخت حملہ، کمزوری یہاں تک بڑھ گئی کہ قریب دو روز غش کی سی حالت رہی۔ میں عبادت کے لئے حاضر ہوا۔ حبیبِ مکرّم، ڈاکٹر حمید صاحب، کہ جن کے مقدّم میں ایسی بابرکات ہستیوں کی خدمتِ معالجہ کی سعادت لکھی ہے، میرے ساتھ تھے۔ حافظ صاحب قبلہ بہت کمزور ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے مرض اور اس کے تضمّنات سے متعلق باتیں ہوئیں۔ محسوس ہو رہا تھا کہ انہیں بات کرنے میں خاصی تکلیف ہو رہی ہے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے سلسلہ گفتگو کو خود ہی ختم کر دیا کہ مبادا نقاہت بڑھ جائے۔ اس کے بعد آپ نے مجھے دیکھا تو سنبھل کر بیٹھ گئے۔ فرمایا کہ اس غنودگی کے عالم میں قرآن کی ایک آیت میرے ذہن میں چکڑ لگا رہی تھی۔ جی میں تھا کہ تم آؤ تو اس کے متعلق کچھ بات کر سکوں۔ اس کے بعد جو سلسلہ کلام شروع ہوا ہے تو قریب آدھ گھنٹے تک اس انداز سے جاری رہا گویا آپ بالکل تندرست ہیں۔ ڈاکٹر صاحب رہ رہ کر متوش ہو رہے تھے کہ اس مکان سے مرض بڑھ جائے گا۔ ان سے ایک آدھ مرتبہ عرض بھی کیا گیا تو فرمایا کہ اس گفتگو سے مجھے تقویت ملتی ہے۔ آپ کچھ فکر نہ کریں۔ اس وجہ سے میرے مرض میں کمی ہوگی، زیادتی نہیں ہوگی۔

اللہ اکبر! کیسی قابلِ رشک ہے یہ زندگی اور کس قدر بے پایاں عشق ہے خدا اور اس کے کلام سے اور کیسا بابرکت ہے یہ گھر جس میں ہر وقت قرآن کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ وہاں جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا ساری فضا قرآنی تذکار سے معمور ہے۔ حتیٰ کہ ان کے ایک صاحبزادہ مصطفیٰ میاں کی بیوی ایک یورپین خاتون ہیں۔ ان کی بھی یہ کیفیت ہے کہ میاں بیوی اور ان کا بچہ ہر شام بلا ناغہ قرآنی درس و تدریس اور بحث و تمحیص میں مہمک ملیں گے۔

طوبی لہم وحسن مآب۔

مولویوں کے طبقہ میں عام طور پر آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ غلطی محسوس ہو جانے کے بعد بھی اپنی ضد

(بغیا بینہم) پراڑے رہتے ہیں اور دو روز کا مباحث اور تاویلات سے کوشش کرتے ہیں کہ اپنی بات کو سچا ثابت کر دکھائیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ جو سینے قرآن کی دولت سے معمور ہوں، ان میں ہٹ، ضد اور بات کی توجہ کے بجائے سینے کی کشادہ اور نگاہ کی بلندی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات میں نے علامہ اسلم مدظلہ میں بھی دیکھی اور قبلہ حافظ صاحب کے ہاں بھی۔ مثلاً ایک دن میں حاضر ہوا تو آپ ایک مسئلہ کی تشریح فرما رہے تھے۔ بڑے مسکت دلائل اور واضح اسلوب کے ساتھ۔ اخیر میں میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ کتنے دنوں سے میں اس باب میں غور کر رہا تھا اب اس کا حل ملا۔ انھیں اس حل سے پورا اطمینان تھا۔ بات ختم ہونے پر میں نے عرض کیا کہ قرآن میں فلاں آیت ہے جو آپ کے بیان فرمودہ حل سے مختلف ہے، اس کی بابت کیا ارشاد ہے؟ ایک ثانیہ کے تامل کے بغیر فرمایا کہ اللہ مجھ پر رحم کرے۔ اب حافظہ کی یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ یہ آیت قطعاً مجھے یاد نہیں آئی۔

میں نے کہا کہ علاوہ بریں..... فرمایا کہ اب کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ جب اللہ کا فیصلہ سامنے آ گیا تو پھر مزید بحث کی گنجائش کہاں ہے۔ میری غلطی تھی۔

یہ ہے وہ وسعتِ قلب جو قرآنی بصیرت اور تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے۔ میں بلا تامل عرض کروں گا کہ اگر آپ نے دیکھنا ہو کہ قرآن، انسان کے قلب و دماغ میں کیا انقلاب پیدا کر دیتا ہے اور ایسی ہستیوں کے پاس بیٹھنے سے بھی کیا کچھ حاصل ہو جاتا ہے تو قبلہ حافظ صاحب کو دیکھئے اور علامہ اسلم جیراج پوری کو۔ میری نگاہ نے ان سے بہتر قرآن جاننے والا اور جاننے کے بعد اس کے رنگ میں رنگے جانے والا اور کوئی نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے نورِ بصیرت سے مستفیض ہونے کا تادیر موقع عطا فرمائے۔

اتوار (۱۹ جون) کی صبح کسی نے میرے دروازے پر دستک دی۔ دیکھا تو حافظ صاحب قبلہ کے منشی صاحب ہیں۔ کہا کہ حافظ صاحب تشریف لائے ہیں۔ دیکھا تو مصطفیٰ میاں کے ساتھ موٹر میں تشریف فرما ہیں۔ ضعفِ پیری اور عوارض کی وجہ سے آپ کے لئے پاؤں چلنا تو ایک طرف، موٹر تک کا سفر دشوار ہو چکا تھا۔ حیران کہ انھوں نے اس قدر تکلیف فرمائی! فرطِ انبساط سے میرا یہ عالم کہ — ”جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں“ — کرم فرمایا اور موٹر سے اتر کر کمرے تک تشریف لے آئے۔ میرا ظلمت کدہ قرآن کے نور سے وادیٰ یمن بن گیا۔ تشکر اُعرض کیا کہ آپ نے اس قدر رحمت فرمائی۔ فرمایا کہ کئی دنوں سے یہ کھٹک پیدا ہو رہی تھی کہ ایک خادم قرآن

کے پاس چل کر جانے کے ثواب سے کہیں محروم ہی نہ رہ جاؤں۔ آج یہ آرزو پوری ہو گئی۔

وہ یہ کچھ فرما رہے تھے اور میری یہ کیفیت تھی کہ — چشم بردے اوکشا باز بخوشتن مگر — حیران تھا کہ اس کا کیا جواب دوں؟ ان کی لطف فرمائی کی بنا پر فرط انبساط اور پچھیزی کے احساس سے دفورِ ندامت کے لئے جلے جذبات سے میرا سینہ طلسمِ بیچ و تاب بن گیا اور باوجود ہزار کوشش کے میں ایک لفظ تک بھی نہ کہہ سکا۔

اس مقام پر مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ قریب سات آٹھ سال اُدھر کا ذکر ہے۔ میں گرمیوں کی ایک شام اپنے مکان واقع نوزجہاں روڈ (نئی دہلی) کے باہر بیٹھا تھا کہ سامنے ایک بڑا شاندار موٹر کارر کا اور اس میں سے ایک باوقار شخصیت نے میرے مکان کا رخ کیا۔ قریب آکر کہا کہ ”میں ہوں سید عبدالعزیز“

عزیز الملت سید عبدالعزیز (مرحوم)۔ سابق صدر بہار مسلم لیگ، جو اس زمانے میں مملکتِ حیدرآباد میں وزیر امور مذہبیہ تھے۔

میں نے عرض کیا کہ آپ نے اتنی زحمت فرمائی۔ مجھے اطلاع دی ہوتی، تو میں خود حاضر ہوتا۔ (سید صاحب کے خلوص اور بے لوث خدمات کا میں بے حد معترف تھا) فرمایا کہ میں قرآن کی نسبت سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ تمہیں وہاں بلانے کی جسارت کیسے کرتا؟ میں نے جاتے وقت معارف القرآن (جس کی جلد اول اس زمانے میں ابھی ابھی شائع ہوئی تھی) کا ایک نسخہ پیش کیا تو اسے احتراماً کھڑے ہو کر لیا اور جھک کر تعظیم کی۔ قرآن سے ایسی محبت! کیوں نہ ہوتی وہ بھی تو اسی معدنِ رشد و سعادت کے دُرِ شاہوار تھے۔ قبلہ حافظ صاحب سے انھیں برادرِ نسبتی ہونے کا تعلق تھا۔ این خانہ ہمہ آفتاب است۔

قبلہ حافظ صاحب سے سلسلہ کلام چھڑا تو فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ میں تو اب اللہ میاں کے ہاں سے (EXTENSION) (توسیعِ ملازمت) پر ہوں۔ پہلے درخواست کی تھی کہ تمہاری کتاب کی دوسری اور تیسری جلد دیکھ لینے تک کی مہلت مل جائے۔ وہ منظور ہو گئی تو اب جلد چہارم تک کی توسیع کے لئے پھر گزارش کیا ہے۔ لہذا اس کی تکمیل طباعت میں جلدی کرو۔ فرمایا کہ میری بینائی کا تھوڑا سا جھٹہ جو باقی رہ گیا ہے اسے میں نے اس کتاب کے لئے محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔

کس قدر بلند ہے نگاہ ان حضرات کی جو اس انداز سے دوسروں کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ دعوتِ الحق میں ایک مقام ایسا ہے جس پر نظر ثانی کی ضرورت سمجھتا ہوں۔ کل میں نے کچھ لکھا ہے

اور اس طرح نکھاسے کہ کاغذ پر قلم چلائے گیا ہوں۔ اس لئے کہ دکھائی تو دیتا نہیں کہ کیا کھ رہا ہوں۔ مکمل ہو گیا تو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ قرآن کے متعلق کوئی ایسی بات دوسروں تک نہیں پہنچانی چاہیئے جس کی صحت میں یقین نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے یقین کے باوجود ہم غلطی پر ہوں لیکن اس سے اللہ کے ہاں سے معافی کی امید ہو سکتی ہے، پہلی صورت میں نہیں۔

چونکہ دن بڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی تمازتِ آفتاب بھی، اس لئے کچھ دیر کے بعد آپ واپس تشریف لے گئے۔

یہ تھی وہ لورانی صبح جو میری زندگی کے یادگار لمحات میں رہے گی۔ ان ہستیوں کا وجود مغفلات میں سے ہے۔ ان کے بعد یہ کرسیاں خالی ہو جائیں گی اور ہماری نگاہیں اس روشنی کے لئے ترستی رہیں گی۔
تقویٰ اور تدبیر کی بے لوث زندگی اور تمام عمر قرآن میں تدبر اور اس کی تبلیغ! یہ ان کے بعد کہاں ملے گا؟
مبارک ہیں یہ ہستیاں اور مبارک ہیں ان کے ثمراتِ حیات۔ رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ وَرَضُوا عَنْہُ ذَٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۵/۱۱۹)۔

عبادت

(خدا اور انسان کے تعلق کے متعلق اہم مباحث)

(دسمبر ۱۹۴۹ء)

سامنے میز پر گھڑی رکھی تھی۔ شیشہ ٹوٹا ہوا اور منٹ کی سوئی غائب۔ گھنٹے کی سوئی پر میری نگاہ تھی اور میں ایک گہری سوچ میں ڈوبا، ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس میں کوئی حرکت محسوس نہ ہوئی لیکن میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک سے دو اور دو سے تین پر جا پہنچی۔ میں نے سوچا کہ بعض تغیرات ذہنِ انسانی میں بھی کچھ ایسے ہڈیجا اور غیر شعوری طور پر رونما ہوتے ہیں کہ جب تک ان کا مجموعی اثر ایک نمایاں انقلاب کی شکل میں ظاہر نہیں ہو جاتا یہ محسوس ہی نہیں ہونے پاتا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ عمل میں آ رہا ہے۔ ذہنی انقلاب کے یہ تجزیہ اور تعمیری مراحل دریا کی پرستو ردانیوں کی طرح کچھ ایسے غیر مرئی طور پر طے پا جاتے ہیں کہ جو خطوط ابتداء نقوشِ برآب سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے ہوں، وہی ایک عرصے کے بعد محکمِ حصارِ سنگین کی بنیادیں بن جاتے ہیں۔ تاریخِ انسانیت میں اس قسم کے غیر محسوس اور غیر مرئی تغیر و تبدل کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے آتی ہیں لیکن جو انقلاب اسلام کے متعلق مسلمانوں کے ذہن میں رونما ہوا ہے شاید ہی اس کی نظائریں اور مل سکے! اسلام بمعیتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک مکمل نظامِ حیات تھا۔ آجکل کی اصطلاح

میں یوں سمجھئے کہ ایک عالمگیر دولتی نظام (A UNIVERSAL SYSTEM OF STATE)

تھا لیکن وہ اپنے اس صحیح اور بلند ترین مقام سے آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر سرکتے سرکتے مذہب (RELIGION) کی شکل اختیار کر گیا۔ تاریخِ انسانیت کا یہ ایک ایسا نتیجہ انیکر انقلاب ہے جس پر ہر دیدہٴ عبرت خوفشاں اور ہر قلبِ حساس طلسمِ پرچ و تاب بن کر رہ جاتا ہے۔ جب اسلام کا مقابلہ مذہبِ عالم (یعنی دنیا کے دھرموں) کے ساتھ کیا جاتا ہے یعنی

اسے ہندومت، بدھ مت، جین مت، عیسائیت، یہودیت، زرتشتیت وغیرہ مروجہ مذاہب (دھرم) کے سامنے لایا جاتا ہے تو دیدہ بینا میں خیف سی ہنسی پیر جاتی ہے کہ کیا چیز کیا بن کر رہ گئی ہے۔
انقلابات ہیں زمانے کے

اسلام مذہب نہیں | اسلام دھرم (باصطلاح عوام مذہب) نہیں، اس لئے مختلف دھرموں (مذاہب) سے اس کا موازنہ کیا؟ یہ ایک نظام زندگی ہے یا سمجھنے کے لئے یوں کہئے کہ نظام حکومت ہے۔ اس لئے اس کا مقابلہ کیا جائے گا۔ ان نظام ہائے حکومت سے جو ذہن انسانی نے آج تک وضع کئے ہیں ادیبوں بتایا جائے گا کہ نظام آسمانی، زمین کے نظام ہائے حکومت سے کس طرح فائق اور برتر ہے۔ اسلام دین ہے، نظام اطاعت ہے، دھرم نہیں۔ اس لئے اس کے مقابلہ میں اطاعت کے مختلف نظام، یعنی حکومت کے مختلف انداز و طریق جو انسانوں نے وضع کئے ہیں، لائے جائیں گے، یا مختلف آئینی نظام، اجتماعیہ، مثلاً سوشلزم، نازی ازم، فاش ازم، کمپٹل ازم (سرمایہ داری وغیرہ) کے ساتھ اسلام کے نظام اجتماعیہ کا موازنہ کیا جائے گا اور یوں ثابت کیا جائے گا کہ اسلام ایک ایسا نظام اجتماعیہ یا نظام حکومت ہے جس کی مثل و نظیر کوئی اور نظام نہیں۔ اسلام کو دھرم (باصطلاح عوام مذہب) تسلیم کرنے سے اسلام اپنے صحیح مقام سے گر کر کسی اور مقام میں جا پہنچتا ہے اور جب اس کے متعلق نگاہ میں ایک مرتبہ یہ بنیادی فرق پیدا ہو گیا تو اس کے بعد اس کے متعلق جو کچھ سمجھا جائے گا، وہ اس نئے مقام سے متعلق ہوگا۔ اس کے اصلی مقام سے اس کا کچھ واسطہ نہیں ہوگا۔ اسلام کے متعلق مسلمانوں کی نگاہوں میں اتنی بڑی بنیادی تبدیلی کس طرح پیدا ہو گئی، یہ ایک داستان ہے بڑی دلخوش اور ایک حدیث الہیہ بڑی جانگداز۔ اس کے لئے تیرہ سو سال کی مسلمانوں کی نہیں بلکہ اسلام کی، تاریخ پر گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ گہری اس لئے کہ یہ تبدیلی اس طرح غیر مرئی اور غیر محسوس

۱۔ اسلام درحقیقت انسانی حیات اجتماعیہ کے نظام کا نام ہے لیکن چونکہ آج کل حیات اجتماعیہ کی تعبیر نظام حکومت سے ہی کی جاتی ہے، اس لئے ہم نے اسے نظام حکومت سے تعبیر کیا ہے ورنہ اسلام کا نظام زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے۔

۲۔ دین اور مذہب کے فرق کے لئے دیکھئے۔ "اسباب زوال امت"

۳۔ اس کی صراحت "اسلام آگے کیوں نہ چلا" کے مقالہ میں کی گئی ہے جو "سیلم کے نام خطوط" (جلد سوم) میں شامل ہے۔

طور پر واقع ہوئی ہے، جیسے گھڑی کے گھنٹے کی سوئی غیر محسوس طور پر ایک مقام سے دوسرے مقام تک جا پہنچتی ہے۔ یہ تبدیلی کس طرح ہوئی، سرِ دست اسے چھوڑیے۔ دیکھئے صرف یہ کہ تبدیلی ہوئی اور ایسی محکم بنیادوں پر ہوئی کہ آج ہم میں یہ احساس بھی نہیں رہا کہ اسلام مذہب نہیں تھا کچھ اور تھا!

مذہب کیا ہے؟ | مذہب سے مفہوم یہ ہے کہ انسان پرستش یعنی پوجا پاٹ کے لئے کسی شے (OBJECT) کو تجویز کرتا ہے۔ اس کے سامنے ماتھا ٹیکتا ہے، پرستش کی رسوم وضع کرتا ہے۔ یہ پرستش کی شے کوئی پتھر ہو یا مظاہرِ فطرت میں سے کوئی چیز، اجرامِ سماوی ہوں یا کوئی دوسرا انسان، فرشتے ہوں یا خدا، کچھ بھی ہو اور کوئی بھی ہو، انسان اور اس کے درمیان تعلق صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے پرستش کی چیز (OBJECT OF WORSHIP) ہوتا ہے اور یہ اس کا پرستار یعنی پوجیئے والا (WORSHIPPER) اس کے سامنے ماتھا ٹیک دیا، پوجا کی رسومات ادا کر دیں تو پرستار اور پرستیدہ کا تعلق ختم ہو گیا۔ باقی رہی دنیا سے معاملات، تو اس کے لئے اخلاقیات کی چند چیزیں ہیں جو عام طور پر ہر جگہ مشترک پائی جاتی ہیں۔ مثلاً جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، حرام کاری سے بچو، کسی کو دکھ نہ دو وغیرہ۔ وہ ہے خدا پرستی اور یہ ہے نیک عملی۔ اس کا نام ہے مذہب اور بظاہر ہے کہ اس اعتبار سے تمام مذاہب برابر ہیں اور چونکہ اسلام کو بھی ایک مذہب خیال کر لیا جاتا ہے، اس لئے انسان اس فریب کا شکار ہو جاتا ہے کہ دنیا میں تمام مذاہب یکساں ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک مذاہب کا تعلق ہے، تمام مذاہب یکساں ہیں لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اسلام مذہب نہیں "دین" ہے اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام سمیت تمام مذاہب (دھرم) یکساں ہیں۔ (قرآنِ کریم میں "مذہب" کا لفظ تک نہیں آیا۔ اس نے اسلام کو "الدین" کہا ہے۔ یعنی ضابطہ زندگی)

اسلام میں خدا کا تصور | اسلام میں خدا پوجا پاٹ کی شے (OBJECT OF WORSHIP) نہیں، بلکہ حاکم اعلیٰ ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان پرستار اور پرستیدہ کا تعلق نہیں، بلکہ حاکم اور محکوم کا تعلق ہے۔ دین سے مفہوم خدا کی پرستش نہیں، بلکہ خدا کی حاکمیت کا عملی اقرار ہے۔ یہاں نیک عملی سے مقصود محض ضابطہ اخلاق کی پیروی نہیں جو ہر جگہ یکساں ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ خدا کی ہستی کے منکر ہیں، ان کے ہاں

بھی وہی ضابطہ اخلاق موجود ہے۔ اسلام میں نیک عملی سے مراد اس ضابطہ قانون کی اطاعت ہے جو خدا کی حکومت کا دستورِ اساسی ہے۔ اسلام کا تقابل ضوابط اخلاق سے نہیں بلکہ دنیا کے ضوابط قانون و دساتیر سے ہوگا، نظام حکومت اور آئین سلطنت سے ہوگا۔ اخلاقی ضابطہ تو اس ہمہ گیر ضابطہ قانون کا ایک گوشہ ہے۔ اس نظام حکومت (دین) اور دنیا کے دیگر نظام ہائے حکومت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ یہاں اصولاً قانون سازی کا اختیار کسی کو نہیں۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسان اس قانون کو نافذ کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ امتیازی خصوصیت جو کسی اور نظام حکومت کا حاصل نہیں۔

جب کسی تعلیم کے اصول و مبادیات کا مفہوم بدل جائے تو ان کے متعلقات کا مفہوم خود بخود بدل جاتا ہے۔ جب اسلام دین سے بدل کر مذہب ہو گیا تو اس کی اصطلاحات کے معانی میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ جب خدا کا تصور حاکم کا تھا تو اس کی عبادت سے مفہوم اس کی محکومیت تھی۔ جب وہ ایک پوجا کی چیز (OBJECT OF WORSHIP) بن گیا تو عبادت کے معنی بھی پوجا اور پرستش کے رہ گئے۔ آج اگر کسی کے متعلق کہا جائے کہ وہ بڑا ”عبادت گزار“ ہے تو اس کا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا، بلکہ اس سے فوراً آنکھوں کے سامنے اس قسم کا نقشہ آ جاتا ہے کہ وہ خدا کی بڑی پرستش کرتا ہے، فوافل پڑھتا ہے، تسبیح پھرتا ہے، زاہد شب زندہ دار ہے، صائم المہر ہے، ایک گوشہ میں بیٹھا ذکر و فکر میں مستغرق رہتا ہے، یعنی دھرم میں جتنی چیزیں بھگتی کی تھیں ان سب پر کار بند ہے۔ اس سے کچھ غرض نہیں کہ وہ محکوم کس کا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ ایک لفظ (عبادت) کا مفہوم بدلنے سے کس طرح سارے کا سارا نظام نگاہوں سے اوجھل ہو گیا؟ اوجھل ہی نہیں، بلکہ ایسے نظام میں بدل گیا جو اصل نظام سے یکسر مختلف ہے۔

عبادت کے معنی؟ | حالانکہ لفظ عبادت کے معنی محکومیت ہیں اور عبد کے معنی غلام، بندہ محکوم۔

جب حضرت موسیٰؑ (اور حضرت ہارونؑ) نے فرعون کو ایمان کی دعوت دی تو اس نے اور اس کے ارباب حل و عقد نے یہ کہہ کر اس دعوت کو مسترد کیا تھا، بلکہ اس کا استخفاف کیا تھا کہ ہم اس قوم کے نمائندوں کی دعوت کو کیسے قبول کریں جو خود ہماری محکوم ہے۔ اس کے لئے لفظ ”عابد“ آیا ہے۔

فَقَالُوا أَأَتُومِنَ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْهُمْ هَمَّا لَنَا عَابِدُونَ (۲۳/۲۷)

”انھوں نے کہا کیا ہم ان دو اپنے جیسے آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟ حالانکہ ان کی قوم ہماری محکوم ہے۔“

یعنی انھوں نے کہا کہ یہ دعوت ایمان دینے والے بالکل ہماری طرح کے انسان ہیں۔ (فوق البشر دکھائی نہیں دیتے) اور اس قوم کے فرد ہیں جو ہماری محکوم ہے۔ یہاں عابد کے معنی واضح ہیں۔ اسی داستان کے دوسرے ٹکڑے میں ہے کہ فرعون نے موسیٰ سے کہا کہ تم بڑے احسان ناشناس اور مروت فراموش ہو۔ میں نے تم پر اور تمھاری قوم پر اس قدر احسانات کئے ہیں اور تم ان احسانوں کا بدلہ یہ دے رہے ہو؟ حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ جی ہاں! میں آپ کے ان احسانات سے خوب واقف ہوں۔ یہ احسانات ایسے ہی ہیں جیسے ایک قصاب بکری کو گھاس اور دانہ دے کر اس کی پرورش کا احسان جتاٹے۔ ذرا بتاؤ تو وہی۔

وَلَيْكَ نِعْمَةٌ تَمْنَاهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتُ بَنِي إِسْرَءِيلَ ۝ (۲۶/۲۲)

کیا یہی وہ نعمتیں ہیں جن کا تم مجھ پر احسان دہہ رہے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔

عَبَّدْتُ کے معنی واضح ہیں یعنی تو نے انھیں اپنا محکوم بنا رکھا ہے۔ لہذا عباد اور عابد کے معنی ہیں محکوم اور معبود کے معنی ہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے اور عبادت کے معنی ہیں محکومیت۔ فارسی میں عباد کے معنی بندہ اور عبادت کے معنی بندگی اپنا مفہوم ادا کر سکتے تھے لیکن یہی بندگی ہندوستان میں آکر پوجا اور پرستش بن کر رہ گئی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر صرف تعظیم اور ڈنڈوت کے معنی میں استعمال ہونے لگ گئی۔ اب بندگی کے معنی پرستش سے زیادہ کچھ نہیں۔ محکومیت کا تصور نہ لفظ عبادت کے اندر رہ گیا ہے نہ بندگی کے اندر۔

سورۃ کہف میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ لَا يُشْرِكُ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (۱۸/۱۱۰) (انسان کو چاہیے کہ) اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرے اور اسی سورت کے شروع میں خدا نے خود اپنے متعلق فرمایا ہے۔ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۱۸/۲۴)۔ وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یعنی إِنْ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (۱۲/۴۰)۔ حکومت صرف اللہ کے لئے ہے۔ أَمَرَ الْأَنْعَبِدُ إِلَّا آيَاتُهُ (۱۲/۴۰) اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومیت نہ اختیار کی جائے۔

کتنی بڑی حقیقت ہے۔ محکوم قوم لاکھوں صدائمتوں کی حامل ہو، کوئی اس کی دعوت پر سنجیدگی سے غور کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ اس کا محکوم ہونا ہی ہزار عیب کا ایک عیب ہے۔

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

ان مقامات سے عبادت کے معانی بالکل صاف طور پر سامنے آجاتے ہیں، یعنی عبادت کے معنی محکومیت کے ہیں۔ ”خدا کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرو“ یعنی اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرو، اس لئے کہ ”حکومت صرف اللہ کے لئے ہے“ اور اس کا حکم ہے کہ ”اس کے سوا اور کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو“ یہی قرآن کریم کی دعوت ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (۲/۲۱)

اے افرادِ نسلِ انسانی! اپنے اس رب کی محکومیت اختیار کرو جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور انہیں بھی جو تم سے پہلے ہو گزرے تاکہ تم تقویٰ شعار ہو جاؤ۔

اور یہ دعوت کوئی نئی دعوت اور یہ پکار کوئی انوکھی پکار نہیں، بلکہ شروع سے سلسلہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت اور یہی صدائے ربانی رہی ہے کہ خدا کے سوا کسی کی حکومت کو تسلیم نہ کرو۔ یہ انسانیت کی انتہائی ذلت ہے کہ انسان اپنے جیسے انسانوں کا محکوم ہو جائے۔ محکوم اس کا ہونا چاہیئے جو اپنے سے بلند و بالا ہو اور انسان سے بلند صرف خدا کی ذات ہے۔ ہر رسول کا یہی پیغام ہے اور ہر نبی کی یہی تعلیم تھی۔ اس لئے یہ پیغام، پیغام خداوندی، اور یہ تعلیم، تعلیم ایزدی تھی۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا۔

أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ (۱۱/۲۲)

کہ اللہ کے سوا اور کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو۔

یہی حضرت یحییٰؑ نے فرمایا۔

قَالَ يَقُومُ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ (۱۱/۵۰)

کہا کہ اے میری قوم! اللہ کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی الہ (حاکم) نہیں۔

انبیاء کی تعلیم | انہی الفاظ میں حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو پیغام خداوندی پہنچایا (۱۱/۶۱)۔ یہی حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔ (۱۱/۸۲) حضرت یوسفؑ نے قید خانہ کی چار دیواری

میں جو وعظ فرمایا، وہ خدا اور بندے کے اسی تعلق کو واضح کرنے کے لئے تھا۔ انہوں نے اپنے ساتھی قیدیوں

سے پوچھا کہ

عَرَبَاتٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَلِيلٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۲/۳۹)

کیا الگ الگ آقاؤں کا ہونا اچھا ہے یا اللہ کا جو یگانہ ہے اور سب پر غالب ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم لوگوں نے جن کی محکومیت اختیار کر رکھی ہے، انہیں کوئی حق نہیں کہ انسانوں کو اپنا غلام اور محکوم بنائیں۔ ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آبا و اجداد نے رکھ لئے ہیں۔ جیسے تھپڑ کے مناشے میں کسی کا نام بادشاہ رکھ لیا جاتا ہے، کسی کا نام وزیر، حالانکہ وہ فی الحقیقت بادشاہ یا وزیر نہیں ہوتے۔ یاد رکھو۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (۱۲/۴۰)

حکومت صرف اللہ کے لئے ہے۔

اس کے بعد جو کچھ فرمایا اس سے عبادت کی مفہوم بالکل نمایاں ہو جاتا ہے۔ کہا۔

أَمْرًا لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا إِلَٰهًا (۱۲/۴۰)

اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت اختیار نہ کرو۔

ان دونوں ٹکڑوں کو پھر لایئے یعنی (۱) حکومت صرف اللہ کے لئے اور (۲) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت اختیار نہ کرو۔ (تعبد و) ظاہر ہے کہ عبادت سے مفہوم محکومیت کے سوا اور کچھ نہیں ذَالِكَ الْدِّينُ الْقَبِيْمُ (۱۲/۴۰) یہی محکم اور متوازن نظام اطاعت (دین) ہے وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۱۲/۴۰) لیکن (مشکل یہ ہے) کہ بہت سے لوگ (اس حقیقت سے) واقف نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے إِنْ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ جو لوگ انسانوں کو اپنا ماکم تسلیم کر لیتے ہیں، ان کی یہ روش لاعلمی پر مبنی ہے لَا يَعْلَمُونَ علم آ جانے کے بعد، یعنی اپنی حقیقت اور دوسرے انسانوں کی صحیح پوزیشن معلوم ہو جانے کے بعد یہ ہونہیں سکتا کہ انسان خدا کے سوا اور کسی کی حکومت کو جائز تسلیم کرے۔ وحدتِ خلق کا وہ عظیم الشان نظریہ جسے قرآن نے اس بلند آہنگی سے پیش کیا ہے اور جس کی تصدیق و تائید آج علمِ انسانی کے انکشافات بدلائل و براہین کر رہے ہیں اس حقیقتِ عظمیٰ کا آئینہ دار ہے کہ انسان میں اخوت و مساوات کا تعلق ہے، حاکم اور محکوم کا رشتہ نہیں۔ حکومت غالب کی ہو سکتی ہے اور غالب (قہار) صرف خدا کی ذات ہے۔ کائنات کی ہر شے انسان کے سامنے سجدہ ریز ہے۔

یہ مسجود ملائک اور مخدوم لوہائیں فطرت ہے۔ اس لئے ان چیزوں کے سامنے جھکنا انسانیت کی تذلیل ہے۔ انسان سب برابر ہیں۔ برابر والے کی محکومیت اس کی اور اپنی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ بس ایک خدا کی بستی باقی رہ جاتی ہے جو انسانوں سے ارفع و اعلیٰ اور غالب و بالادست ہے۔ لہذا محکومیت اسی کی جائز اور بجا ہو سکتی ہے۔ **ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ** ۵ (۱۲/۲۶)

عبادت یعنی محکومیت کے متعلق تمام انبیائے سابقہ علیہم السلام اسی ایک حقیقت کو بار بار دہراتے رہے اور یہی وہ حقیقت کبریٰ تھی جس کا مکمل اور آخری اعلان حضور سرور کائنات صلعم کی وساطت سے تمام نوع انسانی میں کیا گیا۔

وَقَضَىٰ رَبِّيَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا لِيَّ ۚ (۱۶/۲۳)

اور میرے رب نے یہ بات ٹھہرا دی ہے کہ اس کے سوا اور کسی کی عبادت اختیار نہ کرو۔

رسول کو بھی یہ حق حاصل نہیں | خدا کی حکومت کو چھوڑ کر عام انسانوں کی محکومیت تو ایک طرف،

قرآن کریم نے انتہائی شکل کو سامنے لا کر اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ اور تو اور کسی رسول کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ انسانوں کو اپنا محکوم بنالے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَيْكَ ۚ وَلَٰكِنَّ كُونُكُمْ عِبَادًا لِّإِلَٰهٍِ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ۵ (۳/۷۸)

کسی انسان کو یہ بات زیبا نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے (محکوم) ہو جاؤ۔ بس وہ یہی کہے گا کہ تم ربانی ہو جاؤ۔ اس لئے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے رہتے ہو اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا ضابطہ قوانین رسولوں کی وساطت سے انسانوں تک پہنچایا اور رسولوں کو ان قوانین کے نافذ کرنے کی قوت بھی عطا فرمائی تاکہ وہ عملاً خدا کی حکومت کو دنیا میں رائج کر کے دکھا دیں۔ یہی ان حضرات علیہم السلام کا منصب تھا۔ اس لئے عام انسان تو ایک طرف، ان حضرات انبیاء عظام کے لئے بھی یہ سزاوارہ تھا کہ وہ لوگوں کو خدا کی محکومیت کے بجائے اپنے احکام کا مطیع و فرماں پذیر بنائیں۔ ان کی دعوت یہ تھی کہ سب لوگ

خدا کے نظام ربوبیت کے حامل بن جائیں اور اس کا ذریعہ وہ ضابطہ قوانین (کتاب) ہے جو اس نے بغرضِ اطاعت نازل فرمائی ہے۔ (مَا كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ الْكِتَابَ) اسی سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے مین آیتوں کے بعد فرمایا کہ:-

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا
وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۝ (۳/۸۲)

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نظام اطاعت (دین) چھوڑ کر کوئی دوسرا نظام تلاش کر لیں؟ حالانکہ آسمان اور زمین میں جو کچھ بھی ہے خوشی سے ہو یا ناخوشی سے سب اسی کے قانون کے فرماں بردار ہیں اور ان کے ارتقا کی سب گردشیں اسی (قانونِ سرمدی) کی طرف رخ کئے ہوئے ہیں۔

یعنی یہ نظام حکومتِ الہیہ عین تقاضائے فطرت ہے۔ کائنات کی ہر شے ایک ہی نظامِ اطاعت اللہ ہی کے ضابطہ قوانین کے تابع اپنے فرائض کی سر انجام دہی میں گمراہ ہے۔ کوئی شے نہ اس کی محکومیت سے سرتابی کر سکتی ہے نہ کسی دوسرے کی محکومیت اختیار کر سکتی ہے۔ جب کائنات کی ہر شے کی ہی فطرت اور یہی آئین ہے تو پھر انسان کے لئے کوئی اور آئین حکومت اور نظامِ اطاعت (دین) کیوں ہو؟ اگر انسان کوئی دوسرا نظام اختیار کریں گے تو اس غیر فطری نظام زندگی کی سزا بھگتیں گے۔ اللہ کے میزان میں ان کی یہ روش زندگی ناقابلِ قبول ہوگی۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ (۳/۸۴)

اور جو کوئی اسلام (نظام حکومتِ خداوندی) کے علاوہ کسی اور نظامِ اطاعت (دین) کا خواہش مند ہوگا، تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔

خدا کی اطاعت و محکومیت کے علاوہ کوئی بھی نظامِ اطاعت و حکومت ہو، سب غیر اسلامی اور خلافِ شرفِ انسانیت ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں ایسے نظام کا نام طاغوتی نظام یعنی غیر اللہ کا نظام ہے۔ جو خدا کی حکومت سے سرکشی اختیار کر کے کوئی اور نظامِ اطاعت و حکومت قائم کرے، وہی طاغوت ہے۔ اس لئے حکومتِ خداوندی کا اقرار اور ہر طاغوتی نظامِ اطاعت کا انکار دینِ قیم ہے۔

فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمَرْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ

الْوُثْقَى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۵۶)

اور جس نے طاغوت کی اطاعت سے منہ پھیر لیا اور اللہ پر ایمان لایا تو اس نے بلاشبہ محکم شاخ کو پکڑ لیا، جو ٹوٹ نہیں سکتی۔

خدا پر ایمان کا مفہوم | یہ خدا کا اقرار اور غیر خدا کا انکار ہے۔ خدا کے اقرار سے مطلب یہ ہے کہ اطاعت صرف اس کے قانون کی کی جائے اور اس کے قانون کی اطاعت

اس نظام کے ذریعہ ہوتی ہے جو ان قوانین کے نفاذ کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔ سورہ نسا میں ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُطِيعُوا أَمْرًا مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (۴/۵۹)

اے ایمان والو! اللہ کے نظام حکومت کے مرکز (اللہ اور رسول) کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں سے اس مرکز نے صاحب اختیار بنائے ہوں۔ پھر اگر ایسا ہو کہ تم میں اور ان صاحبان اختیار میں اختلاف پیدا ہو جائے تو چاہیے کہ مرکز نظام خداوندی کی طرف رجوع کرو۔ اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی میں تمہارے لئے بہتری ہے اور اسی میں انجام کار کی خوبی ہے۔

یعنی خدا اور آخرت پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ تم خدائی نظام کی اطاعت اختیار کرو اور اپنے تمام اختلافات و نزاعات کے رفع کرنے کے لئے اسی مرکز اطاعت و تسلیم کی طرف رجوع کرو۔ خدا پر ایمان لانے سے خدا اور بندے کے درمیان بھی تعلق پیدا ہونا چاہیے، یعنی حاکم اور محکوم کا تعلق۔ نہ یہ کہ خدا کو ایک پرستش کی شے (OBJECT OF WORSHIP) سمجھ کر اس کی پوجا کر لی اور اپنے معاملات میں غیر خدائی نظام کی طرف رجوع کیا۔ یہ تو خدا کے بجائے طاغوت پر ایمان کے مترادف ہے جس سے انکار کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ آیت مندرجہ صدر سے اگلی آیت میں فرمایا:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ

ضَلَّلَ الْكَافِرِينَ ۱۔ (۴/۶۰)

کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ جو کچھ تجھ پر نازل کیا ہوا ہے اور جو کچھ تجھ سے پہلے نازل ہو چکا ہے، وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں لیکن (عملاً یہ حالت ہے) کہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات میں فیصلہ غیر خدائی نظام (یعنی طاغوت) سے کرائیں حالانکہ انھیں حکم دیا جا چکا ہے کہ وہ طاغوت سے انکار کریں اور اصل یہ ہے کہ سرکش نظام چاہتا ہے کہ انھیں اس طرح بہکا دے کہ راہِ راست سے بہت دور جا پڑیں۔

ان دونوں آیتوں کو سامنے رکھتے اور پھر غور کیجئے کہ اللہ پر ایمان اور طاغوت سے انکار کے معنی کیا ہیں؟ خدائی قانون سے فیصلے طلب کرنا، یہ ہے خدا پر ایمان اور اس کی عبودیت اور غیر خدا سے معاملات کے تصفیے کرنا، یہ ہے طاغوت پر ایمان اور اس کی محکومیت۔ پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ تمہیں خدائی قانون کی محکومیت کے صراطِ مستقیم سے گمراہ کر کے محکم الی الطاغوت (غیر خدائی نظام کی محکومیت) کے غلط راستے پر لے جائے، ایسا غلط راستہ جس پر چلنے سے تم صحیح راستہ سے بہت دور جا پڑو، یعنی یہ دونوں راہیں ایک دوسرے سے بالکل متضاد (DIAMETRICALLY OPPOSITE) ہیں۔ شیطان یہ چاہتا ہے کہ تم طاغوتی نظام اختیار کرو۔ اس لئے یہ خود شیطان (یعنی قانون خداوندی سے سرکشی کرنے والوں) کا نظام ہے اور خدائی نظام کے مخالف اِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْفَحْشَاءِ (۲۱/۶۹) شیطان تمہیں ناہمواریاں پیدا کرنے والے نظام اور بخل کا حکم دیتا ہے، اس کے برعکس، اِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ (۲۱/۶۸) یقیناً اللہ بخل کا حکم کبھی نہیں دیتا۔ بلکہ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَنَهٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (۱۶/۹۰) یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں عدل و احسان کا حکم دیتا ہے اور فواحش و منکر سے روکتا ہے۔ یعنی اللہ جس بات کا حکم دیتا ہے ”شیطان“ اس سے روکتا ہے اور جس بات سے اللہ روکتا ہے، ”شیطان“ اسے اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ خدا اور ”شیطان“ کے نظام ایک دوسرے سے متضاد اور ان کے فیصلے ایک دوسرے سے متضاد و مخالف ہوتے ہیں۔ اس لئے قرآن کریم نے جہاں خدا کی عبادت (محکومیت) کا حکم دیا ہے اسی کے ساتھ ہی ”شیطان“ کی عبادت (محکومیت) سے منع کیا ہے۔

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يٰٓأَدَمُ أَنْ لَا تَعْبُدَ الشَّيْطَانَ ۚ إِنَّهُ لَكُمُ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۚ وَإِنْ أَحْبَبْتَ فِي هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝ (۳۶/۸۰-۸۱)

یہاں عبادت کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ اگر (لَا تَعْبُدُ الشَّيْطَانَ) شیطان کی پرستش کے معنی یہ لئے جائیں کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرنا تو اس سے مطلب

کچھ نہیں نکلتا۔ اس لئے کہ دنیا میں کون ہے جو شیطان کی پرستش (WORSHIP) کرتا ہے؟ شیطان کے (یعنی غیر خدائی) احکام مانے جاتے ہیں۔ طاغوتی نظام کی اطاعت اختیار کی جاتی ہے لیکن شیطان کی پرستش تو کہیں نہیں ہوتی۔ عراق میں موصل کے قریب ایک باطنی قسّم فرقہ (یزیدی) کے متعلق مشہور ہے کہ وہ شیطان کی پرستش کرتے ہیں لیکن تحقیقات نے یہ بتا دیا ہے کہ وہ بھی درحقیقت شیطان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اس کے خوف کی وجہ سے اس کے خلاف کچھ نہیں کہتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا تورحیم و کریم ہے، اس لئے اس سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں لیکن شیطان سے ضرور خوف کھانا چاہیئے کیونکہ وہ بڑا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ اسی لئے اسے شیطان نہیں کہتے بلکہ اس کا نام ”ملک طاؤس“ رکھ چھوڑا ہے۔ یہ غالباً شیطان کے حضرت آدم کو بہکانے کی اسرائیلی روایت کی طرف تلمیح ہے۔ بہر حال مقصد یہ بتانا تھا کہ شیطان کی پرستش (پوجا) کوئی نہیں کرتا۔ اس لئے (لَا تَعْبُدُ الشَّيْطَانَ) کے معنی یہ ہیں کہ شیطان کی اطاعت نہ کرو۔ لَا تَقْبَلُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ - (۲/۱۶۸) شیطان کے نقش قدم کا اتباع نہ کرو۔ لہذا عبادت کے معنی اطاعت و محکومیت کے ہیں۔

عبادت کے قرآنی مفہوم کو پیش نظر رکھئے اور پھر اس آیہ جلیلہ پر غور فرمائیے کہ
وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱/۵۶)
اور میں نے جن اور انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

ح ایک انگریز (قانون) نے ان لوگوں کے کوائف و معتقدات کا ذاتی طور پر مطالعہ کر کے اس نام سے ایک دلچسپ کتاب شائع کی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ شیطان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اس سے ڈرتے ہیں۔ اس مقام پر شیطان سے مراد (DEVIL) ہے لیکن قرآن جس شیطانی نظام کی محکومیت سے منع کرتا ہے، وہ انسانوں کا خود ساختہ ہر غیر خدائی نظام ہے جس میں قانون خداوندی سے سرکشی اختیار کی جاتی ہے۔

یعنی جن دانس کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ خدا کی "عبادت" کریں۔ (جن کے کہتے ہیں؟ اس کے لئے میری کتاب "ابلیس و آدم" دیکھئے) اگر (یعبدون) کے معنی پوجا اور پرستش کے لئے جائیں تو ارشاد خداوندی کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کو چاہیئے کہ ہر وقت خدا کی پرستش کرتا رہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ناممکن ہے انسان ہر وقت خدا کی پرستش کیسے کر سکتا ہے؟ پرستش تو کچھ وقت کے لئے ہوگی۔ باقی اوقات میں انسان کو دوسرے کام بھی کرنے ہونگے۔ ہمارے ہاں خدا کی "پرستش" کی شکل "نماز" قرار دی جائے گی۔ سو یہ بھی واضح ہے کہ نماز بھی شب و روز میں پانچ مرتبہ ہی پڑھی جاتی ہے۔ ہر وقت نماز پڑھنے کا حکم نہیں۔ اس لئے (لِیَعْبُدُوْا) کے معنی پرستش کرنے کے نہیں بلکہ اطاعت و محکومیت اختیار کرنے کے ہیں۔ یعنی آیہ مقدسہ سے مفہوم یہ ہے کہ تخلیق انسانی سے مقصد یہ ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرے۔ اپنی زندگی خدائی نظام کے ماتحت بسر کرے۔ اس لئے کہ یہی نظام اس کی ذات کی بالیدگی، استحکام اور نشوونما و ارتقاء کا موجب ہے۔ اس آیت میں "عبادت" کا وہی مفہوم ہے جو سورہ یسین کی ان آیات میں مذکور ہے جو پہلے بھی درج کی جا چکی ہیں یعنی۔

اَلَمْ اَعْهِدْ اِلَيْكُمْ يٰۤاٰدَمَ اَنْ لَا تَعْبُدَ الشَّيْطٰنَ
اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَاَنْ اَعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ
(۶۰-۶۱-۶۲)

اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے اس بات کا عہد نہیں لے رکھا کہ تم شیطان کی محکومیت اختیار نہ کرنا۔ یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے اور صرف میری ہی عبادت کرنا۔ یہی صراطِ مستقیم ہے۔

اس مقام تک یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ اسلام میں خدا اور بندے کا تعلق پرستش کا نہیں خدا کی حاکمیت کے اقرار اور عملی اعتراف کا ہے۔ خدا کی حاکمیت سے کیا مقصود ہے؟

اور اس حاکمیت کا عملی اعتراف کس طرح ہوتا ہے۔ ان عنوانات پر میرے

خدا کی حاکمیت سے مراد

اکثر مضامین میں شرح و بسط سے بحث کی جا چکی ہے جن کے اعلاہ

کی یہاں ضرورت نہیں۔ مختصر الفاظ میں "خدا کی حکومت" سے مقصود یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانہ

کے تقاضوں کا حل، ان محکم اصولوں کی روشنی میں متعین کریں جو بطور مستقل انداز، قرآن کی دفتین میں مذکور محفوظ ہیں اور اس طرح ارض (معاشی اور اجتماعی نظام) کو سما (مستقل اندازِ کائنات) سے ہم آہنگ کرتے ہوئے ارتقائی منازل طے کرتے جائیں۔

یہاں ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ ”حاکم اور محکوم“ کے تعلق سے ہمارا ذہن آقا اور غلام کے تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ آقا اور غلام کا تعلق یہ ہوتا ہے کہ آقا اپنے مقاصد کے حصول کے لئے حکم دیتے چلا جاتا ہے اور غلام کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ان احکام کی بے چون و چرا تعمیل کرتا چلا جائے۔ چنانچہ ہمارے ہاں عام طور پر یہ کہا بھی جاتا ہے کہ ”خدا ہمارا آقا ہے ہم اس کے غلام ہیں“ جو لوگ احکامِ اسلامی (یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ) کی پابندی کرتے ہیں، ان سے پوچھتے تو وہ کہہ دیں گے کہ یہ خدا کا حکم ہے، اس لئے ہم اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک یہ احکام مقصود بالذات میں کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ”پرستش“ میں ”عبادت“ مقصود بالذات بن جاتی ہے۔ مثلاً جس شخص نے ان شرائط و حدود کے مطابق جو اس کے لئے متعین کی گئی ہیں، نماز ادا کر لی، وہ سمجھ لیتا ہے کہ جو فریضہ مجھ پر عائد ہوتا تھا، وہ ادا ہو گیا۔ اسے اس سے مطلب نہیں کہ اس نماز کا کچھ نتیجہ بھی مرتب ہوا ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک نماز پڑھنا آقا کا حکم تھا جس کی تعمیل غلام کا فرض تھا۔ غلام کو اس سے واسطہ نہیں کہ اس حکم کی تعمیل سے غایت کیا تھی اور اس کا مقصود کیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کہے گا کہ میں نے اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کر دی۔ مالک مجھ سے خوش ہو جائے گا۔ چنانچہ یہی جواب ہمارے ہاں کے ”عبادت گزار بندوں“ کی طرف سے ملتا ہے۔ جب ذرا زیادہ کرید کر پوچھتے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اس سے ثواب ملتا ہے اور جب پوچھتے کہ ثواب سے کیا حاصل ہوتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اس سے ”نجات“ مل جاتی ہے۔ انہیں کچھ علم نہیں ہوتا کہ ثواب کسے کہتے ہیں اور نجات سے کیا مفہوم

ثواب کے معنی

ہوتا ہے۔ آپ نے بھی ہزار مرتبہ ثواب کا لفظ سنا ہوگا اور خود بھی بولا ہوگا۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ اس سے آپ کی مراد کیا ہوتی ہے؟ اور تو اور اگر آپ سے کوئی کہہ دے کہ صاحب! ثواب کا لفظ عربی زبان کا ہے، اس کی جگہ اپنی زبان کا کوئی لفظ استعمال کر دیجئے تاکہ ہماری سمجھ میں آجائے کہ ثواب سے مفہوم کیا ہے تو آپ اس کی جگہ دوسرا لفظ نہیں استعمال کر سکیں گے۔ ایک لفظ میں نہیں، ایک فقرہ میں بھی آپ اس کا مفہوم نہیں سمجھا سکیں گے۔ اس لئے کہ اس کا کوئی متعین مفہوم خود آپ کے ذہن میں بھی نہیں۔ ثواب کسے کہتے ہیں؟ نجات سے مفہوم کیا ہے؟ ان امور کے متعلق الگ مضامین میں صراحت کی گئی ہے جو آگے چل کر آپ کے سامنے

آئیں گے۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ جب دین کا صحیح تصور سامنے ہو، تو دین کی ان اصطلاحات کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں آ جاتا ہے لیکن جب دین، مذہب میں بدل جائے، تو پھر یہ اصطلاحات بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

بائیں یہاں تک پہنچی تھی کہ خدا اور بندے کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ اگر صرف اسی ایک نکتہ کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ جائے گی کہ اس باب میں اسلام نے جو کچھ پیش کیا ہے، وہ دنیائے فکر و عقیدہ میں کہیں اور نہیں ملتا۔ یعنی اسلام نے خدا اور بندے کے تعلق کا جو تصور دیا ہے وہ دیگر تصورات سے یکسر الگ اور ارفع و اعلیٰ ہے اور اس کی نظیر کہیں نہیں مل سکتی۔ وہ تصور ان دو الفاظ میں سمٹا ہوا ملے گا جو نبی اکرمؐ کی زبان مبارک پر وفات کے وقت آخری الفاظ تھے۔ ”ہوالمرفیق الاعلیٰ“ یعنی خدا اور بندے کا تعلق باہمی رفاقت کا ہے لیکن ایسی رفاقت جس میں خدا کی حیثیت رفیقِ اعلیٰ کی ہے اور انسان کی حیثیت رفیقِ ادنیٰ کی، لیکن تعلق بہر حال رفاقت کا ہے۔ سارا قرآن اسی تعلق کی تفسیر ہے۔ اب غور کیجئے کہ کیا خدا اور انسان کا یہ تعلق آپ کو کہیں اور بھی ملتا ہے؟ دنیائے افکار اور جہان عقائد دونوں میں نگاہ دوڑا کر دیکھئے، یہ تصور آپ کو کہیں اور نہیں ملے گا۔

رفاقت سے مقصود کیا ہے، اس تعلق کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اس سے نتائج کیا مرتب ہوں گے؟ ان تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ تمام نظام کائنات ایک خاص انسان اور خدا کا تعلق رفاقت کا ہے!

نظم و ضبط سے چل رہا ہے۔ اور ایک متعین منزل

کی طرف رواں دواں چلے جا رہا ہے۔ اس میں ہر آن حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ حق اور باطل قرآن کی دو عظیم القدر اصطلاحیں ہیں جن کا صحیح مفہوم تفصیلاً ہی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اجمالاً صرف اتنا سمجھئے کہ حق پر درگرم کے مثبت (POSITIVE) پہلو کا نام ہوتا ہے جس کا نیچہ تعمیر ہوتا ہے اور باطل اس کے منفی (NEGATIVE) پہلو کو کہتے ہیں جس کا مال تخریب ہوتا ہے۔ ہر تعمیر کے لئے ایک تخریب ضروری ہوتی ہے۔ جب تک دائرہ میں منفیاء حیثیت سے تخریب نہیں واقع ہو جاتی، پودا اپنی مثبت حیثیت سے وجود میں نہیں آ سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ کائنات میں منفی اور مثبت پہلوؤں کی یہ کشمکش ہر آن جاری ہے لیکن قانون یہ ہے کہ مثبت پہلو ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ تعمیری پہلو کے اس غلبہ سے کائنات میں ارتقاء (EVOLUTION) کا سلسلہ جاری ہے۔

یہ قانون کیا ہے جس سے کائنات میں تعمیری پہلو اس طرح غالب رہتے ہوئے ہر شے کو نشوونما دینے جارہے ہیں؟ قرآن میں غور کرنے سے یہ حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے کہ کائنات میں جو حادثہ واقع ہوتا ہے اس کے ردِ عمل (RE-ACTION) کے لئے ایک خاص صفتِ خداوندی (ASPECT OF REALITY)

ظہور میں آتی ہے۔ اس طرح مختلف حوادث کے لئے مختلف شئونِ الہیہ کا ظہور ہوتا ہے لیکن ایک خاص حادثہ کے لئے ہر مرتبہ اسی قسم کی صفت کا ظہور ہوتا ہے۔ اس التزام اور استمرار کو سنت اللہ کہتے ہیں۔

سُنَّتُ اللہ | اسی کا نام قانونِ الہیہ ہے جس کا وہ حصہ جو ہمارے حیطہ ادراک میں آجاتا ہے، قانونِ فطرت کہلاتا ہے اور جو حصہ ماورائے فطرت، یعنی عالمِ امر سے متعلق ہے، قانونِ شیت کہلاتا ہے۔

یہ کچھ عالمِ آفاق (نظامِ فطرت) میں ہو رہا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ نوعِ انسانی کو اپنا تمدنی نظام بھی اسی ہیچ واسلوب سے چلانا چاہیئے جس انداز و طریق پر نظامِ فطرت چل رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب انسانی نظامِ تمدن و معیشت میں کوئی حادثہ یا واقعہ رونما ہوتا ہے تو انسانی طبائع اس پر ایک خاص انداز سے (RE-ACT) کرتی ہیں۔ یہ ردِ عمل (RE-ACTION) جو کچھ مبینی ہوتا ہے ذاتی مصالح و منافع پر اس لئے مختلف انسانوں کا ردِ عمل مختلف ہوتا ہے۔ یا انسانوں کے ایک ہی گروہ کا مختلف مواقع پر ردِ عمل مختلف۔ قرآن کی رو سے اس کا نتیجہ فساد فی الارض (تمدنی زندگی میں ناہمواری) ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح نظامِ فطرت میں ایک حادثہ یا واقعہ پر ایک خاص قسم کا ردِ عمل ہوتا ہے اور اس میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا۔ (وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا) اسی طرح تمہارا اجتماعی نظام میں بھی ایک حادثہ یا واقعہ پر ایک ہی قسم کا ردِ عمل ہونا چاہیئے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ردِ عمل کس قسم کا ہونا چاہیئے؟ قرآن کہتا ہے کہ نظامِ فطرت میں ایک حادثہ پر جس قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہوتا ہے انسانی نظامِ تمدن و معیشت میں اسی قسم کا حادثہ پر اسی قسم کی صفت کا ظہور انسانوں کی طرف سے ہونا چاہیئے۔ اگر ایسا ہوا تو سمجھ لو سنت اللہ کے موافق ہوا اور جب یہ ردِ عمل پورے التزام اور استمرار سے ظہور میں آنے لگ گیا تو سمجھ لو کہ تم میں صفاتِ خداوندی منعکس ہو گئیں۔ اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں "خدا کے رنگ" میں رنگے جانا ہے۔ (صِبْغَةَ اللَّهِ وَمِنْ أَحْسَنِ مَنَ اللَّهِ صِبْغَةً) عربی زبان میں عجب کے

ط ردِ عمل کا لفظ محض سمجھانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اسے اس مفہوم میں نہ لیجئے جس میں یہ انسانی جذبات کے متعلق بولا جاتا ہے۔ جذبات کا ردِ عمل اور مفہوم رکھتا ہے۔ خدائی ردِ عمل سے مفہوم یہ ہے کہ کائنات کے حادثے سے صحیح نتائج مرتب کرنے کیلئے خدا کی کون سی قدرت (صفت) ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اقبال نے (BEHAVIOR OF REALITY) لکھا ہے۔

معنی ہیں کسی نئے گھوڑے یا ادنٹ کو سدھا کر سواری کے قابل بنانا۔ اسے انگریزی میں (BREAKING) یا (HARNESSING) کہتے ہیں۔ لہذا عبادت کے معنی ہیں اپنی شخصیت کو قوانین خداوندی کے قالب میں ڈھالنا۔ اسی کو صبغة اللہ کہتے ہیں۔

اب دیکھئے کہ کائنات کے ایک حصہ (نظام طبعی) میں خاص حوادث و وقائع پر خاص شئون الہیہ (صفات خداوندی) ظہور میں آرہی ہیں جس سے حق (تعمیری پہلوؤں) کے غلبہ سے کائنات اپنے مقصود و منہی کی طرف چلے جاتی ہے۔ اگر اس کے دوسرے حصہ (انسانی نظام تمدن و معیشت) میں اس قسم کی صفات کا ظہور (بشریت کی حد کے اندر) انسان کی طرف سے ہو تو اسے خدا اور انسان کی رفاقت کہا جائے گا۔ اس میں خدا رفیق اعلیٰ ہوگا کیونکہ مستقل قانون (سنت اللہ) اسی کا ہے۔ انسان اس کے قانون کا اتباع کرتا ہے یعنی اس کے پیچھے پیچھا ہے۔ آگے آگے خدا (کا قانون) صراط مستقیم پر جا رہا ہے۔ (إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ) (۱۱/۵۶) یقیناً میرا رب صراط مستقیم پر ہے اور اس کے پیچھے پیچھے اھدانا الصراط المستقیم کی آرزوؤں کو عمل میں لانے والا انسان، اسی راہ پر جا رہا ہے۔ اور اس طرح عالم آفاق اور جہان انساہیت دونوں اپنی منزل کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو یہ کس طرح معلوم ہو کہ فلاں قسم کا حادثہ یا واقعہ پر خدا کی کس صفت کا ظہور ہوتا ہے تاکہ اس کی طرف سے بھی اس قسم کا حادثہ یا واقعہ پر اسی قسم کی صفت کا ظہور ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان وحی کا محتاج ہوتا ہے۔ اس چیز کو خدا نے خود بتا دیا۔ قرآن میں اسماے حسنہ مختلف صفات و شئون الہیہ کا ذکر اسی مقصد جلیلہ کے لئے آیا ہے۔ کہیں الفاظ

وحی کی راہ ثانی کے پیرایہ میں اور کہیں نظام فطرت یا اہم سابقہ سے متعلق حوادث و وقائع کے سلسلے میں ”خدا فیصلوں“ کی صورت میں۔ قرآن میں غور و فکر سے یہ حقیقت نمایاں طور پر انسان کے سامنے آجاتی ہے۔ ان چیزوں کو بھی قرآن بلا دلیل و برہان پیش نہیں کرتا۔ وہ بار بار نظام فطرت اور احادیث اہم سابقہ (مارکخی یادداشتوں) پر تدریج و تفکر کی دعوت دیتا ہے اور ان کے نتائج کو استہدایہ پیش کرتا ہے۔ مقصود ان سب سے یہی ہے کہ انسان سے اس کی حیات اجتماعی کے دائرہ میں اس قسم کی صفات ظہور پذیر ہوں۔ بعض امور میں وہ ان شئون کی عملی صورت بھی خود ہی متیقن کر دیتا ہے۔ (یہ وہ ”احکام“ ہیں جن کا تعین قرآن نے کر دیا ہے) لیکن اکثر امور میں وہ ان صفات کو اصولی طور پر سامنے لاتا ہے تاکہ ان

کی عملی تشکیل مقتضیاتِ زمانہ کے پیشِ نظر خود متعین کر لی جائے۔ ”حکومتِ الہیہ کے قیام“ سے مقصود یہ ہے کہ انسانی حیاتِ اجتماعیہ (نظامِ تمدن و معیشت) اس انداز کا ہو جائے کہ اس میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ پر ایک ہی قسم کا ردِ عمل ہو اور وہ ردِ عمل انسانوں کی طرف سے اس صفت کا ظہور ہو، جس صفت کا ظہور نظامِ کائنات میں ایسے حادثہ پر خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ ”خدا کی محکومیت“ سے یہی مقصود ہے یعنی وہ نظامِ اجتماعیہ جس میں انسان ”خدا کے رنگ میں“ رنگے ہوئے ہوں، اس ہیئتِ اجتماعیہ میں انسانی نظامِ تمدن اسی قسّم کے نظم و ضبط اور توازن و توافق کے ساتھ چلتا جائے گا جس حسن و عدل کے ساتھ نظامِ کائنات چلا جا رہا ہے۔

لہذا اسلام میں عبادت سے مفہوم ہے محکومیت اور محکومیت سے مفہوم یہ ہے کہ انسان خدا کے پیچھے پیچھے چلتا جائے۔ (اتباع) اور یہ اتباع بطیبِ خاطر، دل کی مرضی سے ہو، نہ کہ کسی جور و استبداد سے۔ اسی کو اطاعت کہتے ہیں۔ اطاعت کے معنی ہیں برضا و رغبت کسی کام کو کرنا۔ اس لئے عبادت، محکومیت، اتباع وغیرہ، مختلف الفاظ سے مفہوم رفاقت ہے جس میں خدا رفیقِ اکبر ہوتا ہے اور انسان رفیقِ اصغر۔ خدا کی اس رفاقت و توافق سے انسانی زندگی کا نظام اپنی ہمواریوں اور استواریوں کے ساتھ چلتا ہے جن کے ساتھ نظم کائنات چل رہا ہے۔ نظامِ کائنات اپنے اختیار و ارادہ سے نہیں چل رہا۔ اسے اسی طرح چلایا جا رہا ہے۔ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔ لہذا وہ اپنے نظام کو اسی منہج پر اپنے اختیار و ارادہ سے چلانے کا۔ انسانی اختیار و ارادہ کو اگر کسی قانون کا پابند نہ کیا جائے تو اسے سرکشی اور طغیان کہتے ہیں اور اس طرح قائم کردہ نظامِ اجتماعیہ کو طاغوتی نظام کی اصطلاح سے پکارا جاتا ہے لیکن اگر اسی اختیار و ارادہ کو سنتِ اللہ (BEHAVIOR OF REALITY) سے ہم آہنگ کر لیں تو اس نظام کو نظامِ فطرت یا حکومتِ الہیہ کہا جائے گا۔ اسلام کے مختلف شعائر و مناسک اور سے ہم آہنگ کر لیں تو اس نظام کو نظامِ فطرت یا حکومتِ الہیہ کہا جائے گا۔ اسلام کے مختلف شعائر و مناسک اور

”عبادت“ کے طور طریقہ، سب اسی حکومتِ الہیہ کے حصول، قیام اور

استخلاف کا مفہوم | بقا کے ذرائع ہیں۔ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا

الصَّالِحَاتِ لَنَسْتَخْلِفَهُمْ فِي الْأَرْضِ، خدا کا یہ وعدہ (اٹل قانون) ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں گے (یعنی اپنی زندگی کو صفاتِ الہیہ کا آئینہ دار بنانے کا ہمتیہ کریں گے) اور پھر ان سے ”اعمالِ صالحہ“ سرزد ہوں گے (یعنی ایسے اعمال جو نظامِ زندگی میں توازن اور درستی پیدا کر دیں) تو اس کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہوگا۔ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ اور یہ ایک نظریہ ہی نہیں بلکہ ایسی ٹھوس حقیقت ہے جس پر تاریخ شاہد ہے کہ اقوام سابقہ میں سے جنہوں نے ایسا کیا ان کے ایمان و عمل کا یہی نتیجہ مرتب ہوا۔ اس استخلاف فی الارض سے ہوگا

یہ کہ تمہارا یہ نظام زندگی جس میں تم نے اپنی حیاتِ ارضی کو مستقل اقدار سے ہم آہنگ کر لیا ہے، ممکن ہو جائے گا (وَلْيُمَكِّنْ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ) اور تمہارا خوفِ اس سے بدل جائے گا۔ (وَلْيُبَدِّلْ لَهُم مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا) کیونکہ اس نظام میں غلبہ ہمیشہ تعمیری پہلوؤں کا ہوگا۔ اس لئے کہ جب نظام کائنات اور نظامِ انسانی میں ایک ہی قانونِ عمل فرما ہوگا تو وہ نہیں سکتا کہ اس کے نتائج مختلف ہوں۔ مختلف نتائج تو مختلف قوانین پر عمل کرنے سے مرتب ہوتے ہیں۔ اسے شرک کہا جاتا ہے۔ (يَعْبُدُونَ إِلَهًا لَّا يَشْرِكُ لَّهُ شَيْئًا) جب تک تم اس پروگرام پر عمل پیرا ہو گے تمہارا نظام، نظامِ فطرت کی طرح ہموار چلتا جائے گا۔ جب تم اس سے مُنہ موڑ لو گے تو پھر زندگی کی ناہمواریاں شروع ہو جائیں گی۔ (وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ) اس نظام کو قائم رکھنے کا ذریعہ قیامِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نام ہے۔ (وَاقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ) اور نظام درحقیقت قائم ہوتا ہے مرکزِ حکومتِ الہیہ کی اطاعت ہے (وَاطِيعُوا أَمْرًا مِّنَ اللَّهِ) اس انداز سے خدا کا قانون تمہاری نشوونما کئے جاتا ہے۔ (لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ) (۵۵-۵۶/۲۴)۔

”قیامِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ“ کا نظام بڑا تشریح طلب ہے۔ درحقیقت یہ بھی نظامِ دین (نہ کہ رسوماتِ مذہب) کی اصطلاحیں ہیں۔ اس وقت کم از کم یہ بات تو ہمارے سامنے آچکی ہے کہ یہ ”ارکانِ دین“ اس نظامِ اجتماعیہ کے حصول و قیام کا ذریعہ ہیں جسے استخلاف فی الارض (حکومتِ الہیہ یا ممکنِ دین) اسے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہذا یہ ”عبادت“ مقصود بالذات نہیں، ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اس لئے یہ ”پرستش“ کے طور پر یقیناً نہیں بلکہ نظامِ انسانیت کے قیام کے ارکان ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ حج کے متعلق فرمایا ہی یہی ہے کہ اس سے قیامِ ماللناس مقصود ہے، یعنی نوعِ انسان میں توازن قائم کرنے کا ذریعہ۔ اسی طرح دیگر ارکان کی کیفیت ہے۔ ان امور کی تشریح کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت ہم صرف اصولی طور پر ”عبادت“ کے قرآنی مفہوم سے بحث کر رہے ہیں۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ ”عبادت“ سے مراد قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہے، محض ”پلوچا پاٹ“ نہیں۔ ”صلوٰۃ میں رکوع و سجود بھی اسی جذبہٴ اطاعت اور سپردگی کے عملی مظاہر ہیں۔ اِنَّا لَكَ لَخَبِيرٌ کے معنی ہیں، ہم صرف تیری اطاعت کرتے ہیں، صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں، تیرے قوانین کے علاوہ اور کسی کے قوانین و احکام کی اطاعت نہیں کرتے۔ کسی کی محکومیت کو جائز نہیں

سمجھتے۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔

یہ بے مختصر الفاظ میں عبادت کا قرآنی مفہوم۔ وہی عبادت جو دین کے مذہب میں تبدیل ہو جانے سے پرستش کی چند رسومات اور پوجا پاٹ کی حرکات و سکنات بن کر رہ گئی۔
 وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خداست
 یہ مذہبِ مُلا و جمادات و نباتات
 کیا اس سے بڑا انقلاب بھی سورج کی آنکھ نے کبیں دیکھا ہے؟

زکوٰۃ

(اکتوبر ۱۹۵۰ء)

ایک اہم اور اصولی بحث

حکومت پاکستان نے ایک زکوٰۃ کمیٹی مقرر کی ہے تاکہ وہ زکوٰۃ کی وصولی اور خرچ کے مسئلہ پر غور و تحقیق کرے۔ اس کمیٹی نے ایک سوالنامہ مرتب کیا ہے جو زکوٰۃ کی جزئیات سے متعلق بہت سے امور پر مشتمل ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کی تعریف کیا ہے۔ کن کن لوگوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ زکوٰۃ کس طرح ادا کرنی چاہیئے؟ زکوٰۃ کی رقم کن مصارف میں خرچ ہونی چاہیئے؟ کیا موجودہ حالات کے پیش نظر نصاب اور زکوٰۃ کی شرح میں تبدیلی ہو سکتی ہے وغیرہ۔۔۔ سیکرٹری زکوٰۃ کمیٹی نے یہ سوالنامہ میرے پاس بھیجا ہے کہ میں امور مستفسرہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ میں نے اس سوالنامے کے جواب میں جو ”یادداشت“ سیکرٹری زکوٰۃ کمیٹی کو بھیجی ہے اسے الگ شائع کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہوگا کیونکہ اس میں ایسے نکات آگئے ہیں جو اس مسئلہ پر ایک خصوصی انداز سے روشنی ڈالتے ہیں۔ سوالنامہ اور اس کا جواب انگریزی میں تھا۔ ذیل میں اس سوال کا آزاد ترجمہ بعض تشریحی اضافوں کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

زکوٰۃ کمیٹی کی تشکیل، اس کے ذمہ عائد کردہ فرائض اور سوالنامہ کی تفصیل سے مترشح ہوتا ہے کہ حکومت کا غالباً یہ خیال ہے کہ اس کے ذمہ مملکت پاکستان کی رعایا کے ”دنیاوی امور“ کا انصرام ہے جس کے لئے وہ مختلف مدت سے اپنی آمدنی کی تحصیل کرتی ہے اور اس آمدنی کو اپنی صوابدید کے مطابق مناسب مقامات پر خرچ کرتی ہے لیکن کچھ ایسے ”مذہبی امور“ ہیں جو حکومت کے دائرہ عمل و نفوذ سے باہر ہیں۔ ان امور کے لئے ”مذہب“ نے ایک خاص

ذریعہ آمدنی متعین کیا ہے جسے زکوٰۃ کہتے ہیں اور اس مد سے حاصل شدہ آمدنی کو مذہبی امور ہی پر صرف کیا جاسکتا ہے۔ اگر حکومت کے ذہن میں کچھ اس قسم کا تصور ہے تو معاف فرمائیے یہ تصور ایک بہت بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے اور قرآن کے منشا کے یکسر خلاف۔ قرآن "دنیاوی امور" و "مذہبی امور" میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا لفظ ہی غیر قرآنی ہے۔ قرآن نے یہ لفظ کہیں استعمال نہیں کیا۔ قرآن نے مسلمانوں کو مذہب نہیں دیا، دین عطا فرمایا ہے اور دین کے معنی آج کی اصطلاح میں نظام معاشرت (SOCIAL ORDER) یا نظام مملکت (SYSTEM OF STATE) ہیں۔ قرآن توحید سکھاتا ہے جس سے مفہوم یہ ہے کہ انسان کی موجودہ

اور آنے والی زندگی سے متعلق قوانین کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ لہذا ان میں تفریق، ثنویت پر مبنی ہے جو قرآن کی رو سے شرک ہے۔ بنابرین، دین اسلامی زندگی کے ہر شعبہ پر عادی ہے اور اس میں "قیصر اور خدا" کے حصول کی تفریق زمانہ قبل از اسلام کے مذہبی تصور کی پیدا کردہ ہے۔ اسلام اس تفریق کو مٹانے کے لئے آیا تھا لیکن جب مسلمانوں میں ملوکیت آگئی تو انھوں نے "قیصر اور خدا" کی مملکتوں کو اسلام میں ثنویت نہیں | پھر سے الگ کر دیا۔ دنیا اور مذہب کی یہی ثنویت (DUALISM)

اُس وقت سے آج تک مسلمانوں میں چلی آرہی ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی جو کچھ عام طور پر مذہب کے نام سے کیا جا رہا ہے یا جو کچھ کرنے کے ارادے ظاہر کئے جا رہے ہیں، وہ بھی اسی تفریقی مسلک کے شاہد ہیں۔ لہذا جب تک اس ثنویت کو ذہنوں سے دور نہیں کیا جائے گا، نہ تو اسلام کے متعلق صحیح تصور قائم ہو سکے گا اور نہ ہی ہماری عملی دنیا میں صحیح اسلامی قوانین رائج ہو سکیں گے۔ زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم بھی اسی صورت میں سمجھ آ سکتا ہے جب دین سے متعلق قرآن کے اس صحیح تصور کو سامنے رکھا جائے۔ لہذا زکوٰۃ کی قرآنی تشریح سے پہلے یہ ضروری ہے کہ دین کا بنیادی تصور سامنے لایا جائے۔

دین کا بنیادی تصور یہ ہے کہ دنیا میں ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس کی رو سے ہر فرد انسانی کے لئے اس کی مقرر صلاحیتوں کے مکمل طور پر نشو و نما پانے کے مواقع یکساں طور پر موجود ہوں۔ اس نظام کو قرآنی مفہوم میں نظام ربوبیت کہا جاتا ہے اور جو وحدت خالق اور وحدت خلق کے محکم اصول پر مبنی ہے۔ چونکہ اس قسم کا نظام ربوبیت قائم نہیں ہو سکتا، جب تک رزق کے مقام سرچشمے اس جماعت کے ہاتھ میں نہ ہوں جو اس قرآنی نظام کے قیام کی ذمہ دار ہے، اس لئے اس جماعت کے لئے تمکین فی الارض ناگزیر ہے۔ یہی وہ منشاء اور غایت ہے جس کے لئے قرآن چاہتا ہے کہ اسلامی حکومت وجود میں آئے، یعنی اسلامی حکومت

کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے دائرہ حفاظت میں بسنے والے تمام انسانوں کی ربوبیت (یعنی ان کی تمام منہر صلاحتوں کے برومند ہونے) کے لئے پورے پورے اسباب و ذرائع مہیا کرے۔ یہ ایک محکم اصول ہے جسے قرآن نے اسلامی حکومت کے لئے بطور اساس متعین کر دیا ہے اور جس میں زمان و مکان کی تبدیلی سے کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس اصول کو عملی طور پر کیسے متشکل کیا جائے گا، اس کا تعلق زمان اور مکان کے بدلنے والے حالات سے ہے، یعنی ہر زمانے کے مسلمان اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس اصولی مقصد کے حصول کے لئے عملی جزئیات خود متعین کریں گے۔ قرآن کا اسلوب ہدایت ہی یہ ہے کہ اس نے (بجز چند مستثنیات کے) اسلامی نظام کے لئے صرف اصول متعین کئے ہیں، ان کی جزئیات متعین نہیں کیں۔ اس لئے، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اس کے اصول محکم اساس پر مبنی ہیں جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی لیکن ان اصولوں کی جزئیات مختلف حالات کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

شریعت کسے کہتے ہیں | ان بدلنے والی جزئیات کو شریعت کہا جاتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ شریعت کسی جامد یا غیر تبدیل مجموعہ قوانین کا نام نہیں بلکہ ہر وہ مجموعہ قوانین (یعنی قرآنی اصولوں کے تابع مدون کردہ جزئیات) جو کسی ایک زمانے کی قرآنی حکومت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآنی اصولوں کی روشنی میں مدون کرے، اس نظام حکومت کی شریعت کہلائے گی۔ ان جزئیات کے مدون کرنے میں ہر زمانے کی اسلامی حکومت ان جزئیات سے مدد لے سکتی ہے جو پہلے دور کی کسی اسلامی حکومت نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مدون کی تھیں، یعنی سابقہ دور کی شریعت، بعد کے دور کی اسلامی حکومت کے لئے بطور نظائر (PRECEDENTS) کام دے گی۔ قرآن کے ابدی اصولوں کی روشنی میں سب سے پہلی حکومت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی اور آپ کے بعد آپ کے خلفائے حقہ نے۔ اس اسلامی حکومت نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآنی اصولوں کی جزئیات خود متعین کیں۔ اگر یہ سلسلہ خلافت اسی طرح قائم رہتا تو ہر دور کے تقاضوں کے مطابق تدوین شریعت کا یہ سلسلہ بھی جاری رہتا لیکن وہ دور جلد ختم ہو گیا اور اس کے بعد مسلمانوں میں ملوکیت آگئی جس میں رفتہ رفتہ امور دنیاوی کو حکومت نے اپنے ذمے لے لیا اور ”مذہبی امور“ کو ”ارباب مذہب“ کے سپرد کر دیا۔ ان حکومتوں نے بھی اپنی ضروریات کے لئے قوانین مرتب کر لئے اور یہ قوانین اس وقت کے لئے شریعت اسلامی قرار پائے۔ لیکن دین کو دنیا سے الگ کر دینے سے نظار اسلامی کی اصل میں خرابی آگئی اور ایسے قوانین بھی مرتب ہوئے شروع

ہو گئے جو قرآن کی واضح تعلیم کے خلاف تھے۔ اب مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ جہاں جہاں ان کی اپنی حکومتیں ہیں، امورِ سلطنت سے متعلق وہ حکومتیں اپنی منشا کے مطابق قوانین مرتب کرتی ہیں لیکن ”امورِ مذہب“ سے متعلق (جسے (PERSONAL LAW) کہا جاتا ہے) مفتیوں سے فتاویٰ لے لئے جاتے ہیں اور جہاں ان کی اپنی حکومت نہیں وہاں بھی فتاویٰ انفرادی طور پر صادر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر آج ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان میں قرآنی منشا کے مطابق شریعت کا نفاذ ہو تو اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہم قرآنی اصولوں کی روشنی میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق اپنے قوانین خود مرتب کریں۔ یہی قوانین شریعتِ اسلامی کہلائیں گے نہ کہ وہ قوانین جو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق کسی سابقہ اسلامی حکومت نے وضع کئے تھے۔

اس پس منظر کی روشنی میں اب زکوٰۃ کے اہم مسئلہ پر غور کیجئے۔ قرآن نے ان ابواب و ذرائع کو جن کی مدد سے اسلامی حکومت نوزِ انسانی کی ربوبیت کا انتظام کرے گی، زکوٰۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:-

الَّذِينَ اِنْ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَ اَتَوْا الزَّكَاةَ (۲۲/۴۱)

زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم

وہ لوگ کہ جنہیں جس وقت ہم زمین میں حکومت عطا کریں گے تو ان کا

فریضہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہوگا۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق دوسری جگہ فرمایا ہے کہ وَالَّذِينَ هُمْ لِلسَّكَاةِ فَاعِلُونَ (۲۳/۴) یعنی ان کی خصوصیت یہ ہوگی وہ زکوٰۃ کے لئے جدوجہد کریں گے (فاعِلون)۔ اگر سورہ حج کی مندرجہ بالا آیت (۲۲/۴۱) کے معنی یہ لئے جائیں کہ جب ان لوگوں کی اپنی حکومت ہو جائے گی تو یہ آمدنی کا اڑھائی فیصدی حصہ خیرات کے کاموں میں صرف کیا کریں گے تو یہ بے معنی سی بات ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ اپنی آمدنی سے ۲/۱۰ فیصدی حصہ خیرات کے کاموں میں صرف کرنے کے لئے اپنی حکومت کی کیا ضرورت ہے؟ یہ خیرات تو ہم ہندوستان میں انگریزوں کی غلامی کے زمانہ میں بلاروک ٹوک کیا کرتے تھے۔ اس آیتِ جلیلہ کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ غیر قرآنی حکومت میں مقصود حکومت کا اپنا فائدہ ہوتا ہے لیکن قرآنی حکومت میں مقصد پیشِ نظر نوزِ انسانی کی نشو و ارتقاء (زکوٰۃ) ہوتا ہے۔

اس آیت میں ”اقامتِ صلوٰۃ“ اور ”ایتائے زکوٰۃ“ اکٹھا آیا ہے اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ قرآنِ کریم میں یہ دونوں چیزیں عام طور پر اکٹھی بیان ہوتی ہیں۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا باہمی تعلق کیا ہے اور اقامتِ صلوٰۃ سے کیا مفہوم ہے،

ص صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے باہمی تعلق کے لئے سورہ ہود کی اس آیت کو دیکھئے جس میں قومِ شعیب لے کہا تھا کہ کیا تمہاری صلوٰۃ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

یہ چیزیں اس وقت میرے موضوع سے خارج ہیں۔ سر درست آپ زکوٰۃ کے متعلق ہی دیکھئے۔ لفظ زکوٰۃ کا مادہ زک و جہ جس کے معنی نشوونما (GROWTH) کے ہیں۔ ”ایتائے زکوٰۃ“ (یعنی زکوٰۃ بہم پہنچانے) کے معنی ہوئے سامان نشوونما بہم پہنچانا۔ بنا بریں ”زکوٰۃ“ سے مراد ہونے وہ تمام اسباب و ذرائع جن کے ذریعہ اسلامی حکومت لزج انسانی کے تزکیہ (DEVELOPMENT) یا ربوبیت (DEVELOPMENT) نظام کرے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ قدرتی حکومت کا کام افراد ملت کو زکوٰۃ (سامان نشوونما) دینا ہوگا، ان سے زکوٰۃ لینا نہیں ہوگا لیکن ایتائے زکوٰۃ (سامان نشوونما دینے) کے لئے حکومت کو آمدنی (REVENUES) کی ضرورت ہوگی اسلئے اسلامی حکومت کی تمام آمدنی ذریعہ زکوٰۃ بن جائے گی اور اس آمدنی سے نظام ربوبیت قائم کیا جائے گا۔ اس اعتبار سے ملت کا ہر فرد ”ایتائے زکوٰۃ“ کے فریضہ کی ادائیگی میں شریک ہو جائے گا۔ (یہ نظام ربوبیت کس طرح سے قائم کیا جائے گا، یہ موضوع تفصیل طلب ہے اور مسئلہ پیش نظر کی حدود سے باہر۔ اس لئے میں سر درست اپنے آپ کو زکوٰۃ تک ہی محدود رکھتا ہوں۔ اگر حکومت نے اس کی ضرورت سمجھی، تو اس نظام کی قرآنی تفصیل بھی پیش کی جاسکیں گی۔ قرآن نے زکوٰۃ کی اہمیت پر اس قدر زور دیا ہے لیکن اس کی تفصیل کو کہیں متعین نہیں کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اس اصولی نظام کی روشنی میں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، ان تفصیل کے متعین کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی، اس لئے کہ زکوٰۃ کا اصول غیر متبدل ہے لیکن اس کی جزئیات ہر زمانے کی ضروریات کے مطابق بدلتی رہیں گی۔ لہذا آج جو اسلامی حکومت نظام ربوبیت کو قائم کرنا چاہے، وہ اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی مدت آمدنی کی جزئیات خود متعین کرے گی اور اس طرح حاصل کردہ آمدنی کو ملت کی نشوونما (زکوٰۃ) پر صرف کرے گی۔ یہ جزئیات حکومت کی طرف سے عائد کردہ ہر ٹیکس کی شرح نصاب، طریق وصولی، نیز اس آمدنی کے مناسب محلات اخراجات وغیرہ سب کو محیط ہوں گی۔ ہم ان جزئیات کی تدوین میں ان جزئیات سے بطور نظائر مدد لیں گے جو اس سے پہلے کسی اسلامی حکومت نے اپنے دور کے لئے متعین کی تھیں۔ اسی طرح ہماری متعین کردہ جزئیات ہماری شریعت بن جائیں گی بشرطیکہ ان کی اساس قرآن کے غیر متبدل اصولوں پر ہو لیکن اگر یہی آمدنی قرآنی منشاء کے خلاف وصول کی جائے یا اسے نظام ربوبیت کے خلاف مقاصد میں صرف کیا جائے تو یہ سب کچھ غیر شرعی ہو جائے گا۔

(بقیہ صفحہ ۴۷ سے آگے) ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے اموال کو اپنی مرضی کے مطابق صرف کر سکیں (۱۱/۴۷) دیکھئے نظام سلوۃ کس طرح معاشی نظام کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔

صدقات | قرآن نے زکوٰۃ کے علاوہ ایک اصطلاح صدقات کی بھی استعمال ہے اور اس کے لئے اس نے خرچ کی مدت کا بھی ذکر کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

إِنَّمَا الصَّدَقَتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمَوْلَىٰ تَقَاتُ
قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ (۹/۶۰)

صدقات کا مصرف یہ ہے کہ وہ فقراء و مساکین کو دینے جائیں اور ان لوگوں کو جو تحصیل صدقات میں کام کریں اور جن کے قلوب کی تالیف مقصود ہو۔ نیز قیدیوں (یا غلاموں) کے رہا کرانے میں اور تاوان زدہ (یا مقررہ) لوگوں کا تاوان (یا قرض) ادا کرنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لئے

میں اس وقت مختلف مدت کی تشریح میں نہیں جانا چاہتا لیکن یہ حقیقت باذنی تعمق سمجھ میں آجائے گی کہ جن جن ضروریات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، وہ ایسی ہیں جو ہنگامی حوادث یا اتفاقی حالات کے ماتحت پیدا ہوتی ہیں اور اسلامی سوسائٹی (جس کا فریضہ ہی ربوبیت عامہ ہے) کی مستقل ضروریات قرار نہیں پاسکتیں۔ مثلاً جیسے اس وقت پاکستان میں پناہ گزینوں کا مسئلہ درپیش ہے یا کسی علاقے میں سیلاب زدگان کی امداد کا سوال سامنے آجاتا ہے وغیرہ، ایسی ہنگامی اور غیر متوقع (UNFORESEEN) ضروریات کے لئے حکومت کے مستقل بجٹ میں گنجائش (PROVISION) نہیں ہوتا

کرتی، اس قسم کی ہنگامی ضروریات ہنگامی ٹیکس کے ذریعہ پوری کی جابجا کرتی ہیں یا لوگوں کے عطیات سے۔ ہمارے ہاں صدقہ کسی بڑی مصیبت کے ٹالنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ عربوں میں عطیات کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا تھا۔

قرآن میں خور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقات میں عطیات بھی شامل ہیں، اس لئے کہ اس نے صدقات کو علانیہ طور پر دینے کا بھی ذکر کیا ہے اور چپکے سے بھی (۲/۲۴۱) نیز یہ بھی کہا ہے کہ اپنے صدقوں کو احسان جتا کر اور جن کی مدد کی گئی ہے ان کی دل آزاری کر کے تعمیر کی جگہ تخریب (باطل) کا ذریعہ نہ بناؤ (۲/۲۶۲) یہ صدقات خواہ ٹیکس کی شکل میں ہوں خواہ عطیات کی صورت میں ان کا وصول کرنا اور خرچ کرنا اجتماعی کام ہے جس کا ذمہ دار حکومت کو قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ صدقات کے وصول کرنے کا واضح حکم قرآن میں موجود ہے۔ (۹/۱۰۳) اور حکومت ہی کو اس کے صرف کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے (۹/۶۰-۵۸) اس قسم کے ہنگامی ٹیکس کی شرح کیا ہونی چاہیئے؟ یا عطیات کی حدود کیا ہونی چاہئیں؟ قرآن اس کا ذکر نہیں کرتا اور نہ ہی اس کی کوئی حد بندی کی جاسکتی ہے۔ مصارف کی فہرست میں البتہ قرآن نے چند مدت کو گنا دیا ہے جن کا ذکر ادبر آچکا ہے اور باقیوں کے متعلق

فی سبیل اللہ کا مفہوم | فی سبیل اللہ سے اصولی اشارہ کر دیا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن بہت

کے اجتماعی امور کے متعلق ”فی سبیل اللہ“ کی جامع اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ لہذا مصارفِ صدقات میں مختلف مدارج کے ساتھ ”فی سبیل اللہ“ کے اضافہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جن مدارج کا ذکر کیا گیا ہے ان جیسی اور مدارج جو ملت کی قسم کی ہنگامی ضروریات کے لئے ناگزیر ہو جائیں ان میں شامل ہیں۔ اس مقام پر قرآنی تعلیم سے متعلق ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس نکتہ کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ اسے شرح و بسط سے بیان کیا جاتا لیکن یہ مقام صراحت و وضاحت کا نہیں، اس لئے یہاں اس کا ذکر صرف اشارۃً کیا جاسکے گا۔ قرآنی احکام کا اسلوب یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے ارتقائی مدارج کے ساتھ توافقی و تطابقی رکھتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً جب رسول اللہ نے دعوتِ اسلام کی ابتدا کی ہے تو اس وقت اسلامی حکومت وجود میں نہیں آئی تھی۔ اس لئے اس زمانے کے احکام اس انداز کے ساتھ تھے جو کسی ایسی سوسائٹی (معاشرہ) میں نافذ العمل ہو سکیں جس میں ہنوز اپنی حکومت قائم نہ ہو سکی ہو۔ حضور کی دعوت اپنے ارتقائی مدارج طے کرتی اس مقام تک پہنچ گئی۔ جہاں ملتِ اسلامیہ نے اپنا نظامِ حکومت خود قائم کر لیا۔ یہ نظام ایک سوسائٹی کے معاشرتی ارتقاء کی آخری کڑی ہوتی ہے۔ لہذا اس مقام پر ضروری احکام دینے کے بعد دین کی تکمیل ہو گئی۔ قرآن ان تمام احکام کا مجموعہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں (مثلاً) صدقات کے متعلق انفرادی

تدریجی ارتقاء احکام بھی ملتے ہیں اور حکومتی نظام کے اندر کے احکام بھی، حتیٰ کہ ایسے احکام بھی جن میں حکومت کو کسی قسم کے ٹیکسوں یا عطیوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ جن لوگوں کی نگاہ سے قرآنی احکام کا یہ اسلوب ادھمل ہو گیا، وہ مختلف احکام کے ”تضاد“ سے گھبرا اٹھے اور اس مشکل کے حل کے لئے ”سنخ آیات کا عقیدہ“ قائم کر لیا، یعنی انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ جو احکام بعد کے ارتقائی مدارج سے متعلق نازل ہوئے تھے، انھوں نے ابتدائی مراحل سے متعلق نازل شدہ احکام کو منسوخ کر دیا ہے۔ اگر ان کے سامنے قرآنی احکام کا وہ اسلوب ہوتا جو اوپر بیان کیا گیا ہے تو انہیں کوئی ایسی مشکل پیش نہ آتی جس کے لئے نسخ و منسوخ کا غیر قرآنی عقیدہ وضع کرنا پڑا۔ قرآن کی اکیلت اسی میں ہے کہ وہ انسانی معاشرہ کی ہر ارتقائی حالت سے متعلق مناسب احکام اپنے اندر رکھتا ہے جو معاشرہ (سوسائٹی) جس وقت اپنے آپ کو قرآنی نظام کے تابع لانا چاہے قرآن میں اس وقت کے ارتقائی مقام کے مناسب احکام مل جائیں گے۔ مثلاً ہم تقسیم ہند سے پہلے اپنے معاشرتی ارتقاء میں جس مقام پر تھے قرآن ہمیں اس سے آگے بڑھنے کے اصول دیتا تھا۔ تقسیم کے بعد ہم جس حالت میں ہیں اس کے لئے بھی اس کے پاس ہدایت موجود ہے اور اس کے بعد اگر ہم نے اپنی زندگی کو قرآنی نظام کے تابع لانے کا فیصلہ کر لیا تو اس کے لئے بھی قرآن میں ضروری اصول اور احکام مل جائیں گے۔ اس لحاظ سے قرآن ایک مکمل ضابطہٴ حیات ہے اور جس مقام سے کوئی سوسائٹی اپنے آپ کو قرآن کے تابع لائے

قرآن اسے اس مقام سے آگے جانے کے لئے واضح روشنی عطا کر دیتا ہے اور کوئی مقام ایسا نہیں آتا جہاں پہنچ کر وہ کہہ دے کہ میں مزید ہدایت دینے سے قاصر ہوں۔

زکوٰۃ و صدقات سے متعلق تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قرآن کی رو سے:-

۱۔ زکوٰۃ ان بنیادی مقاصد میں سے ہے جن کے لئے اسلامی حکومت کا قیام وجود میں آتا ہے۔

ما حاصل

۲۔ ایٹائے زکوٰۃ سے مقصود ہے ایسا نظام قائم کرنا جس میں ہر فرد کی مضمحل صلاحیتوں کی نشو و ارتقا کا پورا پورا سامان موجود ہو۔

۳۔ قرآنی حکومت کے تمام ذرائع آمدنی زکوٰۃ ہی کی مدد سے ہوں گی۔

۴۔ قرآن نے ان مدد کی تفصیل متعین نہیں کی۔ ہر حکومت اپنی ضروریات کے مطابق انہیں خود متعین کرے گی۔

۵۔ بعض ہنگامی اور غیر متوقع ضروریات کے لئے جو کچھ وقتی طور پر وصول کیا جائے گا اسے قرآن کی اصطلاح میں صدقات کہا جائے گا۔

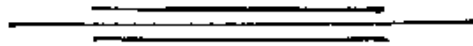
۶۔ صدقات ہنگامی ٹیکس یا عطیات پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔

۷۔ صدقات کی شرح کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں البتہ ان کی مدد خرچ کی ایک فہرست قرآن نے دی ہے جس میں فی سبیل اللہ کی تشریح کے مطابق اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

۸۔ صدقات کی تحصیل اور صرف کا انتظام بھی حکومت ہی کے ذمہ ہوگا اور اس کے لئے جو عملہ متعین کیا جائے گا اس کے اخراجات اس مد سے لئے جائیں گے۔

یہ ہے میرے فہم قرآن کے مطابق مختصر الفاظ میں زکوٰۃ اور صدقات سے متعلق قرآن کی تعلیم کا حاصل ہمارے مروجہ الجھاؤ کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے زکوٰۃ و صدقات کو ایک ہی چیز سمجھ رکھا ہے اور صدقات سے متعلق احکام و تفصیل کو زکوٰۃ کے احکام قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے نہایت وضاحت سے ان دو الفاظ کو الگ الگ استعمال کیا ہے۔ اگر صدقات سے مراد زکوٰۃ ہی ہوتی، تو وہ صدقات کی جگہ زکوٰۃ ہی کا لفظ استعمال کرتا لیکن قرآن میں غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے نزدیک زکوٰۃ کا تصور صدقات سے الگ ہے۔ اسلامی معاشرہ کے ابتدائی مدارج میں ”صدقات“ کا عمومی مفہوم ”خیرات“ ہی تھا

لیکن بعد میں جب نظام حکومت قائم ہو گیا تو صدقات سے مراد وہ عطیات وغیرہ ہو گئے جو اسلامی حکومت بعض ہنگامی ضروریات کے لئے طلب کرتی ہے لیکن یہ ہنگامی عطیات ہوں یا دیگر مدت آمدنی، ان سب کا سرچشمہ ان کے ایمان کا یہ تقاضا ہے کہ ہم نے وہ نظام ربوبیت قائم کرنا ہے جس میں ہر فرد کی منہر صلاحیتوں کے نشو و ارتقاء کے لئے یکساں مواقع ہم پہنچائے جائیں۔ جب یہ نظام قائم ہو جائے تو پھر عطیات کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ اس وقت زائد از ضرورت سب کچھ ملک کی تحویل میں ہوتا ہے جس سے وہ ایسے زکوٰۃ (فزع انسان کو نشو و نما دینے) کا فریضہ ادا کرتی ہے۔



لارڈ سربٹرنڈرسل سے ملاقات

دسمبر ۱۹۵۰ء

برطانیہ کے مشہور مفکر لارڈ سربٹرنڈرسل، پچھلے دنوں آسٹریلیا گئے ہوئے تھے۔ پہلے اطلاع ملی کہ وہ واپسی پر کراچی ٹھہریں گے لیکن بعد میں معلوم ہوا وہ کراچی کے راستے سیدھے وطن واپس چلے جائیں گے۔ ۲۵ اگست قریب ۹ بجے شب ان کا جہاز کراچی پہنچا اور وہ علی الصبح آگے روانہ ہو گئے۔ انہیں دیکھنے (اور اگر موقع ملے تو ان سے کچھ باتیں کرنے) کے شوق میں، میں بھی کراچی کے ہوائی مستقر پہنچ گیا۔ مستقر پر مجھے یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ وہاں ہمارے اکابرین ملت میں سے کوئی موجود نہ تھا۔ (حکومت کی طرف سے صرف دو جوئیر افسر تھے جو رسمی استقبال کے فرائض کی سرانجام دہی کے لئے وہاں گئے تھے) اور اس سے کہیں زیادہ افسوس اس سے کہ کراچی کے علمی طبقہ میں سے بھی وہاں کوئی نہیں پہنچا تھا۔ لارڈ سربٹرنڈرسل کا شمار عصر حاضر کے ممتاز ترین مفکرین میں ہوتا ہے۔ ان کے نتائج فکر سے اتفاق یا اختلاف ایک جداگانہ چیز ہے لیکن ارباب فکر و نظر کی قدر افزائی خود اپنے حسن ذوق اور غلش تجسس کا مظاہرہ ہوتا ہے اور سوچنے والے ذہن انہی باتوں سے اندازہ لگالیتے ہیں کہ کسی قوم کی ذہنی سطح کی بلندی کیا ہے۔ اے کاش! ہمیں احساس ہوتا کہ قوموں کی تعمیر میں علم اور فکر کا کتنا بڑا حصہ ہے۔

ہوائی جہاز کا اتنا لمبا سفر نومند جوانوں کے بھی سر میں چکڑا اور پاؤں میں لڑکھڑاہٹ پیدا کر دیتا ہے لیکن یہ ۷۸ سال کا بوڑھا مفکر، جب جہاز سے اترتا ہے تو یوں دکھائی دیتا جتنا جیسے وہ اپنے ڈرائنگ روم سے مکان کے صحن میں آگیا ہو۔ شگفتہ، بشاش، اور یکسر حاضر دماغ، وہ کڑی کمان کے تیز جیسی چال کے ساتھ مستقر کی عمارت میں اپنی قیامگاہ کی طرف آگیا۔ کمرے میں چند نوجوان (بلکہ بعض جوانی سے بھی کم عمر کے) انجاری رپورٹروں نے ان سے سیاستِ حاضرہ

کے متعلق عام اخباری سوالات پوچھنے شروع کر دیے۔ جس میں کافی وقت صرف ہو گیا۔ ریڈیو پاکستان کی موقع سنائی البتہ قابلِ داد تھی کہ انہوں نے اس مختصر سے وقت میں چند سوالات اور ان کے جوابات ریکارڈ کر لئے جسے بعد میں کراچی سٹیشن سے نشر کیا گیا۔

چونکہ ایک تو وقت بہت مختصر تھا اور دوسرے اس تقریب میں کوئی نظم و ترتیب نہ تھی، اس لئے میرے ذوق کی کماحقہ تسکین نہ ہو سکی۔ بایں ہمہ میں نے اٹھتے، بیٹھتے، چلتے، پکٹتے کچھ سوالات پوچھ ہی لئے جن میں سے بعض ریڈیو پاکستان کے متذکرہ صدر ریکارڈ میں آ گئے ہیں۔ چونکہ اس قابلِ یاد ہنگامی ملاقات سے تنہا لطف اندوز ہونا بخلِ معلوم ہوتا ہے، اس لئے میں ذیل میں اپنے بکھرے ہوئے سوالات اور ان کے جوابات کو ایک ترتیب دے کر پیش کرتا ہوں تاکہ قارئینِ طلوعِ اسلام بھی ان کی افادیت میں شریک ہو سکیں۔

سوال: کیا انسان کے لئے ممکن ہے کہ وہ تنہا عقل کی مدد سے خیر اور شر (GOOD AND EVIL) کے مسئلہ کو حل کر سکے۔

جواب: خیر اور شر کے مسئلہ کا تعلق عقل (INTELECT) سے نہیں جذبات (FEELINGS) سے ہے۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ عقل اس کا حل پیش کر سکے گی یا نہیں۔

سوال: لیکن جذبات تو ہر شخص کے انفرادی (INDIVIDUAL) ہوتے ہیں اس لئے خیر و شر کا تصور بھی انفرادی ہو جائے گا۔ کیا آپ کے نزدیک خیر محض ABSOLUTE GOOD کوئی شے نہیں۔

جواب: خیر محض کوئی شے نہیں۔

سوال: اس سے یہ مترشح ہوا کہ اخلاقی شعور (MORAL CONSCIOUSNESS) بھی کوئی مطلق

چیز نہیں اور اخلاقیات ETHICS سب اضافی RELATIVE ہیں۔

جواب: اخلاقی شعور کوئی چیز نہیں۔ جو کچھ ہم بچپن کو اس کی چھ برس کی عمر میں سکھا دیتے ہیں وہی اس کا اخلاق (MORALITY) ہوتا ہے۔ اخلاق سوسائٹی کی پیداوار ہیں اور ان کا معیار انسانی عقل۔

سوال: تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ آپ کے نزدیک انسانی عقل کے علاوہ علم (KNOWLEDGE) کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔

جواب: میں کسی اور ذریعہ علم سے واقف نہیں۔

سوال: کیا آپ کے نزدیک انسانی زندگی اور شعور (LIFE AND CONSCIOUSNESS) کی بنیاد (BASIS)

یہی دنیائے محسوسات (THE WORLD OF CONCRETE) ہے یا اس سے ماوری؟

جواب :- میں نہیں سمجھا کہ (CONCRETE) سے آپ کا کیا مفہوم ہے۔ اب تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا میں کوئی

شے (CONCRETE) ہے ہی نہیں۔ صرف مدرکات (IDEAS) کا وجود ہے۔

سوال :- دنیائے محسوسات سے میری مراد مادے کی وہ دنیا ہے جس کا علم حواس PERCEPTIONS کے ذریعہ ہوتا ہے۔

جواب :- تو پھر انسانی زندگی کی بنیاد اس سے ماوری کچھ نہیں۔

سوال :- ہمارے مفکر علامہ اقبالؒ کے نزدیک انسانی انا (HUMAN EGO) صاحب اختیار بھی ہے اور فنا نہ آشنا بھی (FREE AND IMMORTAL) کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

جواب :- میں انسانی ایگو کو صاحب اختیار تو مانتا ہوں لیکن (IMMORTAL) نہیں مانتا۔

سوال :- کیا آپ کے ملاحظہ سے علامہ اقبالؒ کے ”خطبات“ (یا ان کی اسرارِ خودی جس کا ترجمہ نکلسن نے کیا ہے) گزرے ہیں؟

جواب :- نہیں میں نے انہیں نہیں دیکھا۔

سوال :- تو پھر آپ غالباً اقبالؒ کے فلسفہ سے بھی آشنا نہیں ہوں گے۔

جواب :- میں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا۔

سوال :- میں درخواست کروں گا کہ آپ ان کے فلسفہ کا مطالعہ فرمائیے کیونکہ اقبالؒ نے اپنی فکر کا سرچشمہ قرآن کو قرار دیا ہے اور دنیا کی آبادی کا قریب پانچواں حصہ اس کتاب پر اپنی زندگی کی بنیادیں رکھنے کا مدعی ہے۔

آخری دو تین باتیں کچھ افراتفری میں ہوئیں لیکن میں نے لارڈ سرل کو ایک رپورٹر کے سوال کے جواب میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ ٹیگور سے واقف ہیں اور گیتا بخلی ان کی نظر سے گزری ہے۔ ایک اور رپورٹر کے اس

سوال کے جواب میں کہ دنیا میں امن کس طرح قائم ہو سکتا ہے، انھوں نے کہا کہ ساری دنیا میں ایک حکومت کے قیام سے۔ میں نے اس پر پوچھا کہ اس ایک حکومت کی بنیاد (BASIS) کیا ہوگی۔ کہا کہ ورلڈ فیڈریشن

اقوام عالم کے باہمی اتفاق اس کے انداز کی حکومت۔ میں نے کہا کہ اس قسم کی حکومت میں قوموں کا الگ الگ وجود باقی رہے گا اور انسانوں کی یہی غیر فطری تقسیم، اقوام کے باہمی تصادم (CONFLICT) کا باعث ہے

اس لئے جب یہ علت تصادم موجود رہے گی تو امن کی توقع بعید سی بات نظر آتی ہے لیکن اگر اسے فرض بھی کر

لیا جائے کہ اس طرح اس قائم ہو جائے گا تو قیام امن تو محض ایک سلبی خصوصیت (NEGATIVE VIRTUE)

ہے۔ ایجابی خوبی (POSITIVE ACHIEVEMENT) - انسانیت کی نشو و ارتقاء

(DEVELOPMENT OF HUMANITY) ہے۔ یہ کس طرح سے ہو سکے گا۔

انہوں نے کہا کہ انسانوں کی ترقی مختلف اقوام اپنے اپنے ہاں خود کریں گی۔

(افسوس کہ اس کے بعد سلسلہ کلام ختم ہو گیا اور بات آگے نہ بڑھ سکی۔)

اگر وقت زیادہ ہوتا یا اتنے وقت میں فضا میں سکون اور محفل میں کوئی ترتیب ہوتی تو جفنی گفتگو لارڈ رسل سے ہو چکی

تھی اس سے آگے وہ ایک اہم نتیجہ تک پہنچ سکتی تھی۔ لارڈ رسل کیونززم کے مخالف ہیں اور انھوں نے اس مجلس میں

بھی اس بات کو دہرایا تھا کہ انہوں نے ۱۹۲۰ء میں یہ کہہ دیا تھا کہ کیونززم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ جس

تحریک کی بنیادیں مارکسزم جیسے غلط فلسفہ پر ہوں، اس کی تو تعمیر میں تخریب مضمر ہوتی ہے۔ لارڈ موصوف سے پوچھنے

کی بات یہ تھی کہ مارکسزم کا وہ فلسفہ کیا ہے جو ان کے نزدیک تعمیر کی بجائے تخریب کا موجب ہے۔ ظاہر ہے کہ مارکسزم

مادی تصور حیات (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کا نام ہے اور اس کے

بنیادی عناصر وہی ہیں جو مذکورہ صدر سوالات کے جوابات میں لارڈ رسل نے اپنے فکری عقائد کے طور پر بیان کئے، یعنی

زندگی اور شعور خالص مادہ کی پیداوار ہیں۔ حواس (SENSES) کے علاوہ انسان کے پاس کوئی ذریعہ علم نہیں۔ اخلاقی شعور

اپنی مستقل حیثیت نہیں رکھتا اور اخلاق کے معیار سوسائٹی کے رجحانات کے سوا کچھ نہیں۔ دنیا میں خیر محض کا کوئی وجود

نہیں۔ یہ سب چیزیں اضافی ہیں اور ان کا تعلق ہر فرد کے اپنے جذبات سے ہے۔ انسانی انگوٹھی مستقل حیثیت

نہیں رکھتا اور طبعی موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ دقتیں علیٰ ہذا۔

پوچھنے کی بات یہ تھی کہ جب ان بنیادوں پر اٹھی ہوئی عمارت روس میں تباہی اور بربادی کا باعث بن چکی ہے

تو مغربی تہذیب جو یکسر انہی بنیادوں پر قائم ہے، کس طرح انسانیت کے لئے موجب فوز و فلاح اور باعث نجات و

سعادت ہو سکتی ہے۔ اگر لارڈ رسل نے مارکسی فلسفہ کے متعلق آج سے تیس سال قبل یہ رائے قائم کی تھی تو خود اپنے فلسفہ

کے متعلق انھوں نے یہ رائے کیوں نہ قائم کی؟ حقیقت یہ ہے کہ کوئی مفکر ہوا یا مدبر، جب تک اس کے سامنے زندگی کی

مستقل اقدار نہ ہوں اس کی فکر اور تدبیر ذاتی رجحانات اور قومی مصالح سے غیر متاثر نہیں رہ سکتے۔ برٹنڈرسل کتنا بڑا مفکر

ہے اور منطق (LOGIC) اس کے طریق تحقیق کی اہم خصوصیت، لیکن اس کی منطق اتنی سی بات بھی اس پر واضح نہیں کر سکی

کہ جس صغریٰ اور کبریٰ کا نتیجہ روس میں ناکامی کی شکل اختیار کرتا ہے، وہی صغریٰ اور کبریٰ برطانیہ میں فوز و فلاح کا موجب

کیسے بن سکتا ہے؟ اس سے آگے بڑھنے تو لارڈ رسل دنیا میں قیام اس کے لئے واحد حکومت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن انگریز کا جذبہ وطنیت انہیں غیر شعوری طور پر اس امر پر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ قوموں کے وجود کو باقی رکھیں اور فیڈریشن کے ذریعہ واحد حکومت قائم کرنے کا تصور پیش کریں۔ اگر ان کے تحت اشعار میں جذبہ وطنیت اس طرح سایہ فلک نہ ہوتا

تو ان کی فکر انہیں یقیناً اس نتیجہ پر پہنچا دیتی کہ واحد حکومت کا قیام وحدت انسانی (UNITY OF MANKIND)

کے سوانا ممکن ہے اور وحدت انسانی وحدت حیات کا دوسرا نام ہے اور وحدت حیات کی بنیاد آفرینندہ حیات کی توحید متفرج ہے۔ لیکن یہ تصور قرآن سے باہر اور کہیں نہیں مل سکتا اور لارڈ رسل تک قرآن کو پہنچائے کون؟ مغربی فکر آج روشنی کی تلاش میں بری طرح سے سرگشتہ و حیراں پھر رہی ہے لیکن عالم اسلام میں ایک شخصیت بھی ایسی نہیں جو ان کی سطح پر پہنچ کر انہیں قرآن سے متعارف کرائے۔ اقبالؒ یہ کر سکتا تھا لیکن وہ بہت پہلے دنیا چھوڑ گیا۔ اب اس کا پیغام بھی کام کر سکتا ہے لیکن وہ خود مسلمانوں کے لئے بھی کتاب مختوم بن چکا ہے۔ وہی تھا جو ایمان و یقان کی پوری قوتوں کے ساتھ یہ کہہ سکتا تھا کہ

از من اے بادِ مبالغوئے بہ دہا کج رنگ

عقلِ بالِ کشو است گرفتارِ مرست

برقِ راہیں بہ جگر می زنداںِ رام کند

عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگرِ دازر است

عقلِ خویش دگر و عقلِ جل میں دگر است

بالِ بیل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

دگر است آنسوئے پردہ کشادنِ نظر

ایں سوئے پردہ گمانِ مطن و تخمین دگر است

اے خوش آں عقل کہ پہنا دو عالم باو است

نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم باو است

پیش او سجدہ گزاریم و مراد سے طلیم

اور یہ کہ

اور پھر علاج یہ کہ

نجات

اکتوبر ۱۹۵۱ء

دنیاۓ مذاہب میں انسانی زندگی کی تمام تنگ و تاز کا منتہی کیا ہے؟ انسان اپنے آپ پر اس قدر جانگل پابندیاں کیوں عائد کرتا ہے؟ یہ اس قدر کرشن مشقتیں کیوں اٹھاتا ہے؟ یہ بھوک اور پیاس کی جگر سوز سختیاں، یہ مال اور جان کی ہوش ربا قربانیاں، یہ سفر اور حضر کے جانگداز مراحل، یہ گریہ نیم شبی اور آؤ سحری کے صبر آزما منازل، یہ تمام جدوجہد، یہ ساری سعی و کادوش، بالآخر کس غرض و غایت کے لئے ہے؟ آپ کسی مذہب پرست انسان سے پوچھئے ان تمام سوالات کا ایک اور صرف ایک جواب ملے گا، یعنی اس تمام تنگ و تاز کا مقصود، اس کدو کادوش کا منتہی

مقصود سعی و کادوش

یہ ہے کہ کسی طرح نجات حاصل ہو جائے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی، ہر ایک کی مذہبی سعی و کادوش کا مطمح نگاہ ایک لفظ نجات کے اندر منظر ہے۔ اسی کے لئے دعائیں ہیں، اسی کے لئے التجائیں۔ یہی تمام آرزوؤں کا مرکز ہے، یہی سب متناؤں کا محور۔ آؤ سحر گاہی سے تو اسی کے لئے اور نالہ شب گیر سے تو اسی کی خاطر۔ چمکتی ہوئی پیشانیوں کی سجدہ ریزیاں اور لرزتے ہوئے قلوب کی نرم خیزیاں، دمکتی ہوئی آنکھوں کی شبنم فشانیاں اور لڑکھڑاتی ہوئی زبانوں کی تسبیح خوانیاں، سب اسی ایک مقصد کے حصول کے ذرائع اور اسی ایک منزل تک پہنچنے کی راہیں ہیں۔ برہمن کے ناقوس میں، تلا کی اذان میں، گرج کی بانگ جس میں، صومعہ کی پکار میں، ہر جگہ اور ہر مقام پر اسی محفل میلے کی تلاش اور اسی ناقہ سلمیٰ کے سرخ کی پیش و خلش پنہاں ہے۔ نجات حاصل ہو گئی تو سب کچھ مل گیا اور سب کچھ ملنے پر بھی نجات کی طرف سے ناامید رہی تو کچھ بھی نہ ملا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ نجات سے مقصود کیا ہے؟ اس لفظ کو نوہم ہزار بار سنتے ہیں لیکن نجات کا مفہوم بالآخر اس کا مفہوم کیا ہے؟

ہندو دھرم میں بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان اپنے موجود جہنم میں کسی بقیہ جہنم کے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے۔ اس کا نام آداگون (ایتنا سزا) ہے۔ جب تک اس سے گناہ سرزد ہوتے رہیں گے یہ جکڑ قائم رہے گا۔ انسانوں کی نگ و دو کا حاصل یہ ہے کہ کسی طرح اس آداگنی چکر سے خلاصی حاصل کر لے۔ اسی کا نام ان کے نزدیک نجات (مکنتی) ہے۔ یہ رہا ان کا دھرم (یا شریعت) ان کے لوگ (طریقت یا تصوف) میں عقیدہ یہ ہے کہ انسان کی آتما (روح) درحقیقت پرماتما (روح مطلق، خدا) کا ایک حصہ ہے جو اپنے کل سے الگ ہو کر پراکرتی (مادہ) کی کچھڑ میں آ پھنسی ہے۔ آتما کا اپنے آپ کو اس مادی دلدل سے نکال کر پھر سے اپنی اصل کے ساتھ جا ملنا مقصود حیات ہے۔ جب آتما اس طرح اپنے آپ کو مادی زنجیر سے چھڑا لیتی ہے تو اس کا نام مکتی یا نجات ہوتا ہے۔

بدھ مذہب کے نزدیک بھی نجات کا یہی تصور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانی روح اس دنیا کے جیل خانے میں پھنس چکی ہے، جس میں ہر طرف کشش و جاذبیت کے پھنسے پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کی ہر آرزو ایک تکلیف کا پیش خیمہ ہے۔ جوں جوں آرزوئیں بڑھتی جائیں گی، تکالیف میں زیادتی ہوتی جائے گی۔ اس لئے تکلیف کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آرزوؤں کو ترک کر دیا جائے۔ جب آرزوئیں کھیتے فنا ہو جائیں گی تو انسان کی روح تکالیف کے بندھن سے آزاد ہو کر نروان حاصل کر لے گی جہاں کامل سکوت و سکون ہوگا۔ اسی کا نام نجات ہے۔

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے والدین ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہوں کو ساتھ لئے پیدا ہوتا ہے اور ان کی پاداش میں دنیا کی تکالیف بھگتا ہے۔ کوئی انسان اپنے اعمال کی بدولت اس عذاب سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دے دی تاکہ وہ نوح انسانی کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ لہذا انسانوں کے لئے اس "ازلی" مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ انسان حضرت مسیح کے کفارہ پر ایمان لائے۔ یہ عقیدہ انسان کو اس کے پیدائشی گناہ سے نجات دلا کر جنت میں داخل کر دے گا۔ اسی کا نام ان کے ہاں نجات (SALVATION) ہے۔

یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ وہ قوم اپنے مورثین اعلیٰ کے بعض جرائم کی پاداش میں چند دن جہنم میں رہے گی۔ اس کے بعد جہنم کے عذاب سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اس کا نام نجات ہے۔

مجوسیوں (پارسیوں) کے نزدیک انسان اس دنیا میں اہرمن و یزداں (نور و ظلمت، خیر و شر) کی کشمکش میں گرفتار

ہے۔ اسی کشاکش سے رستگاری کا نام نجات ہے۔

نجات، نجات یا (SALVATION) کا قریب قریب یہی تخیل چھوٹے چھوٹے مصیبت سے چھٹکارا مذاہب میں بھی ہے۔ اس تخیل کی جزئیات میں اختلاف ہو تو ہو لیکن ان

سب میں اصولی طور پر ایک ہی قدر مشترک ہے، یعنی عقیدہ نجات کے لئے پہلے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انسان کی مصیبت میں گرفتار ہے۔ اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نام نجات ہے۔ لفظ نجات کا مفہوم ہی چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ اسی تصور کا نتیجہ ہے کہ انسان کے جسم کو اس کی روح کا قفس اور دنیا کو انسان کے لئے جیل خانہ قرار دیا جاتا ہے۔

ہر شخص اس جیل خانے میں چکی پیس رہا ہے اور اپنی اپنی میعاد قید کے مطابق چکی پیس کر چھٹکارا حاصل کر سکے گا۔ قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

یہ تو ہر عام مذاہب عالم کا حال لیکن خود مسلمانوں کی کیا حالت ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ ان کے ہاں

(i) نہ تو آد اگون (مناسخ) کا عقیدہ ہے۔

(ii) نہ ہر پچھتے کے پیدائشی گنہگار ہونے کا عقیدہ۔

(iii) نہ موشین اعلیٰ کے جرائم کی پاداش کا تصور اور

(iv) نہ ہی اہرن ویزداں کی کشاکش کا عقیدہ

لیکن اس کے باوجود زندگی کا مقصود ان کے ہاں بھی نجات ہی ہے۔ جسے دیکھتے نجات کے غم میں گھلا جا رہا ہے نہ ہی اوامر کی پابندی اور نواہی سے احتراز، یہ تمام تقشف و تورع! یہ سب تقویٰ و پرہیزگاری، یہ تمام گریہ زاری، سب عبادات و مناسک، نجات حاصل کرنے کے لئے ہیں۔

لیکن نجات کس سے؟ عذاب جہنم سے!

ہمارے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال بد کی سزا بھگتنے کے لئے جہنم میں ڈالا جائے گا اور اس کی سزا کی معیاد پوری کرنے کے بعد جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ عذاب جہنم سے اس چھٹکارے کا نام نجات ہے۔ اس نظریہ کی حقیقت ثابت کرنے کے لئے بڑی بڑی فلسفیانہ توجہات پیش کی جاتی ہیں۔ کہیں یہ کہا جاتا ہے کہ جہنم درحقیقت ایک سیٹی ٹوریم ہے، جس میں مریضوں کو بھیجا جائے گا تاکہ وہ صحت حاصل کر لیں۔ جب وہ تندرست و توانا ہو جائیں گے تو انہیں جنت کی طرف منتقل کر دیا جائے گا۔ کہیں اسے دھونی کی بھٹی سے تشبیہ دی جاتی ہے، جس پر داغدار کپڑوں کو چڑھایا جاتا ہے تاکہ ان کی میل کھیل دور ہو جائے۔ جب وہ صاف ہو جاتے ہیں، تو انہیں جنت میں بھیج دیا جاتا

ہے۔ ان تشبیہات کے بعد سمجھ لیا جاتا ہے کہ ہم نے ایسے مسلم الثبوت حقائق پیش کر دیئے ہیں جن کے پیش نظر دنیا کا ہر انسان قرآنی تعلیم کے ارفع و اعلیٰ ہونے پر فوراً ایمان لے آئے گا لیکن وہ نہیں سمجھتے کہ یہ سارا تصور دوسرے مذاہب سے مستعار لیا گیا ہے۔ قرآن سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔

پہلی حالت پر آ جانا | پہلے یہ دیکھئے کہ اس تصور کی رو سے آخرالامر ثابت کیا ہوتا ہے؟ آپ صبح دس بجے تندرست و توانا ہیں۔ اس کے بعد آپ کا درجہ حرارت اعتدال سے بڑھ جاتا ہے۔ اسے بیماری (بخار) کی حالت کہتے ہیں۔ آپ اس کا علاج کرتے ہیں۔ شام کو بخار اتر جاتا ہے اور آپ کا درجہ حرارت پھر اعتدال پر آ جاتا ہے، یعنی آپ شام کے وقت پھر اسی حالت کی طرف لوٹ آئے جو صبح کے وقت تھی۔

یا آپ کا وزن دو من ہے اور آپ کی طاقت ایک خاص اندازے کی ہے۔ آپ دو ماہ تک بیمار رہے، اس لئے آپ کا وزن ڈیڑھ من رہ گیا۔ آپ کسی سینی ٹوریم میں چلے گئے۔ وہاں علاج، خوراک، فضا کی مساعدت سے آپ کا وزن پھر سے دو من ہو گیا اور طاقت بھی اپنی حالت پر آ گئی، یعنی آپ جیسے بیمار ہونے سے پہلے تھے، پھر ویسے ہی ہو گئے۔

آپ کا کپڑا سفید اور صاف تھا۔ استعمال سے میلا ہو گیا۔ دھوبی نے اسے بھٹی چڑھایا۔ میل کٹ گئی۔ داغ چھٹ گئے یعنی کپڑا پھر اپنی پہلی حالت پر آ گیا۔

ان مثالوں کے بعد مسلمانوں کے عقیدہ نجات کو دیکھئے۔ انسان دنیا میں آنے سے پہلے ایک حالت میں تھا۔ دنیا میں آ کر اس نے کچھ بُرے کام کئے۔ ان بُرے کاموں کی سزا بھگتنے کے لئے اسے دوزخ میں بھیج دیا گیا۔ وہاں اس کی میل کپیل کٹ گئی، داغ دھل گئے۔ یہ پھر اسی حالت پر آ گیا جس میں اپنی پیدائش سے پہلے تھا۔

آپ سوچئے کہ اس تختل میں اور ہندوؤں کے اس تختل میں، جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، اصولی طور پر فرق کیا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ روح اپنی اصل سے الگ ہو کر مادہ سے ملوث ہو گئی جس کی وجہ سے اس میں کثافت آ گئی۔ اب اسے مختلف بھیڑوں میں سے گزارا جا رہا ہے تاکہ اس کی کثافتیں دور ہو جائیں۔ جب یہ اس طرح پاک و صاف ہو جائے گی، تو پھر اسی حالت پر آ جائے گی جس حالت پر پہلے تھی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تصور اور مسلمانوں کے ہاں نجات کا تصور کس طرح اصولاً ایک ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود مسلمانوں کے ہاں بھی دنیا کو جیل خانہ کہا جاتا ہے۔ اس سے نفرت دلائی جاتی ہے۔ دنیاوی زندگی (یعنی دنیا داری) سے پرہیز ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ (حتیٰ کہ متقی کے معنی ہی پرہیزگار

کئے جاتے ہیں) ہر منبر سے یہ آواز اٹھتی ہے کہ دنیا مردار ہے اور اس کی طرف لپکنے والا کتا۔ اگر تم دنیاوی آلائشوں میں پھنس گئے تو خدا سے دور ہوتے جاؤ گے۔ قرب خداوندی کے لئے

مسلمانوں کا عام عقیدہ

دنیا سے دور رہنا نہایت ضروری ہے۔ نجات حاصل کرنے کے لئے

خواہشات کا ترک کرنا لازمی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ تمام عقائد وہی ہیں جو ہندوؤں کے ہاں نجات کے ضمن میں پائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارے ہاں کے تصوف میں وحدت وجود کا عقیدہ تو لفظاً لفظاً وہی ہے جو ویدانت کی اصل ہے، یعنی انسانی روح، روح خداوندی کا جزو ہے۔ اب یہ جزو اپنے کل سے ملنے کے لئے بیتاب ہے۔ روح کو دنیا کی غاردار جھاڑیوں سے چھڑانے کے لئے مختلف قسم کی ریاضتوں اور مشقتوں کی ضرورت ہے۔ جب اس قسم کے زہد و توجہ سے روح کی آلائشیں صاف ہو جائیں گی، تو جزو اپنے کل سے جاملے گا۔ اسی لئے صوفیوں کے ہاں وفات کے بجائے وصال کہا جاتا ہے (یعنی فلاں بزرگ کا وصال ہو گیا) اور مرنے والے کو واصل بالحق کہہ کر پکارا جاتا ہے، یعنی وہ جو خدا سے مل گیا ہے۔ جزو اپنے کل میں مدغم ہو گیا!

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

لہذا ہمارے ہاں شریعت اور طریقت دونوں میں نجات کا تصور، دوسروں کے ہاں سے مستعار لیا گیا ہے۔ اس تصور کو قرآن سے کچھ تعلق نہیں۔ آپ تھوڑا سا بھی غور کریں گے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ اس تصور کی رُو سے انسان کی تخلیق، اس کی زندگی کی تمام تک و تاز، اس تمام پردِ گرام کا نتیجہ، جسے قرآن نے اس شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے، یکسر بے نتیجہ بن کر رہ جاتا ہے۔ روح، جسم میں آنے سے پہلے کسی حالت میں تھی۔ اسے دنیا میں بھیج دیا گیا تاکہ وہ مادہ سے ملوث ہو جائے۔ پھر اسے مختلف بھٹیوں میں گزارا گیا تاکہ وہ اپنی اصلی حالت پر آجائے؛ سوچئے کہ انسانی زندگی کی اس تمام تک و تاز کا ما حاصل کیا ہوا۔ خدا کے اس تمام بلے چوڑے پردِ گرام کا نتیجہ کیا نکلا؟ بس (AS YOU WERE NEGATIVE) غور کیجئے کہ کارِ حیات کا اس قدر مجرّ العقول سلسلہ اور یوں بے معنی؟ انسانی زندگی کے لئے ایسا پُر شکوہ پردِ گرام اور اس قدر بے نتیجہ؟ اور یہ سب کچھ منسوب کیا جائے اس خدا کے حکیم کی طرف جو، چھت پر کھڑے ہو کر نہیں، آسمان سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ ہم نے اس کائنات کو باطل (منفی) انداز سے پیدا نہیں کیا۔ اسے بالحق (مثبت نتائج کا حامل بنا کر) پیدا کیا ہے۔ ہم کھیل نہیں رہے کہ مٹی کا گھر و نڈا بنایا اور جب کھیل ختم ہوا تو اسے پاؤں سے مسمار کر دیا اور اس طرح مٹی پھر اپنی پہلی حالت میں تبدیل ہو گئی۔ نجات کا جو عقیدہ ہندوؤں نے قائم کیا تھا اس کی رُو سے خدا کا تصور اسی قسم کا پیدا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ان کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ یہ تمام

کائنات ”ایشور کی لیلہ“ ہے۔ (یعنی خدا نے یہ کائنات تھیمٹر کے کھیل کے طریق پر بنائی ہے) اسی اعتبار سے ان کے ہاں خدا کو نٹ راجن (کھلاڑیوں کا راجہ) کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر کہہ دیا کہ ہم نے سلسلہ کائنات کو ^(۳۳۸) لَحِیْثِیْن (کھیل کے طور پر) نہیں بنایا۔ لہذا کوئی ایسا پروگرام جس میں سب کچھ ہو چکنے کے بعد کوئی ثبوت نتیجہ برآمد نہ ہو، خدا سے حکیم کے شایانِ شان نہیں۔

لعبت خاک ساختن می نہ سرود خداے را

اس لئے نجات کا وہ تصور جس کی رو سے یہ سمجھا جائے کہ انسان جس مصیبت میں پھنسا ہے اس سے چھوٹ جائے اور ثبوت نتیجہ کچھ نہ نکلے، قرآنی تصور نہیں ہو سکتا۔

قرآن میں نجات کا لفظ

اصل مقصود تک آنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ قرآن میں لفظ نجات کس انداز سے استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی ہیں سطحِ مرتفع (بلند جگہ) جہاں انسان سیلاب سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس لئے اس کے بنیادی معنی محفوظ رہنے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ بنیادی غم و آلام، دشمنوں کے مکار و حیل، سرکش و متمرد قوتوں کے جوہر و استبداد اور دیگر اسی قسم کی صعوبات و مشکلات سے نکلنے حاصل کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً بنی اسرائیل کے فرعون کے مظالم سے رانی پانے کا ذکر نجینا اور انجینا جیسے الفاظ میں ہوا ہے۔ حضرت یونسؑ کو غم و آلام سے رہائی ملنے کے لئے بھی دَنَجِّنُهُ مِنَ الْخَمِطِ (۲۱/۸۸) کے الفاظ آئے ہیں لیکن دوسرے مقامات پر غم و آلام اور مصائب و مشکلات سے (مخلصی حاصل کرنا نہیں بلکہ ان سے بکسر) محفوظ رکھے جانے کے لئے بھی نجات کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً حضرت ہودؑ، صالحؑ، شعیب علیہم السلام کا ان کی اقوام کی فتنہ پردازوں سے محفوظ رکھنے کا ذکر انہی الفاظ میں کیا گیا ہے۔

فَنَجَّيْنَاهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ (۱۱/۵۸) نیز ۹۴، ۱۱/۶۶

حضرت ابراہیمؑ کے آتشِ نمرود سے محفوظ رکھے جانے کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے (فَأَنجَيْنَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ) (۱۹/۲۴) حضرت لوطؑ اور ان کے متبعین کو برادیوں کے عذاب سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے۔ (۲۹/۳۲)۔ دیگر انبیاء کرامؑ اور جماعتِ مومنین کو مشکلات و مصائب سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے (دیکھئے ۱۱/۱۱۶) لیکن یہ مقامات وہ ہیں جہاں اس دنیا کے نامساعد حالات سے رستگاری حاصل کرنے یا ان سے محفوظ رکھے جانے کے لئے

لفظ نجات کا استعمال ہوا ہے۔ حیاتِ اخروی میں جہنم میں ڈال کر پھر وہاں سے نکالنے کے لئے یہ لفظ کہیں نہیں آیا۔ اس سے محفوظ رکھے جانے کے لئے مومنین کو یہ دعائیں سکھائی گئیں کہ **وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ** (۳/۱۵) ہمیں عذابِ نار سے محفوظ رکھیو۔ یہ حفاظت اس انداز سے ہوگی کہ

(مومنین کو جہنم سے دور رکھا جائے گا) **لَا يَتَمَنَّوْنَ حَسْبَهُمْ** (۲۱/۱۰۲) وہ اس سے اتنے دور رکھے جائیں گے کہ اس کی بھٹک تک بھی ان کے کانوں میں نہیں پڑے گی۔

لہذا قرآن میں جہنم میں پڑ کر پھر وہاں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ذکر کہیں نہیں۔ نہ ہی اس کے لئے کہیں نجات کا لفظ آیا ہے۔ اس تمہید کے بعد اب یہ دیکھئے کہ اس باب میں قرآن کی تعلیم کیا ہے۔

نظریہ حیات | قرآن نے حیات کے متعلق ایک عجیب و غریب نظریہ پیش کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ حیات کی حرکت دُوری (CYCLIC) نہیں ارتقائی ہے۔ زندگی نیچے مڑتی ہے نہ بار بار اعادہ کرتی ہے۔ یہ تصور باطل ہے کہ زندگی ایک نقطہ سے چل کر اور اتنے منازل طے کرنے کے بعد پھر اسی نقطہ پر واپس آجاتی ہے۔ حیات صراطِ مستقیم پر چل رہی ہے، یعنی وہ توازن بدوش قوتوں کے سہارے آگے بڑھ رہی ہے۔ ایک ہی مقام پر گردش نہیں کر رہی۔ اس نے کہا کہ کائنات کے ذرے ذرے میں حیات اپنے ارتقائی مدارج طے کر رہی ہے جو نوع (SPECIES) اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کر لیتی ہے کہ اپنے آپ کو اصل ثابت کر دے (یعنی اپنے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیتیں پیدا کر لے) وہ سلسلہ ارتقاء کی منزل طے کر کے ایک قدم اور آگے بڑھ جاتی ہے جو اس قسم کی صلاحیت پیدا نہیں کرتی، وہ وہیں رُک جاتی ہے۔ لہذا زندگی میں رجعت و تکرار نہیں، عروج و ارتقاء ہے۔ خاک کے ذرات اسی قانون ارتقاء کے مطابق مختلف منازل طے کرتے کرتے انسان کی سطح تک آگئے۔ سلسلہ ارتقاء کی اس نئی (اور نہایت اہم) کڑی یعنی انسانیت میں ایک نئے جوہر کا اضافہ ہوا یعنی اسے شعور و ادراک اور اختیار و ارادے سے نوازا گیا۔ یہی وہ امتیاز ہے جس سے انسان موجوداتِ عالم میں اتنا بلند مقام رکھتا ہے۔ انسان کا بچہ اس جوہر کو ساتھ لے کر کارزارِ عالم میں قدم رکھتا ہے جس کی پوری وسعتیں اس کے سامنے ہیں۔ اسے راستے کے نشیب و فراز سے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ زندگی کے ہر دور اپنے پر نشانات کے کھمبے (SIGN POSTS) نصب کر دیے جاتے ہیں۔ منزل کا نشان بنا دیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اب تمہیں اپنی سعی و عمل سے اس اگلی منزل تک پہنچنا ہے جو وہاں

تک پہنچ جاتا ہے، وہ کامیاب ہے، جو نہیں پہنچتا وہ خاسر و ناکام ہے۔ غور فرمائیے قرآن نے ان کڑیوں کو کس قدر دلکش اور جامع انداز سے بیان کیا ہے۔ سورہ الذھر میں ہے:-

هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا (۶/۱)

انسان پر یقیناً وہ زمانہ بھی گزرا ہے جب وہ قابل ذکر شے نہ تھا۔

میں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ انسانی تک و تاز سے مقصود یہ ہے کہ انسان جس پہلی حالت میں تھا پھر وہیں پہنچ جائے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) تو قرآن کی رُد سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ قابل ذکر انسان کے درجے سے پھر ناقابل ذکر شے کے درجے میں پہنچ جائے! کس قدر بے معنی ہے یہ مقصد؟ اس کے بعد فرمایا:-

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ مَّبْتَلِيًا فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا

بَصِيرًا ○ (۶/۲)

ہم نے انسانی تخلیق کی ابتداء مخلوط نطفے سے کی۔ پھر اسے گردشیں دیتے ہوئے اس حالت تک لے آئے کہ سننے اور دیکھنے والا انسان بن گیا۔

مخلوط نطفے سے تخلیق 'درجہ حیوانیت' ہے لیکن انسان کو سماعت و بصر (اور دوسرے مقام پر ہے فؤاد (MIND) عطا کئے جو ذرائع علم ہیں۔ ان صلاحیتوں کے ساتھ اسے راستے کے سرچ و خم سے آگاہ کر دیا۔ انا ہدینہ السبیل (۶/۳) اب یہ اس کے اپنے اختیار میں ہے کہ وہ راہ اختیار کر لے جو اس کی صلاحیتوں کو ابھار کر بار آور کر دے یا وہ راہ جو انھیں دبا کر برباد کر دے۔ (إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا) (۶/۳) اس کے بعد کی آیت میں ہے کہ یہ صحیح راہ پر چلنے والوں کی منزل جنت ہے اور غلط راہ پر جانے والوں کا مقام جہنم یعنی انسان جب دنیا میں آتا ہے تو وہی قانون ارتقاء جو اس سے پہلے کی کڑیوں میں جاری و ساری تھا اس پر منطبق ہوتا ہے۔ مغرب کے میکائیک تصور حیات کی رُو سے انسان اس سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی ہے، اس لئے کہ وہ زندگی کو طبعی تبدیلیوں سے زیادہ کچھ نہیں جانتے لیکن قرآن اس مقام سے آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ علم و عقل کے یہ مدعی کس دھوکے میں پڑ گئے۔ زندگی کا ارتقائی سلسلہ ختم نہیں ہو گیا۔ حقیقی ارتقاء تو اب شروع ہوا ہے۔ یہ منزل تو شعور و ادراک اور اختیار و ارادہ کی اولین منزل ہے۔ یہ تو انسانیت کا گہوارہ ہے۔ اسے ابھی اور بہت سی منازل طے کرنی ہیں۔

یکے در معنی آدم نگر از من چہ می پرسی هنوز اندر طبیعت می غلہ موزوں شود روزے

چنان موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے کہ یزداں رادل از تاثیر او پر خوں شود روزے
 خاک کے ذروں کا معراج کمال بیشک یہی تھا کہ وہ پیکر انسانی میں مشکل ہو جائیں لیکن معراج انسانیت کے لئے تو
 ابھی سینکڑوں منازل اور باقی ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

انسانی ارتقاء | انسان نے اس حیات ارضی سے بلند و بالا، میوولی مادتی سے نفیس و لطیف اور اس
 مجلس عناصر سے ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کرنے کی صلاحیتوں کو نشو و نما دینا ہے۔

وہ اعمال حیات جو اس کے اندر اس بلند و بالا زندگی بسر کرنے کی صلاحیتیں بیدار کر دیں، اعمال صالحہ کہلاتے ہیں۔ یہ
 صلاحیت جس سے انسان اس زندگی سے اگلی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائے، بہت بڑی کامیابی اور قابل قدر
 کامرانی ہے۔ اس کے لئے قرآن نے فلاح اور فوز کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ فلاح کے معنی کھیتی کا بار آور ہونا ہے
 اور فوز کہتے ہیں (ACHIEVEMENT) کو۔ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ الْفَائِزُونَ (۵۹/۲۰) جیسا کہ
 پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآن کی رو سے زندگی کی حرکت دوری نہیں بلکہ حیات صراطِ مستقیم پر جاری ہے۔ وہ صراطِ مستقیم
 جو زندگی کو نشو و نما دینے والے خدا کی راہ ہے (إِنَّ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ) یہ راہ صرف آگے لے جانے والی
 ہی نہیں بلکہ بلندیوں کی طرف لے جانے والی بھی ہے کیونکہ جس خدا کی یہ راہ ہے، وہ ذو المعارج (سیڑھیوں والا)
 بھی ہے۔ وہ انہی سیڑھیوں (ارتقائی منازل کی راہ) سے انسان کو درجہ بدرجہ بلندیوں کی طرف لے جا رہا ہے۔
 (كَتَرُكِبْنَ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ) ”تم یقیناً طبقاً عن طبقی بلند ہوتے جا رہے ہو“ یعنی زندگی کنارِ خاک
 میں جوئے آب کی روانی نہیں بلکہ اپنے زورِ دروں سے فوارہ کی طرح بلندیوں کی طرف جانے والی ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے زندگی کا مقصود کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا (نجات)
 نہیں بلکہ اپنی مضمحل عیشوں کی نشو و نما سے بلند مقامات کا حصول (ATTAINMENT) ہے، یعنی تخم حیات کو
 آبیاری اور پرورش سے ایک تنومند و توانا شجرِ طیب میں تبدیل کر دینا۔ اسی لئے قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ
 يٰۤاٰدَمُ اٰقْلِحْ مَنْ نَزَلَكَ هٰهٰنَا جس نے تخم حیات کو نشو و نما دی، اس کی کھیتی بار آور ہوئی۔ وَقَدْ
 خَابَ مَنْ دَسَّهَا هٰهٰنَا جس نے اس بیج کو مٹی کے تودوں کے نیچے دبایا، اس کی کھیتی کا ثمر بار ہونا تو ایک طرف
 خود بیج بھی ضائع ہو گیا۔ (۹۱/۹-۱۰)

اب یہ دیکھئے کہ جس چیز کو اعمال کی سزا کہا جاتا ہے اس سے مفہوم کیا ہے۔ سزا تین قسم کی ہو سکتی ہے۔ اول انتقامی۔ مثلاً آپ کو کسی نے گالی دی۔ آپ نے غصے میں آکر اس کے تھپڑ رسید کر دیا۔ اسے اپنے کئے کی سزا مل گئی۔ آپ نے انتقام لے لیا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں مل سکتی۔ وہ ذاتِ ممدیت ہے، غصہ کے انتقامی جذبات سے بلند و بالا ہے۔ ہم اگر گناہ کرتے ہیں تو اس کا کیا بگڑا

سزا کا مقصود

ہے جس کے ایک معنی راستے کا درمیانی حصہ ہے۔ اس سے مفہوم یہ ہے کہ خدا کا قانون مکافات ایسا غالب اور زبردست ہے کہ کسی کی مجال نہیں کہ اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے راستہ سے ادھر ادھر ہو جائے۔ لہذا جب انتقام کی نسبت خدا کی طرف کی جائے گی (جیسا کہ قرآن کی بعض آیات میں اسے "ذو انتقام اور منتقم" کہا گیا ہے) تو اس سے یہی مفہوم ہوگا۔ چنانچہ سورہ زمر میں اس مفہوم کو واضح کر دیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۖ فَهُوَ الَّذِي يُضِلُّ الْفَاسِقِينَ ۚ وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُضِلٍّ ۚ وَأُولَٰئِكَ يُنَادُوا لِلَّهِ أَنْتَقِمُ ۚ (۳۹/۳۷-۳۸)۔ یہ خدا کا قانون ہے۔ کیا کسی کو اپنے قانون کی گرفت سے ادھر ادھر نہیں جانے دیتا۔

سزا کی دوسری قسم تادیبی ہو سکتی ہے۔ ایک شخص نے چوری کی۔ حکومت نے اسے جیل خانے بھیج دیا تاکہ قید و بند کی صعوبات سے اسے سبق مل جائے کہ جرم کے عواقب ایسے ہوتے ہیں اور اس طرح وہ خود بھی اور دوسرے دیکھنے سننے والے بھی آئندہ ارتکابِ جرم سے محتنب رہیں۔ ظاہر ہے کہ حیاتِ اخروی میں اس قسم کی سزا بھی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ وہاں نہ جرم سے اجتناب کے کچھ معنی ہیں نہ عبرت پکڑنے سے کچھ حاصل۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس حقیقت کی تصریح کر دی گئی ہے کہ وہاں اہل جہنم جلا میں گئے، گڑ گڑائیں گے کہ ہمیں ایک مرتبہ پھر دنیا میں لوٹا دیا جائے پھر دیکھئے کہ ہم کس طرح جرائم سے اجتناب کرتے ہیں؟ لیکن جواب ملے گا کہ اب وہ زمانہ ختم ہو گیا۔ زندگی پیچھے نہیں مڑ سکتی۔ اس میں رجعت و تکرار نہیں۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ سلسلہ ارتقا میں یا تو آگے بڑھ جانا ہے یا رک جانا۔ لہذا، سزا کی یہ دوسری شکل بھی درست نہیں۔

سزا کی تیسری صورت اعمال کا فطری نتیجہ ہے (NATURAL CONSEQUENCES OF ACTIONS)

آگ میں ہاتھ ڈالنے، اس کا فطری نتیجہ جل جانا ہوگا۔ زہر کھانے، اس کا لازمی نتیجہ ہلاکت ہوگا۔ اس لئے اعمال کی جزا و سزا ان کے فطری نتائج کا ظہور ہے۔ انسان جو کچھ کرتا ہے، اس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ عمل کو نتیجہ تک پہنچنے میں وقت لگتا ہے۔ بعض صورتوں میں وقت اتنا کم ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ عمل اور اس کا نتیجہ ایک وقت (SIMULTANEOUSLY) مرتب ہو گیا لیکن بعض کام

ترتیب و ظہور نتائج

ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کے نتائج مرتب ہونے میں کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ قرآن میں اس قانونِ تدریج و اہمال (درجہ بدرجہ پورے وقت کے بعد نتیجہ تک پہنچانے کے قانون) کے متعلق متعدد مقامات پر شرح و بسط سے تصریحات موجود ہیں۔ اس تمام عرصے میں نتیجہ زیر ترتیب ہوتا ہے۔ جب بدعت پوری ہو جاتی ہے تو وہی نتیجہ مشہود و محسوس طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ اسے یوم الحزب یا یوم الدین کہا جاتا ہے، یعنی ظہور نتائج کا زمانہ۔ سورہ النحل میں ہے:-

وَتَوَيُّؤُاْ خِذَ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ ذَابْنَةٍ وَّلٰكِنْ
يُخَيِّرُهُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى - فَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً
وَّلَا يَسْتَنْقِضُوْنَ (۱۶/۶۱)

اگر ایسا ہوتا کہ اللہ لوگوں کو ان کے ظلم پر (فوراً) پکڑتا تو ممکن نہ تھا کہ زمین کی سطح پر کوئی چلنے والا باقی رہتا لیکن وہ انھیں ایک خاص ٹھہرائے ہوئے وقت تک مہلت دیتا ہے۔ پھر جب ظہور نتائج کا وقت آپہنچتا ہے تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں نہ ایک ثانیہ آگے۔

پانی کو آگ پر رکھئے، وہ غیر محسوس طور پر تدریج حرارت جذب کئے جائے گا۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ وہ اس نقطہ پر پہنچ جائے گا جہاں وہ کھولنے لگے گا۔ اب اس کے اشتعال و اضطراب کو ہر آنکھ دیکھ لے گی۔ اپنے مرض کے متعلق ڈاکٹر سے مشورہ لیجئے، وہ کہہ دے گا کہ آپ بے شک درست کہتے ہیں کہ میں رات کو اچھا بھلا سویا۔ صبح اٹھا، تو جوڑوں میں درد ہو رہا تھا لیکن اس مرض کی ابتدا تو چھ ماہ قبل ہو گئی تھی۔ آپ کو اس کا احساس اس وقت ہوا، جب وہ شکایت

درد کی صورت میں نمودار ہو گئی۔ فطرت کے قانون ارتقاء میں اس آئین تدریج و تاخیر، قانون تدریج (رفتہ رفتہ، وقت معین پر نتیجہ کے ظاہر ہونے کے قانون) کو بڑا دخل حاصل ہے۔

قانون تدریج

سطح میں نگاہیں سمجھتی ہیں کہ کچھ نہیں ہو رہا لیکن جو نگاہیں سطح سے نیچے اتر کر حقیقت کو بے نقاب دیکھتی ہیں، انھیں صاف صاف نظر آ جاتا ہے کہ اس بظاہر سکون و سکوت کے نیچے کتنی قیامتیں کروٹ بدل رہی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جس طرح

طبعی دنیا (PHYSICAL WORLD) میں ہر عمل ایک نتیجہ مرتب کرتا ہے، اسی طرح معنوی دنیا میں بھی ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض نتائج انسان کی اسی زندگی میں ظہور پذیر ہو جاتے ہیں لیکن اگر قانونِ ترتیب و اہمال کے مطابق ظہورِ نتائج کا وقت اس زندگی میں نہیں آتا تو یہ نتائج اس کے بعد کی زندگی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ چونکہ حیات مسلسل حرکت کا نام ہے اور اس میں کہیں انقطاع نہیں، اس لئے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ کسی عمل کا نتیجہ ہمیں برآمد ہو گیا یا سلسلہ متوقف کے ختم ہو جانے کے بعد برآمد ہوا۔ انسان کا جسم اس کے اعمال (ACTIONS) کا محض ذریعہ یا واسطہ (INSTRUMENT) ہوتا ہے۔ اعمال کا اصل محرک کچھ ”اور“ ہوتا ہے۔ جب جسم موت کے ہاتھوں برباد ہو جاتا ہے تو ”یہ کچھ اور“ بدستور باقی رہتا ہے۔ لہذا اس سے فرق نہیں پڑتا کہ ظہورِ نتائج جسم کی موجودگی میں ہوا ہے یا اس کے بعد۔ ترتیبِ نتائج اسی وقت شروع ہو جاتی ہے۔ محض ظہورِ نتائج کے وقت میں اختلاف ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ ”یوم الدین“ یعنی قانونِ خداوندی کے مطابق ترتیب و ظہورِ نتائج کا زمانہ اس وقت بھی موجود ہے۔

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ﴿۸۲﴾ (۸۲/۱۶) یہ تو ملا کی ”قیامت“ ہے

قیامتِ موجود

جس کا اس زندگی سے کچھ تعلق نہیں۔ اسی کو مخاطب کر کے اقبال نے کہا ہے کہ

سخنِ زمانہ و میسراں دراز تر گفتی : ہزار حیف نہ مینی قیامتِ موجود

یہی ”قیامتِ موجود“ ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ و مَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ۔ یہ لوگ جہنم کی نظروں سے غائب نہیں۔ وہ انہیں اس وقت بھی دیکھ رہی ہے۔ ترتیبِ نتائج تو بہر حال اعمال کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے۔ ان میں سے بعض کے نتائج کا ظہور بھی اسی دنیا میں ہو جاتا ہے۔ قرآن واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ

مَنْ يَجْلُ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ آتَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلْيُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً

طَيِّبَةً وَلْيَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۶/۹۷)

جس کسی نے ہواریاں پیدا کرنے والے (یا صلاحیت و صلاحیت پیدا کرنے والے) کام کئے، خواہ مرد ہو خواہ عورت اور ان اعمال کی بنیاد مستقل اقدار کے یقین پر رکھی تو اسے ہم ضرور اس دنیا میں خوشگوار زندگی بسر کرائیں گے اور ان کے اعمال کی نسبت سے نتائج مرتب ہوں گے۔

خوشگوار زندگی کا یہ سلسلہ یہاں سے شروع ہو گا اور مسلسل آگے تک چلا جائے گا۔

لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارِ الْآخِرَةِ خَيْرٌ

وَلَنَنْتَعِمَ ذَا التَّائِبِينَ (۱۶/۳۰)

جو لوگ انسانی معاشرہ کے توازن کو قائم رکھنے والے کام کرتے ہیں، ان کی دنیاوی زندگی میں حسین توازن قائم رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی آئندہ زندگی میں بھی ان کی اختیاری قوتوں میں وسعت آجاتی ہے۔ قانون خداوندی کی ہمداشت کرنے والوں کے لئے وہ کا شانہ حیات نہایت خوشگوار ہے۔

اس کے برعکس غیر صالح (ناہمواریاں پیدا کرنے والے اعمال) کے متعلق فرمایا کہ ان کا نتیجہ اس دنیا میں ذلت و رسوائی ہے۔ (لَا فِي الدُّنْيَا خَيْرٌ) اور اس کے ساتھ ہی آئندہ زندگی کی تباہی اور خرابی بھی (وَلَا فِي الْآخِرَةِ خَيْرٌ لَّهُمْ أَتَقِيئُونَ عَذَابَ الْحَرِيقِ) (۲۲/۹)

انسان کی نگاہیں چونکہ اسی زندگی کی چار دیواری میں گھری ہوئی ہیں، اس لئے وہ مکافاتِ عمل کو بھی اسی دیوار میں محصور سمجھتا ہے۔ حالانکہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) عمل اور اس کے ظہور نتائج کے درمیانی وقفہ کے لئے دنیاوی چار دیواری کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ اس کا تعلق حیات سے ہے جو مسلسل آگے بڑھ جاتی ہے۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ کسی کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہ رہنے پائے۔ اس نے کائنات کو پیدا ہی اس انداز سے کیا ہے کہ ہر عمل اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہے۔

خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ - وَلَنُجْزِيَ كُلَّ تَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۲۵/۲۲)

اللہ نے سلسلہ کائنات کو حق کے ساتھ پیدا کیا، یعنی اس لئے کہ ہر نفس کو اس کے اعمال (کمائی) کا بدلہ دیا جائے اور اس طرح کسی کے معاملہ میں کوئی کمی بیشی نہ ہونے پائے۔

اس دنیا پر نگاہ ڈالئے۔ یہاں ہر شے قوانینِ طبی کے حدود سے گھری ہوئی ہے۔ اس لئے یہاں اعمال کے نتائج برآمد ہونے کے لئے مادی اسباب اور طبی ذرائع کی ضرورت ہے۔ یہ قانون خود خالق کائنات کا متعین فرمودہ ہے۔ اس لئے اس کا منشاء (مشیت) یہی ہے کہ ہر کام قانونِ طبی کے مطابق نتیجہ خیز ہو۔ مثلاً حق میں بڑی قوت ہے لیکن اس قوت کو مؤثر بنانے یا بروئے کار لانے کے لئے شمشیرِ خارا شگاف کی بھی ضرورت ہے۔ اگر حق کو برقرار رکھنے اور غالب کرنے کے لئے قوت موجود نہیں تو حق ہمارے حساب و شمار کے مطابق غالب نہیں آسکے گا۔ اسی لئے قرآن نے کہہ دیا کہ ہم نے نظامِ آئین و عدل کے بقا اور استحکام کے لئے حدید (فولاد) کو بھی نازل کیا ہے۔ (دیکھئے سورہ حدید) اس

نے حق کی حمایت کرنے والی جماعت سے بر ملا کہہ دیا کہ حق کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ **وَالْعَصْدُ وَالْهَمُّ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ** (۸/۴۰) مخالفین کے مقابلے کے لئے قوت فراہم کرو۔ اس لئے کہ مادیت کی چار دیواری میں گھری ہوئی دنیا میں اعمال کے نتائج مادی ذرائع کی رو سے مادی پیکروں میں نمودار ہوتے ہیں۔ اس حد تک مومن

طبعی قوانین اور کا فرد دونوں برابر ہیں۔ ایک مادہ پرست قوم اگر قوت فراہم کرنے کی تو اس کے ہاتھ میں بھی سلطنت و حکومت اسی طرح آجائے گی جس طرح ایک ”خدا پرست“ قوم کے ہاتھ

میں لیکن اس کے بعد ان دونوں میں فرق شروع ہو جائے گا۔ وہ قوم جو قانونِ خداوندی سے سرکشی برتے گی، وہ قوت و حکومت کو انسانی معاشرے میں ناہمواریاں پیدا کرنے کے لئے استعمال کرے گی۔ اس کے برعکس حکومت و سلطنت کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھنے والی قوم اس حکومت کو نظامِ ربوبیت کے قیام کا ذریعہ بنائے گی تاکہ جوہرِ انسانیت کی نشوونما کا انتظام ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اس قوم کے ان اعمال کے بھی تو نتائج مرتب ہوں گے۔ ان میں سے جن اعمال کے نتائج ہمیں مرتب ہو جائیں گے، ان کا ظہور مادی پیکروں میں ہوگا۔ جن کا ظہور آگے چل کر ہوگا، وہ وہاں کے آئین و ضوابط کے مطابق متشکل ہوں گے۔ وہاں معنوی نتائج بھی محسوس طور پر سامنے آجائیں گے کیونکہ وہاں کا قانون یہ ہے کہ **فَكَيْفَ تَتَزَكَّىٰ أَعْيُنُكَ غِطَاءَ كَيْفَ تَصْبِرُ الْبُصُورُ خَدِيدٌ** (۵۰/۲۲) وہاں آنکھوں سے پردے اٹھا دیئے جائیں گے اور نگاہیں بجلیاں بن جائیں گی جس سے مستور حقائق بھی بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں گے۔
(وَبُذِّبَتِ الْبَصَائِرُ لِمَنْ يَشَاءُ) (۷۹/۳۴)

اب کائنات کے آئین ارتقاء پر غور کیجئے۔ کائنات میں تخریبی اور تعمیری دونوں قوتیں کار فرما ہیں۔ تعمیری قوتیں اشیائے منسلکہ کی نشوونما کا ذریعہ بنتی ہیں لیکن تخریبی قوتیں ان کے ضعف و انتشار میں کوشاں رہتی ہیں۔ اگر تعمیری قوتیں غالب رہیں تو نشوونما کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اگر تخریبی قوتیں غلبہ پان جائیں تو نشوونما رک جاتی ہے، در رفتہ رفتہ انحلال و پژمردگی شروع ہو جاتی

ہے۔ انسانی جسم میں اس تعمیری قوت کا نام توانائی (VITALITY) ہے اور تخریبی قوتیں بالعموم وہ مختلف جراثیم ہیں جو تعدیہ (INFECTION) سے پیدا ہوں یا غلط غذا کے کیمیائی عمل سے۔ بعض اوقات یہ جراثیم وہابی صورت میں یوں شش کر کے آجاتے ہیں۔ یہ جراثیم فنائیاں پھیلے رہتے ہیں اور ہر جسم پر حملہ کرتے ہیں۔ جس شخص کی توانائی زیادہ ہو، اس پر جراثیم اپنا اثر نہیں کر سکتے۔ یا یوں کہیے کہ وہ توانائی ان کے تخریبی اثرات کی مدافعت کر رہی ہے۔ جہاں توانائی

کم ہو جاتی ہے، جراثیم غلبہ پا جاتے ہیں۔ اسی کا نام ابتدا میں بیماری اور اس کے بعد ان کے سلسل غلبہ کے انجام کا نام موت ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہی قانون ارتقاء انسانی ذات کے نشوونما میں کارفرما ہے۔ انسان کا ہر عمل نتیجہ پیدا کرتا ہے یعنی اس کی ذات پر ایک اثر مرتب کر دیتا ہے۔ یہ وہ ”اعمالنامہ“ ہے جو ہر شخص کی گردن میں جمائل رہتا ہے۔ اس پر اس کے ہاتھ پاؤں بلکہ خود اس کی اپنی ذات شاہد ہے۔ یہ اثرات یا تو توانائی پیدا کرنے والے ہوتے ہیں یا تخریب کا موجب یعنی انسانی اعمال یا ايجابية (POSITIVE) اثر مرتب کرتے ہیں یا سلبی (NEGATIVE) یا بقول آقان، ”وہ انسانی ذات (خودی) کے استحکام و بقاء کا موجب ہوتے ہیں یا اس کے اضمحلال و تخریب کا باعث، لیکن سلبی ہوں یا ايجابية، بلا نتیجہ کوئی عمل نہیں رہتا۔“

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ - وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (۹۹/۸، ۹)

جو شخص ایک ذرہ کے برابر بھی ايجابية عمل کرے گا، اس کا نتیجہ سامنے آئے گا اور جو ایک ذرے کے برابر تخریبی عمل کرے گا، اس کا بھی نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا۔

یہ عمل تعمیر و تخریب جاری رہتا ہے۔ یہ کشمکش ”خیر و شر“ ہر آن موجود ہوتی ہے۔ ان نتائج کا قانون ارتقاء کی میزان میں وزن ہوتا رہتا ہے۔ اگر تعمیری نتائج کے اعمال کا پلڑا بھاری ہو تو انسان کی نشوونما جاری رہتی ہے۔ اگر وہ پلڑا ہلکا

ہو جائے تو نشوونما ارتقاء کا سلسلہ رک جاتا ہے۔ **جہنم سے مفہوم** **الْمُفْلِحُونَ** جس کی تعمیری قوتوں کا پلڑا بھاری رہا اس کی کھیتی بار آور ہو گئی۔

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۲۳/۱۰۲) یہی ہیں جہنم میں رہنے والے۔
ذات (نفس) کا استحکام ٹوٹ گیا۔ انسانی خودی کی (DISINTEGRATION) ہو گئی۔ اس کا نام جہنم ہے۔
فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ (۲۳/۱۰۲) یہی ہیں جہنم میں رہنے والے۔

یہ ظاہر ہے کہ جس کی تعمیری قوتوں (توانائی) کا پلڑا بھاری ہوتا ہے، اس میں تخریبی قوتیں یکسر معدوم نہیں ہوتیں وہ قوتیں موجود ہوتی ہیں لیکن تعمیری قوتیں ان کے عمل تخریب کو غالب نہیں آنے دیتیں اور اس طرح ان کا تخریبی اثر زائل

ہو جاتا ہے۔ اس عمل کا نام قرآن کی اصطلاح میں مغفرت ہے۔ مغفرت کے معنی حفاظت **مغفرت** کے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن نے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان الحسنة

بِذَٰلِكَ يَهْدِي السَّبِيلَ (۱۱/۱۱۳) توازن قائم رکھنے والے اعمال، توازن بگاڑنے والے اعمال کے تخریبی اثرات کو

زائل کر دیتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے:-

وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُدْخِلْهُ
جَنَّاتٍ... ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۶۴/۹)

جو اللہ پر ایمان لائے اور انہوں نے ہماری پیدا کرنے والے کام کئے تو اللہ کا قانون ان کے
توازن بگاڑنے والے اعمال کے اثرات کو زائل کر دے گا اور ان کی صلا حیتوں کی بنا پر انہیں
”جنت“ میں داخل کرے گا۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

دوسری جگہ ہے کہ خدا کا قانون تخریبی قوتوں کے اثرات کو زائل کر کے ان کی حالت کو صلا حیتوں سے ہم آغوش بنا
دے گا۔ (أَصْلَحَ بَالِكُهُمْ) (۴۷/۲)

جو طالب علم امتحان میں ساٹھ فیصد نمبر حاصل کر لے اسے اگلی کلاس میں جانے کے قابل سمجھ لیا جاتا ہے۔
اور اس کی چالیس فیصد غلطیاں اس کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہوتیں۔ (PASS MARKS) کی یہ
(PERCENTAGE) اس قانون کے مطابق مقرر ہوتی ہے جسے قانون مشیت کہا جاتا ہے۔ یغفر لمن يشاء يعذب
من يشاء کا یہ مفہوم بھی ہے لیکن ساٹھ فیصد نمبر حاصل کرنے والے کے لئے لازمی مضامین (COMPULSORY
SUBJECTS) میں پاس ہونا ضروری ہے۔ اس لئے فرمایا کہ رَانَ تَجْتَنِبُوا كَمَا يَدْرَأُ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ

نَكْفُرُ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلُكُمْ مَدْخَلًا كَرِيمًا (۴/۳۱) اگر تم ان بڑی بڑی (اصولی)
باتوں سے مجتنب رہو، جن سے تمہیں روکا گیا ہے، (اور جو تمہاری تخریب ذات کا موجب ہیں) تو ہم کم درجہ کی
تخریبی قوتوں کے اثرات کو زائل کر دیں گے اور تم اس سلسلہ ارتقاء کی اگلی کڑی میں جا پہنچو گے جو نہایت سرسبز و
خاداب ہے۔ (نیز دیکھئے ۵۳/۳۲) یہ وہ لوگ ہیں جن کی تعمیری قوتیں غالب رہتی ہیں۔ اس لئے ان کی نشوونما کا
سلسلہ برقرار رہتا ہے اور وہ سلسلہ ارتقاء کی اگلی منزل میں جا پہنچتے ہیں۔ اس نشوونما یا فز

جنت | حالت کا نام جنت کی زندگی ہے۔ اس کے برعکس جن پر تخریبی قوتیں غالب آ جاتی ہیں،
ان کی نشوونما رک جاتی ہے۔ اسے جہنم کی زندگی کہتے ہیں۔ جہنم کا لفظ عربی الاصل نہیں، عبرانی ہے لیکن قرآن نے اس
کے لئے دوسرا لفظ ”حجیم“ استعمال کیا ہے۔ اجحیم عنہ کے معنی ہیں، وہ اس سے رک گیا جو نوع سلسلہ
ارتقاء میں رک جاتی ہے، وہ ایک مقام پر ٹھہر جاتی ہے اور وہیں آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن
میں جہنم کا لفظ ہر جگہ واحد کے صیغے میں استعمال ہوا ہے۔ اس لئے کہ رکنے والوں کا ایک ہی مقام ہوتا ہے مختلف مقامات

کے درجے تو آگے بڑھنے والوں کے ہوتے ہیں۔ اسی لئے جنت کے لئے واحد (جنت) تسلیمہ (جنتان) اور جمع جنت کے صیغے آئے ہیں۔ اہل جنت کے متعلق یہ تصریح بھی موجود ہے کہ وہ صراطِ حمید پر چلنے کی دعائیں مانگیں گے اور ان کی پیشانی کا نور ان کے آگے آگے چلے گا، یعنی جنت رکھنے کا مقام نہیں آگے بڑھنے کا مقام ہے۔

نشو و نما پانے والے تو آگے بڑھتے ہیں لیکن سلسلہ ارتقاء میں کسی ایک مقام پر رُک جانے والے ہمیشہ

وہیں رہتے ہیں۔ جن کی نشو و نما رُک جاتی ہے، ان کے لئے اس مقام سے

جہنم ابدی ہے

نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ اس لئے فرمایا کہ **مَرِيدُونَ اِنَّ يَحْشُرُوْنَ** **مِنَ النَّارِ وَمَا لَهُمْ فِيْهَا مِن مَّغْنٍ** (۵/۳۷) وہ ہمیشہ چاہیں گے کہ جہنم سے نکل سکیں۔ وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے۔ وہ اسی ایک حالت میں رُکے رہیں گے۔ **خَالِدِينَ فِيْهَا اَبَدًا** (۲۴)

وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ خود لفظ عذاب اسی حقیقت کی تفسیر ہے۔ عذاب کے معنی ہیں روک دینا۔

عذاب کے معنی عذاب اس اونٹ کو کہتے ہیں جو شدتِ پیاس کی وجہ سے کھانا بند کر دے اور اس سے اس قدر لاغر ہو جائے کہ نہ اس سے چلا ہی جائے اور نہ ہی پھر

کھانے پینے کی ہمت باقی رہے۔

غور کیجئے، جس طرح نشو و نما کر آگے بڑھنے والے کی تعمیری قوتوں کے ساتھ تخریبی قوتوں کے اثرات بھی

موجود تھے، لیکن چونکہ اس میں تعمیری قوتوں کا غلبہ تھا، اس لئے تخریبی قوتوں کا اثر زائل ہو گیا۔ اس طرح جب

تخریبی قوتوں کا غلبہ ہوگا تو پھر تعمیری قوتیں بیکار ہو کر رہ جائیں گی۔ عام الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جب نیکیاں زیادہ ہو گئیں

تو انسان سبہا جنت میں چلا گیا۔ یہ نہیں کہ پہلے برائیوں کی سزا بھگتنے کے لئے جہنم میں بھیج دیا جائے اور پھر قید کی

میعاد پوری کرنے کے بعد جنت کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ یا اگر برائیوں کی زیادتی ہو گئی تو ایک مدتِ مدید تک جہنم

میں رکھ کر پھر نیکیوں کی جزا کے لئے جنت میں بھیج دیا جائے۔ یہ تصور قرآنی نہیں ہے، نجات کا غیر قرآنی تصور ہے۔

چنانچہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے بالتصریح فرمادیا کہ جن کا پلڑا بھاری ہوگا۔ وہ سیدھے جنت میں چلے جائیں گے

اور جن کا پلڑا ہلکا ہوگا، وہ سیدھے جہنم میں۔ نہ ان کی کمزوریاں انھیں عذابِ جہنم کی طرف لے جائیں گی، نہ ان کی

نیکیاں انھیں عذاب بھگتنے کے بعد جنت کی طرف منتقل کریں گی۔ اسی لئے فرمایا کہ:-

بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اِحَاطَتْ بِهَا حَسْبَتُهُ۔ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ

النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُونَ (۲/۸۱)

یاد رکھو! قانون خداوندی یہ ہے کہ جس نے توازن بگاڑنے والے کام اس حد تک کئے کہ اس کی کمزوریوں نے اسے ہر طرف سے گھیر لیا، تو یہ لوگ جہنم میں جاؤں گے، جس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہیں وہ کہ جن کے لئے میزان قائم کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ (فَلَا نُفِيتُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا) (۱۸/۱۵) اس لئے کہ (لَا خَلْدَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ) (۳/۷۱) ان کاحیات اخروی میں کوئی حصہ ہی نہیں۔ اولیٰ اس حبطت اعمالہم ان کے تعمیری قوتوں والے اعمال سب رائیگاں چلے گئے۔ غور کیجئے۔ جب انسان مرتاہت تو اس میں اس وقت بھی کچھ نہ کچھ توانائی تو باقی ہوتی ہے لیکن وہ توانائی اس کے کسی **حبطت اعمالہم** کام نہیں آتی، کیونکہ تخریبی قوتیں اس درجہ غالب آجاتی ہیں کہ وہ نظام بدن کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ لہذا جہنم میں بھیجا ہی اسے جاتا ہے جس میں جنت میں جانے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ مرنا وہی ہے جس میں زندہ رہنے کی قوت نہیں رہتی۔ آگے بڑھنے سے رکنا وہی ہے، جس میں نشوونما کی استعداد مفقود ہو جاتی ہے۔ یہ استعداد کبھی تو بدرجہ مفقود ہوتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ایک غلط قدم ہی ان صلاحیتوں کو سلب کر لیتا ہے۔ مثلاً خود مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ (مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا متعمداً فجزأء سبع جہنم خلیداً فیہا)۔ (۴/۹۳) جس نے کسی مومن کو بالارادہ قتل کر دیا تو اس کی سزا جہنم ہے، جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یا مثلاً سورہ انفال میں جنگ بدر کے ضمن میں ہے کہ اللہ نے کہا کہ آج کے دن جو شخص میدان جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ جائے گا۔ (مَأْوَاهُ جہنم) (۸/۱۶) تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اس قسم کا ایک غلط قدم نشوونما کی ساری قوتوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ جسے سکھیا کی ایک پچانگی عمر بھر کی خوراک سے حاصل کردہ قوتوں کو ایک لمحہ میں زائل کر دیتی ہے، یا چاقو کی ایک چھین ساری عمر کے لئے آدمی کو اندھا بنا دیتی ہے۔ یعنی بعض تخریبی قوت اس قدر تیز اثر ہوتی ہیں کہ عمر بھر کی تعمیری قوتیں اس کے سامنے بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اسی طرح بعض تعمیری قوتیں اس قدر تقویت بخش ہوتی ہیں کہ تخریبی قوتوں کا هجوم بھی انہیں بے اثر نہیں کر سکتا۔

تہریکات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ انسانی ذات کے نشوونما پالنے کے بعد اس کا سلسلہ ارتقاء میں آگے بڑھ جانا جنت کی زندگی ہے اور نشوونما کی صلاحیت کے سلب ہو چکنے کے بعد سلسلہ ارتقاء میں رُک جائے گا نام جہنم کا عذاب ہے اور چونکہ رکنا وہی ہے جس میں نشوونما کی استعداد ہی باقی نہیں رہتی اس لئے جہنم سے سزا بھگتنے کے بعد جنت کی طرف منتقل ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا فَمُؤْمِنٌ عِدَّةٌ تَرْضِيهِ) (۱۰/۶) نظام ارتقاء کا اہل قانون ہے۔

جو کچھ اس وقت تک بکھا گیا ہے۔ اس سے اتنی بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ قرآنِ کریم کی رو سے کائنات میں سلسلہ ارتقاء جاری و ساری ہے۔ یہی قانون ارتقاء خود انسانی زندگی پر بھی حاوی ہے۔ موجودہ پیکرِ انسانی اس کے طبعی ارتقاء کی آخری کڑی ہو تو ہو لیکن جہاں تک اصل انسان یعنی اس کے جوہر و شرفِ انسانیّت کے ارتقاء کا تعلق ہے، اس ارتقاء (نشو و نما) کا آغاز اسی زندگی سے ہو جاتا ہے اور طبعی موت اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ جو اس سلسلے میں اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی زندگی جنت کی زندگی کہلاتی ہے۔ جنت و جہنم سے مقصود ہی یہ ہے کہ کون آگے بڑھتا ہے اور کون پیچھے رہتا ہے۔ ﴿لَمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَتَقَدَّمَ أَوْ يَخْشُرَ﴾ (۴۴/۲۴) جو تم میں سے چاہے آگے بڑھ جائے، جو چاہے پیچھے رہ جائے۔ ﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ﴾ (۴۴/۳۸) اس کا فیصلہ ہر شخص کے اعمال پر منحصر ہے۔ جہنم میں نشو و نما، تزکیہ (GROWTH) رک جاتی ہے۔ چنانچہ اہل جہنم کے متعلق سورہ بقرہ میں ہے کہ ﴿لَا يُزَكَّيهِمْ﴾ (۲/۷۴) اللہ ان کی نشو و نما روک دے گا۔ اینرز (۳/۷۷) جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، چونکہ حیات

جنت اور جہنم مقام نہیں

مسل آگے بڑھتی ہے، اس لئے جنت اور جہنم (آگے بڑھنے کی صلاحیت اور رک جانے کا مرض) اسی زندگی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے جنت یا جہنم کسی خاص مقام کا نام نہیں، کیفیاتِ زندگی کی تعبیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنت کے متعلق قرآن میں ہے کہ ﴿عَنْ ضُلَّهَا الْمَسْلُومُ ذَا الْأُذُنِ﴾ (۳۲/۲۱) اس کی وسعت تمام کائنات (ارض و سماوات) کو محیط ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جنت کسی خاص مقام کا نام نہیں۔ اسی طرح جہنم کے متعلق فرمایا کہ ﴿رَأَتْ جَهَنَّمَ كَمَا يَخْطُطُّ بِأَنْفِهَا﴾ (۲۹/۵۴) جہنم نے کفار کو ہر طرف سے گھیرا ہوا ہے اور دوسری جگہ ہے

﴿نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطْلُعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ﴾ (۱۰۴/۷) اللہ کی سلگائی ہوئی آگ جو دلوں پر چڑھ جاتی ہے۔ اس دنیا میں جنت اور جہنم کی آگ کیسی ہوتی ہے، اسے ہم دیکھ بھی سکتے ہیں اور محسوس بھی کر سکتے ہیں۔ قرآن نے متعدد مقامات پر اس کی تصریح کر دی ہے۔ (یہ عنوان ایک مستقل موضوع ہے جس کے متعلق ضمنی طور پر لکھنا کافی۔) ﴿قُلْ هَذَا مَفِيدٌ﴾ نہیں ہوگا۔ اس پر مستقل طور پر الگ لکھا جائے گا) ان تصریحات کے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ اصولی طور پر اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ قرآن کی رو سے ایک خاص اجتماعی نظام کے ماتحت ”جنت کی زندگی“ بسر ہو سکتی ہے اور اس کے برعکس غلط نظام اجتماعی (معاشرے) میں جہنم کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ جنت کی زندگی کے لئے شرط اولین ”وراثتِ ارض“ (یعنی اپنی مملکت کا وجود) ہے۔ جس میں کسی دوسرے

دنیا میں جنت

کا عمل دخل نہ ہو۔ چنانچہ ”سورہ زمر“ میں اہل جنت کے متعلق لکھا ہے کہ

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ
حَيْثُ نَشَاءُ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ (۳۹/۷۴)۔

وہ (اس کیفیت کو دیکھ کر) پکار اٹھیں گے کہ سزاوارِ حمدیت اللہ کی ذات ہے جس نے اپنے
قانون کے مطابق اپنے وعدوں کو ہم سے سچا کر دکھایا اور ہمیں اس مملکت کا مالک بنا دیا جس میں
ہم پورے پورے طور پر صاحب اختیار ہیں۔ قانونِ خداوندی کے مطابق کام کرنے والی قوموں کے
لئے یہ اجر کس قدر خوشگوار ہے۔

اس مملکت میں قانونِ خداوندی کے مطابق نظامِ ربوبیت کی ترویج و تیفذ سے جو ہر و شرفِ انسانیت کی نشوونما شروع
ہو جاتی ہے اور یہی نشوونما جنت کی زندگی کا آغاز ہے۔ اس کے برعکس، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، جس نظام میں یہ
نشوونما رک جاتی ہے، وہ نظامِ جہنم کی زندگی کی تمہید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جنت اور جہنم کو اجتماعی زندگی کا مظہر
بتایا ہے۔ جنت میں بھی قوموں کی قومیں داخل ہوتی ہیں۔ وَ سَيُتَنَقَّلُونَ فِيهَا إِلَى الْأَعْنَاقِ وَ هُمْ فِيهَا مُقِيمُونَ (۳۹/۷۳)
اور جہنم میں بھی (وَ سَيُتَنَقَّلُونَ فِيهَا إِلَى الْأَعْنَاقِ وَ هُمْ فِيهَا مُقِيمُونَ) سورۃ اعراف میں ہے کہ جہنم میں

داخل ہونے والی ہر نئی قوم سے کہا جائے گا کہ جاؤ اپنے جیسی پہلی قوموں
اجتماعی جنت و جہنم کے ساتھ مل جاؤ۔ (قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ دَخَلَتْ مِنَ

قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ وَالْإِنشِ فِي السَّارِ (۷۳/۳۸) جب وہ اس میں داخل ہوگی تو اس کی ہم مشرب قوم اس
پر لعنت بھیجے گی۔ (كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعْنَتْ أُخْتَهَا) سورۃ ملک میں ہے کہ جہنم میں یہ
اقوام فوج در فوج داخل ہوں گی (۷۴/۸) اسی طرح سورۃ ابراہیم میں ہے۔ (أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ سَبَّحُوا بُحْبُوحَةً
اللَّهِ كُفَّاءً) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جنہوں نے خدا کی دی ہوئی نعمت (مملکت و حکومت)
کو غیرِ فدائی آئین کے خطوط پر متشکل کر کے اس کی ناسپاس گزاری کی اور اس طرح اس کی ابھارنے والی قوتوں کو دبا کر
رکھ دیا (كُفَّاءً) اور یوں (وَأَخْلَلُوا قُومَهُمْ دَارَ الْبُيُوتِ) (۷۴/۲۸)۔ اپنی پوری کی پوری قوم کو جہنم میں لے گئے۔
غور کیا آپ نے کہ کس طرح اربابِ حل و عقد کی غلط روش سے پوری کی پوری قوم جہنم میں چلی جاتی ہے یعنی ان کے
معاشرے کا قیام نظامِ ربوبیت کے مطابق نہیں ہوتا، اس لئے اس قوم کی نشوونما کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں
اور یہی ان کے لئے جہنم ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، قرآن نے جنت اور جہنم کی زندگیوں کی اس قدر
تفصیل بیان کر دی ہے کہ ان سے ان اجتماعی نظامہا نے حیات کا پورے کا پورا نقشہ مرتب ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔

جس کا نتیجہ جنت یا جہنم کی زندگی ہے۔ (یہ تفصیل میری کتاب معارف القرآن کی آخری جلد میں شرح دبط سے ملیں گی) ان نفاہائے حیات کے جو نتائج اس وقت ہمارے سامنے آجاتے ہیں انہیں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں لیکن زندگی کی اگلی منزل (حیاتِ اخروی) کی کیفیات کس قسم کی ہوں گی، اس کا علم و احساس آج کی زندگی میں نہیں ہو سکتا۔ انسانی زندگی سے کھلی کڑی کا حیوان نہیں سمجھ سکتا کہ انسانی شعور و ادراک کی خصوصیات اور اس کے جوہر انسانیت کی کیفیات کیا ہیں۔ ان کا احساس صرف انسانی زندگی کے درجے میں پہنچ کر ہی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح انسان کی موجودہ زندگی میں اس حقیقت کا احساس ناممکن ہے کہ اس سے اگلی منزل کے خصائص و امتیازات کی کیا نوعیت ہوگی۔ اس لئے فرمایا کہ:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا تُخْفِي لَهُمْ مِّن قِسْطٍ مِّنْ عَمَلِكُمْ كَافُوا لَيْعَنَّا كُونَ (۳۲/۱۷)

کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے اعمال کے بدلے میں ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لئے جو کچھ

پس پردہ چھپا ہوا ہے۔ وہ کیا ہے؟

آج ان حقائق کا ادراک اور ان کوائف کا احساس ناممکن ہے۔ لہذا ان کے متعلق قرآن کی بیان فرمودہ نصیحت یا اشارت پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ اُس وقت یہ چیزیں مشہود پیکردن میں سامنے آجائیں گی اور لوگوں کے اعمال کے نتائج ان کے سامنے نمودار ہو جائیں گے، بایں فطرت نشوونما سے محروم رہ جانے والے آگے بڑھ جانے والوں کی خوشی پر اپنے ہاتھ کاٹیں گے اور فرط حسرت سے پکار اٹھیں گے کہ

يٰلَيْسَتْنِي قَدْ مَتَّ لِحَيَاتِي (۱۹/۲۴)

اے کاش! میں نے اس زندگی کے لئے پہلے سے کچھ بھیجا ہوتا۔

یہی وہ شدتِ احساس ہے جو اہل جہنم کی زندگی کو اس درجہ درد انگیز و کرب آمیز بنادے گی کہ وہ جلا اٹھیں گے کہ یلیستنی کنت تروابا۔ (اے کاش! میں ذی احساس ہونے کے بجائے بے حس مٹی کا تودہ ہوتا)۔

اس جنت کے علاوہ جو انسان کو اس دنیا میں یا اخروی زندگی میں اس کے اعمال

آدم کی جنت

کے نتیجے میں ملتی ہے، قرآن کریم میں اس "جنت" کا بھی ذکر ہے، جس میں آدمؑ رہتا تھا اور پھر اسے وہاں سے نکالا گیا۔ یہ "جنت" کیا تھی اور "آدم" کے وہاں سے نکلنے سے مراد کیا ہے، ان موضوعات کا تعلق داستانِ آدمؑ سے ہے جس کا یہ مقام نہیں۔ (اسے میں نے اپنی کتاب "ابلیس و آدم" میں

تفصیل سے بیان کیا ہے) اس جگہ صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ قصہ آدم و حوا کی زندگی کی روئادہ ہے جسے قرآن کریم نے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ ”آدم“ سے مراد آدمی ہے نہ کہ کوئی خاص فرد۔ نوع انسانی کی ابتدائی زندگی میں، سامانِ رزق کی بڑی افراط تھی، اس لئے اس وقت ابھی ”میری اور تیری“ کی کشمکش پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ہر شخص کو جہاں سے جی چاہے بافراط کھانے پینے کو مل جاتا تھا اور افراد میں باہمی کسی قسم کی چپقلش نہیں تھی۔ یہ تھی آدم کی ابتدائی جنت کی زندگی۔ پھر اس کا دور تمدن شروع ہوا جس میں افراد کے مفاد میں باہمی تصادم ہونے لگا۔ اس سے ان میں عداوت پیدا ہو گئی۔ نوع انسانی قبیلوں اور خاندانوں میں بٹ گئی۔ (ابھی قبائل اب قوموں کی شکل میں تبدیل ہو گئے ہیں) قبائل میں باہمی لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ یوں اس زمین پر عموماً ریزوں اور فساد انگیزوں کے سلسلے کی ابتدا ہوئی جو ابھی تک جاری ہے بلکہ اس کی شدت اور زیادہ ہو گئی ہے۔ اس سے اس کی زندگی کی وہ پہلی سی حالت نہ رہی۔ یہ اس کا ”مہبوط“ تھا۔ یعنی جنت کے مقام بلند سے نیچے اتر آنا۔ اس کے بعد اس سے کہا گیا کہ اگر تم پھر اُسی جنت کی زندگی حاصل کرنا چاہتے ہو تو خدا کی وحی کے مطابق اپنے معاشرہ کو تشکل کرو۔ اس سے تمہیں اس دنیا میں بھی جنت کی زندگی میسر آجائے گی اور آخرت میں بھی۔ چونکہ یہ زندگی تمہارے اعمال کا فطری نتیجہ ہوگی، اس لئے اس ”جنت“ سے نکالے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ یوں جنت سے نکالا ہوا ”آدم“ دوبارہ جنت حاصل کر لے گا۔ اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔ اور پھر اسی جنت کا سلسلہ آگے بڑھتا چلا جائے گا۔

گذشتہ صفحات میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے جنت اور جہنم میں قیام ہمیشہ **دوام سے مراد** کے لئے ہوگا۔ (اخْلِدِينَ فِيْهَا اَبَدًا) لیکن اس دوام اور ہمیشگی سے وہ ابدیت اور سرمدیت متصور نہیں، جو صرف ذاتِ خداوندی کے لئے مختص ہے۔ یہ دوام قانونِ مشیت کے ساتھ مشروط ہے۔ چنانچہ سورہ ہود میں جنت اور دوزخ دونوں کے متعلق فرمایا کہ (اخْلِدِينَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اَلَا مَا شَآءَ رَبُّكَ) وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک کہ ارض و سما قائم ہیں۔ مگر یہ کہ جو تیرے نصوص و نواہی سے والے کے قانونِ مشیت میں ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ سلسلہ ارتقاء میں پیچھے رہ جانے والی نوع کچھ عرصے تک علیٰ حالہ باقی رہتی ہے، اس کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ آگے بڑھنے والی نوع کچھ عرصہ تک اس اگلی منزل میں رہتی ہے۔ اس کے بعد آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ سلسلہ غیر منقطع ہوتا ہے کہ

زندگی جوئے وال است و رواں خواہد بود ایں مئے کہنہ جوان است و جوان خواہد بود
لیکن اس غیر منقطع روانی کی ابدیت، خدا کی ابدیت کی طرح مطلق نہیں ہو سکتی۔

قرآن کی رو سے "نظرِ نجات" کے متعلق یہ چند اجمالی اشارات ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ (اس کے لئے میں نے معارف القرآن کی آخری جلد کو مخصوص کر رکھا ہے) ان اجمالی اشارات کو سامنے رکھئے اور اس کے بعد غور کیجئے کہ یہ تصور کس قدر علم و بصیرت پر مبنی ہے؟ اور ایسا کیوں نہ ہو؟ قرآن اس خدا کی کتاب ہے جو علم حقیقی کا سرچشمہ اور دنیا بھر کو بصیرت عطا کرنے والا ہے۔ پھر یہ صحیفہ مقدسہ ذمہ انسانی کی آمیزش سے پاک و صاف ہے۔ اس لئے اس میں جو کچھ ہے علم و یقین ہے۔ ظن و قیاس کا اس میں کہیں گز نہیں۔ اس تصور کے برعکس اس نظرِ نجات کو دیکھئے جو ہمارے ہاں عام طور پر رائج ہے۔ وہ نظریہ غیر اسلامی تصورات سے اخذ کردہ اور ذہن انسانی کی پیداوار ہے جس میں ہر بات کو "قیامت" پر اٹھا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ قرآنی تصور کی رو سے ہماری زندگی کی ایک ایک سانس میں "حساب اور کتاب" پوشیدہ ہے۔

قدم پر قیامت

حیات میں ایک ایک قدم پر میزان قائم ہے، جس میں ہمارے اعمال تلے اور ابھیں موت اور زندگی کے پروانے ملتے ہیں۔ بقائان کے لئے ہے جو نوع انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع رساں ہو۔ **وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ الْنَفْسَ فِيمَا كُنْتَ فِي الْأَرْضِ** (۱۳/۱۷) (یاد رکھو باقی وہی رہتا ہے جو نوع انسانی کو فائدہ پہنچاتا ہے)۔ بقا اور نشوونما کے لئے صرف اپنی ذات میں اصلاح (THE FITTEST) ہونا کافی نہیں۔ نفع اسب سے زیادہ نفع پہنچانے والا) ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ "انفعیت" صرف نظام ربوبیت میں ممکن ہے۔ لہذا اگر ہمارا معاشرہ نظام ربوبیت کے خطوط پر متشکل ہے تو اس میں ہر لمحہ جو ہر انسانیت کی نشوونما ہوتی رہتی ہے۔ اور اس طرح ہمارے اندر باغِ جنت کے شگوفے کھلتے اور پھول لہلہاتے چلے جاتے ہیں اور موت کا پردہ ان کی شادابیوں میں کہیں حائل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اگر ہماری زندگی نفسا نفسی (انفرادیت) کے انسانیت سوز آتش دانوں سے گزر رہی ہے تو مزہِ حیات کی شادابیاں لمحہ بہ لمحہ خشک ہوتی چلی جاتی ہیں اور ان میں نشوونما کی

بقا النفع

کوئی صلاحیت باقی نہیں رہتی اور بد بختی ہے ان سوختہ سامانوں کے لئے، جن کی کھیتیاں اس طرح جھلس کر رہ جائیں۔

حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَمِيدًا (۲۱/۱۵)

یہ بھی واضح رہے کہ حقائقِ قرآن کے متعلق جو کچھ ہم سمجھ سکتے ہیں، اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ تجارب و مشاہدات اور علم و بصیرت کے صحیح خطوط پر آگے بڑھتا جائے گا، قرآنی حقائق اور بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمُ الْفُتُورُ (۲۱/۵۳)

ثواب

اکتوبر ۱۹۵۱ء

انسان اپنا مفہوم الفاظ کے ذریعہ بیان کرتا ہے۔ اسی لئے اسے حیوانِ ناطق کہا جاتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ رفتہ رفتہ الفاظ باقی رہ جاتے ہیں اور جس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے وہ وضع ہوئے تھے وہ مفہوم گم ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ چیز کچھ عجیب سی نظر آئے گی کہ الفاظ باقی ہوں اور ان کا مفہوم گم ہو چکا ہو لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہادفی تعمق ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ متعدد الفاظ ہیں جنہیں ہم صبح سے شام تک بلا تکلف استعمال کئے جاتے ہیں لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ ان کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ مذہبی دوائر حیات میں اس قسم کے الفاظ کی بڑی کثرت ہوتی ہے اس لئے کہ ”مذہب“ کو زندگی کے عملی مسائل سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کے مباحث نظری (THEORETICAL) ہوتے ہیں اور نظری مباحث میں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی کہ یہ سوچا جائے کہ جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں ان کا مفہوم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ”مذہب“ چونکہ انسان کے دیرِ سحر (MAGIC AGE) کی یادگار ہے، اس لئے اس میں سارا زور الفاظ پر دیا جاتا ہے۔ ان کے مفہوم سے کچھ مطلب نہیں ہوتا۔ سحر کی الفاظ بلا مفہوم کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ الفاظ (بلا مفہوم) کے الٹ پھیر اور اعادہ سے نتیجہ پیدا ہو۔ تعویذوں کے الفاظ کو دیکھئے، عجیب ہنملات کا مجموعہ دکھائی دیں گے لیکن تعویذ لکھنے والے ان کی پابندی پر اس قدر

ط۔ مذہب سے مراد انسانوں کا خود ساختہ ”مذہب“ ہے۔ خدا کی طرف سے دین ملتا ہے۔ اس لئے اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے

زور دیں گے کہ اگر ایک حرف میں بھی رد و بدل ہو جائے تو وہ سمجھ لیں گے کہ اب نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ "الفاظ بلا مفہوم" اور اعمال بلا نتیجہ، یہ ہے "مذہب" کی صحیح تعریف۔

اسلام "مذہب" کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھا۔ وہ مذہب کے بجائے دین لے کر آیا تھا۔ جسے آج کی اصطلاح میں آئینی نظام زندگی کہا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ نظام زندگی، نظری مسائل سے نہیں بلکہ زندگی کے عملی مسائل سے بحث کرے گا اور جب اس بحث کا دائرہ عمل مسائل حیات پر مشتمل ہوگا تو اس کے الفاظ واضح اور بین مفہوم کے ہیکر ہوں گے۔ اس میں "لفظ بلا معنی" کا تصور بھی نہیں کیا جاسکے گا۔ قانون اور آئین کی دنیا میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہوتا جس کا مفہوم ٹھیک ٹھیک متعین نہ کر دیا گیا ہو۔ اگر کسی لفظ کی تعریف (DEFINITION) میں ذرا فرق ہو جائے تو اس سے پورے کا پورا قانون بدل جاتا ہے۔ اسی لئے قانون کی کتابوں میں ہر لفظ کی تعریف متعین کر دی جاتی ہے۔ مثلاً چوری جرم ہے۔ قانون کی کتاب میں پہلے یہ بتایا جائے گا کہ چوری کہتے کسے ہیں۔ اس لفظ کا مفہوم کیا ہے۔ اس متعین مفہوم کے مطابق یہ فیصلہ ہوگا کہ فلاں عمل چوری کہلا سکتا ہے یا نہیں۔

متعین مفہوم

وقس علی هذا۔

اسلام جب ایک آئینی اور قانونی نظام زندگی اپنے ساتھ لایا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کھر لفظ اور ہر اصطلاح کا مفہوم متعین ہوگا۔ بلا تعین مفہوم نہ قانون قانون رہ سکتا ہے نہ آئین آئین۔ اسلام کا ضابطہ آئین قرآن ہے اور قرآن کا فائدہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ کا مفہوم خود متعین کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ کتاب آئین ہے، "مذہبی منتروں" کی کتاب نہیں لیکن جب قرآن کا دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو جس طرح ہر مذہب کی حالت ہے، اس کے الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان الفاظ کا مفہوم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب حالت یہ ہے کہ ہم صبح سے شام تک ان الفاظ کو دہرتے ہیں لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے؟ انہی الفاظ میں ایک لفظ "ثواب" بھی ہے۔ مذہب پرست طبقہ میں دیکھئے۔ بات بات میں اس لفظ کو دہرایا جائے گا۔ یہ کرنے سے اتنا ثواب ہوتا ہے، وہ کرنے سے اتنا ثواب ملتا ہے۔ جس بات کے متعلق پوچھنے کے ایسا کرنے سے کیا ہوگا تو اس کا جواب یہی ملے گا کہ اس سے ثواب ہوگا لیکن اگر آپ پوچھ بیٹھیں کہ صاحب! ثواب ہوتا کیا ہے، تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ اس کا کوئی معقول جواب آپ کو نہیں ملے گا۔ آپ کو یہ بات بظاہر تعجب انگیز سی دکھائی دے گی (اور ہر وہ بات جس پر پہلے پہل غور کرنے کی دعوت دی جائے، تعجب انگیز نظر

ثواب کیا ہے؟ | آیا کرتی ہے) لیکن جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ اس واقعہ ہے۔ آپ دور نہ جانیے خود اپنے آپ سے سوال کر کے دیکھئے۔ آپ نے بھی تو اس لفظ کو متعدد بار بولا

ہوگا۔ ذرا سوچئے تو یہی کہ آپ کے ذہن میں اس کا مفہوم کیا ہے۔ آپ کو اپنے ذہن سے زیادہ سے زیادہ یہ جواب ملے گا کہ ”ثواب“ کوئی ایسی چیز ہے جس سے قیامت میں جہنم کے عذاب سے نجات ملے گی، یعنی یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا کوئی اثر آپ کی ذات پر مرتب ہوتا ہو یا جس کا تعلق آپ کی اس زندگی سے ہو۔ اس کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے اور وہاں کے متعلق کہا نہیں جاسکتا کہ کیا ہوگا اور کیسے ہوگا۔ یہ ہے ”ثواب“ کا وہ مفہوم جو آپ کے ذہن میں آنے لگا یا آپ کو وہ شخص بتائے گا جس سے آپ اس کا مفہوم پوچھیں گے۔

غور کیجئے کہ یہ لفظ ایسا ہے جس کا استعمال بات بات میں ہوتا ہے لیکن اس کا مفہوم ایسا مبہم بتایا جاتا ہے جس سے کچھ پتے ہی نہیں پڑتا کہ بات کیا ہوئی۔ آپ سوچئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ مذہب پرست طبقہ ہمیشہ شکایت کرتا رہتا ہے کہ مسلمان اسلامی احکام کی پروا نہیں کرتے۔ ان کی زندگی مذہبی نہیں رہی۔ وہ دوسرا اور لواہی کے پابند نہیں۔ یہ لوگ شکایت تو مسلسل کرتے رہتے ہیں لیکن کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ بالآخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ آپ ایک بچے سے تو اس طرح کام کر سکتے ہیں کہ یہ **عمل کیوں نہیں ہوتا** | کرو، وہ نہ کرو بغیر بتائے ہوئے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور ایسا نہ کرنے

سے کیا۔ لیکن جب وہی بچہ صاحب فکر و شعور ہو جائے تو اس وقت آپ اس سے اس طرح احکام نہیں منوا سکتے۔ اس وقت آپ کو بتانا ہوگا، اسے سمجھانا ہوگا کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور ایسا نہ کرنے سے کیا۔ مذہب کی تاکید یہ ہوتی ہے کہ ان معاملات میں عقل کو کوئی دخل نہیں۔ اس لئے تم ”کیوں“ نہ پوچھو، جو کچھ کہا جاتا ہے، چپکے سے کئے جاؤ۔ انسانی ذہن اپنے جہدِ طفولیت میں تو اس طریق کار پر عمل پیرا ہو سکتا تھا لیکن جب وہ ”کیوں“ کے مقام تک پہنچ جائے تو پھر مجرد حکم اس کے لئے محرک عمل نہیں ہو سکتا۔ وہ حکم کی لم بھی سمجھنا چاہتا ہے۔ چونکہ قرآن مذہب نہیں بلکہ دین لایا تھا، اس لئے اس نے ذہن انسانی کے اس تقاضے کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ کتاب (قانونِ باحکم) کے ساتھ حکمت (اس کی لم ”کیوں“) بھی بتادی اور ہر مقام پر واضح کر دیا کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور ایسا نہ کرنے سے کیا۔ اس نے اپنی دعوت کی بنیادی بصیرت پر رکھی۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ صاحبانِ عقل و بصیرت خود دیکھ سکتے ہیں کہ اس نظامِ حیات کے نتائج کیا ہوں گے۔ اس نے کھلے کھلے طور پر کہہ دیا کہ بدترین خلائق (شر الدواب) وہ انسان ہیں جو عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔ دنیا کا کوئی نظام ہو، اس کی جافزیت کا راز اس کے نتائج میں مضمر ہوتا ہے اور نتائج اس ٹھوس

حقیقت کا نام ہے جو بلا حجاب و نقاب سامنے آجائے۔ مبہم الفاظ اور غیر متعین مفہوم کبھی نتائج کی جگہ نہیں لے سکتے۔ یہ ہے اصل وجہ اس امر کی کہ مسلمان ”مذہبی احکام“ کی پابندی نہیں کرتے۔ مبہم الفاظ سوچنے والے ذہن کے لئے کبھی وجہ کشش نہیں ہو سکتے۔ ان سے صرف وہی طبقہ متمسک رہ سکتا ہے جس کا ذہن ہنوز ”عبد طفولیت“ میں ہو۔ سوچنے والا ذہن، کتاب (حکم) کے ساتھ اس کی حکمت (لم) کا بھی تقاضا کرتا ہے اور حکم کی لم اس کے نتیجہ ہی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ دین (نظام زندگی) نتائج پیش کرتا ہے اور یہی نتائج اس کی کشش کا باعث ہوتے ہیں۔ اس تمہید کے بعد لفظ ثواب پر غور کیجئے۔ ثواب کے لغوی معنی میں کسی چیز کا کوئی

ثواب کے معنی

کر آجانا۔ کسی حوض کا اس طرح لبالب بھرے رہنا کہ جتنا پانی اس میں سے نکلے

اتنا ہی اس میں واپس آتا رہے۔ استثاب کہتے ہیں (RESTORATION) کو۔

آپ کوئی کام کیجئے۔ اس میں کچھ نہ کچھ صرف ہوگا، مال، وقت، توانائی (ENERGY) ذہنی ہو یا جسمانی۔ اگر اس کام کا نتیجہ، اس صرف شدہ توانائی کو واپس لے آتا ہے، تو وہ نتیجہ اس کا ثواب ہوگا۔ ثاب جسمہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جسم سے جس قدر توانائی زائل ہو جائے — وہ پھر واپس آجائے اور اس طرح جسم تنومند اور توانا رہے۔ آپ صبح سے شام تک کوئی کام کرتے ہیں جس کے معاوضہ میں آپ کو کچھ روپیہ ملتا ہے لیکن اس کام کے کرنے میں آپ کی توانائی صرف ہوتی ہے۔ اس کے لئے آپ اچھی غذا کھاتے ہیں جس سے آپ کی صرف شدہ توانائی واپس مل جاتی ہے۔ اس طرح آپ کے اس طریق کار کی رُو سے آپ کی توانائی بھی برقرار رہتی ہے اور جو کچھ آپ کماتے ہیں وہ آپ کا منافع ہوتا ہے۔ اول الذکر (توانائی کے واپس آ جانے کو) ثواب کہتے ہیں اور ثانی الذکر (حاصل محنت) کو فوز (ACHIEVEMENT) یا مثلاً آپ سیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں آپ کی کچھ توانائی (ENERGY) صرف ہوتی ہے لیکن وہ سیر آپ کی صحت کے لئے مفید ہے۔ اس لئے کہ وہ صرف شدہ توانائی کو واپس لاتی ہے اور آپ کی صحت کو بھی درست کرتی ہے جس سے آپ کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ سیر کا ثواب اور فوز ہے۔ اسلام کے نظام (الدین) میں ہر فرد اپنے مفوضہ فرائض کو سرانجام دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ان افراد کا وقت، مال، توانائی، ذہنی اور قلبی قوتیں صرف ہوتی ہیں۔ اس نظام کے اجتماعی نتائج ان صرف شدہ قوتوں اور قدروں کو بھی واپس دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ارتقائے انسانیت کا وہ مقصد کلی بھی پورا ہوتا (اور آگے بڑھتا) رہتا ہے جس سے انسان کا رگڑ عالم کے تخلیقی پردہ گرام میں خدا کا رفیق بنتا ہے۔ اس قرآنی نظام زندگی کے نتائج کو ”ثواب اللہ“ کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ:-

تیسرا نظام وہ ہے جس میں نہ اس زندگی کی خوشگاریاں حاصل ہوتی ہیں، نہ اس کے بعد نہ یہ، نہ وہ کی زندگی کی۔ یہ ہے ”مذہب کی زندگی“۔ اس زندگی میں انسان اپنے آپ کو اس دھوکے میں رکھتا ہے کہ اگر ہماری موجودہ زندگی ذلت و خواری کی زندگی ہے تو کوئی بات نہیں۔ یہ زندگی چند روزہ ہے۔ اس کے بعد حیات ابدی کی ہمیشہ رہنے والی خوشگاریوں کے ہم ہی مالک ہیں لیکن قرآن کی رو سے یہ بہت بڑا دھوکا ہے، نفس کا فریب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا** کیا تمہیں بتاؤں کہ وہ لوگ کون ہیں جن کے کاموں کا نتیجہ خسارہ ہی خسارہ ہے۔ **الَّذِينَ ضَلَّ سَعِيَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا** یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوشش دنیاوی زندگی میں غلط راہوں پر پڑ جاتی ہیں۔ **وَهُمْ يَحْسِبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا** لیکن وہ بزرگم خویش یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے نیک کام کر رہے ہیں۔ **أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا** یا ایہذا ربہم ولفقائہ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو درحقیقت قانون خداوندی کا عملی انکار کرتے ہیں، اس طرح کہ حقائق کا انساٹا کرنے (TO FACE REALITIES) کی بجائے وہ ان سے گریز کی راہیں نکالتے ہیں۔ فحبطت اعمالہم ان کے کاہظاہر بڑے خوش آئند دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کا نتیجہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ **فَلَا تُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا** (۱۰۵-۱۰۳/۱۸) یہ اعمال ایسے بے نتیجہ ہوتے ہیں کہ ظہور نتائج کے سلسلے میں ان کا وزن تک معلوم کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بالکل بے وزن ہوتے ہیں۔ مذہب پرست طبقہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتا ہے کہ اگر ہماری آج کی دنیا خوشگوار نہیں تو نہ ہی آخرت کی نعمتیں تو ہمارے ہی لئے ہیں لیکن یہی ان کی بھول ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **مَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ** اس دنیا کا اندھا اس دنیا میں بھی اندھا ہی رہے گا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ آج کی دنیا ذلیل اور خوار ہو اور کل کی دنیا میں ساری سرفازیاں اتنی کے حصے میں آجائیں۔ لہذا

۱۔ اسلام کے نظام حیات میں امروز اور فردا دونوں خوشگوار ہوتے ہیں۔

۲۔ عام دنیاوی نظام میں صرف امروز خوش گوار ہوتا ہے۔

۳۔ اور انسانوں کے خود ساختہ ”مذہب“ کی دنیا میں نہ آج خوشگوار ہوتا ہے نہ کل۔ ایک مقدس دھوکا ہوتا ہے

اور بس۔ **وَهُمْ يَحْسِبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا** مسلمان صدیوں سے اس مقدس دھوکے

میں مبتلا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے ثواب کے معنی کیا ہیں، یعنی

اعمالِ حیات کے وہ زندہ اور مثبت نتائج جو محسوس شکل میں ہمارے سامنے آجائیں اور

جس سے ہماری دنیادی زندگی بھی خوشگوار ہو اور موت کے بعد کی زندگی بھی۔

جو اعمالِ حیات اپنے محسوس نتائج پیدا نہیں کرتے، یاد رکھئے کہ ان کا کوئی ثواب نہیں ملتا۔ اب آپ اپنے لئے خود
میزان قائم کر کے دیکھ لیجئے کہ آپ کے کون کون سے اعمال ایسے ہیں جن کا ثواب ہوتا ہے اور کون کون سے ایسے
ہیں جن کا کوئی ثواب نہیں ہوتا۔

اے مسلمان! اپنے دل سے پوچھ لٹا سے نہ پوچھ



نظریہ ارتقاء اور قرآن

نومبر ۱۹۵۱ء

قرآن سے پہلے دنیا، بالواسطہ یا بلاواسطہ مفکرین یونان کے نتائج فکر سے متاثر تھی۔ اس فلسفہ کی رُو سے کائنات کا تصور سکونی (STATIC) تھا، یعنی یونان کے فلاسفرز یہ کہتے تھے کہ کائنات کسی وقت، کسی طرح مکمل شکل میں وجود میں آگئی تھی اور اب ایک بے جان ڈلے کی طرح فضا کی پسائیوں میں چپ چاپ پڑی ہے۔ نہ اس میں کوئی ترقی ہے نہ اضافہ، نہ تغیر ہے نہ تبدل۔ اسے جو کچھ بننا تھا، بن چکی۔

کائنات کا تصور | اس میں کوئی ترقی ہے نہ اضافہ، نہ تغیر ہے نہ تبدل۔ اسے جو کچھ بننا تھا، بن چکی۔

جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اس میں اگر حرکت ہے تو وہ بھی دوری (CYCLIC) یعنی کو لھو کے بیل کی طرح ایک دائرہ میں گردش کرتی ہوئی جس میں کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔

قرآن نے اس نظریہ کا ابطال کیا ہے اور کہا کہ کائنات کا تصور سکونی نہیں بلکہ حرکیاتی (DYNAMIC) ہے۔ ہیولائے کائنات ایک بننے والی شے کے خمیر کی شکل میں وجود میں آیا اور اب کائنات مسلسل تغیر و تبدل سے اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی، اپنے منتہی کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ خالق کائنات اس ہیولی کو وجود میں لانے کے بعد معطل ہو کر نہیں بیٹھ گیا، بلکہ وہ اس میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔

”وہ اپنے قانون مشیت کے مطابق مخلوق میں برابر اضافے کرتا رہتا ہے“ صرف اضافہ ہی نہیں بلکہ ایسا تغیر و تبدل کہ ہر وہ شے جو باقی رہنے کے قابل نہیں رہتی، اسے مٹا دیا جاتا ہے۔

اور جس میں باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اسے مستحکم کر دیا جاتا ہے۔

(يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ ۖ) (۱۳/۳۹) مثلاً اُسے جاتا ہے جس کا نتیجہ منفیانہ (یا تخریبی) ہو۔ اسے قرآن کی

اصطلاح میں ”باطل“ کہا جاتا ہے اور قائم اسے رکھا جاتا ہے جس کا اثر تعمیری ہو۔ اسے ”حق“ کہتے ہیں۔
سورہ شوریٰ میں ہے:-

وَيَمْنَحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَيُحْيِي الْحَقَّ بِكَلِمَةٍ (۲۴/۴۲)

خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق تخریبی عناصر کو مٹا دیتا ہے اور تعمیری عناصر مستحکم کرتا ہے۔
کائنات میں یہ سلسلہ تغیر و تبدل، یہ عمل محو و تثبیت، کچھ ایسے غیر محسوس انداز سے عمل میں آ رہا ہے کہ سطحی سطح پر اس تماثلے تحول و تدرج سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ تبدیلیاں اتنے طول و طویل عرصوں کے بعد ظہور میں آتی ہیں کہ انسانی یادداشت کے لئے اس کا ریکارڈ رکھنا مشکل ہے۔ اس لئے محققین و مکتشفین علومِ طبیعی کو ان تدریجی انقلابات کے لئے خود صحیفہ فطرت کے اوراق و خزان و دفائنِ ارضی کے نقوش و آثار کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ قرآن نے کائنات کے ان تدریجی مراحل کے متعلق ایک اصول بیان کیا ہے جو اس بحث کا نقطہ ماسک ہے۔ وہ کہتا ہے:-

يَذَرُ الْأَمْزَجَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْجِجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ
مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ ۚ ذَٰلِكَ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ
الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۶-۵/۲۲)

اللہ ایک امر (اسکیم) کی تدبیر بندیوں سے پستیوں کی طرف کرتا ہے۔ (یعنی وہ ہناسخانہ قانونِ خداوندی سے اتر کر اپنے طبعی نقطہ آغاز کے مقام پر آ جاتی ہے) پھر وہ اسکیم (اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی) اس کی طرف بلند ہو جاتی ہے۔ ایسے طویل المیعاد عرصوں (یوم) میں جن کی مقدار تمہاری گنتی کے اعتبار سے ہزار ہزار سال ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ خدا جو ہر شے کی موجودہ اور آنے والی حالت سے باخبر ہے۔ جو ہر شے کی نشوونما کے لئے اسے ایک (PATTERN) عطا کرتا ہے۔ (ہیچم) اور پھر اسے اپنے نظام کی قوت سے تکمیل تک پہنچاتا ہے۔

یعنی مشیتِ ایزدی کے سامنے ایک اسکیم ہوتی ہے، جسے اس کی انتہائی پستی (نقطہ اولین سب سے پہلی منزل) سے شروع کیا جاتا ہے۔ پھر وہ اسکیم ان خاص قوانین کے ماتحت جو اس کے لئے متعین کئے جاتے ہیں، نشو و ارتقاء کے مراحل طے کرتی، اس قالب (رحم یا PATTERN) میں جو اس کی نمود اور پختگی کے لئے تجویز کیا جاتا ہے، اپنی تکمیل کے نقطہ آخری تک جا پہنچتی ہے۔ یہ مراحل بڑے بڑے بلے ”ایام“ (PERIODS) میں طے ہوتے ہیں۔

کہیں ہزار ہزار سال کا ایک ایک تدریجی مرحلہ، کہیں پچاس پچاس ہزار سال کا۔ (فِی یَوْمٍ كَانَ مَقْدَارُهُ خُمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ) (۷۰/۴) کارگہ مشیت کے ان عظیم المرتبت امور (SCHEMES) میں سے ایک اہم اسکیم انسان کی تخلیق بھی ہے یہی حکیم سر درست ہماری زیر نظر بحث کا محور ہے۔

انسانی بچہ کی پیدائش آج ہمارے نزدیک ایک ایسا عادی اور معمولی واقعہ بن چکی ہے جیسے سورج کا طلوع و غروب لیکن اسباب و علل کی کڑیوں میں جکڑا ہوا انسان جب اس کتاب **انسانی تخلیق** تخلیق کے اوراق کو پیچھے کی طرف اُلٹا ہے تو اس کی نگاہ استعجاب کا اس مقام پر جا کر رُک جانا ضروری ہے، جسے وہ اس سلسلہ تخلیق انسانی کی سب سے پہلی کڑی قرار دیتا ہے۔ اس وادی حیرت میں پہنچ کر وہ ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے کہ ”سب سے پہلا انسان“ کس طرح وجود میں آگیا۔ اس کا تیز بجا اور تعجب درست ہے۔ انسانی تحقیق و تفتیش کا حاصل، اس کے تمام انکشافات و ایجادات کی حقیقت، صرف اس قدر ہے کہ وہ کارگہ عالم کے مختلف پُرزوں کے اسباب و علل کی کڑیوں پر پڑے ہوئے پردوں کو اپنے مژگان کاوش سے اٹھا لیتا ہے لیکن جہاں اس سلسلہ دراز کی آخری کڑی آجاتی ہے، اس کی نگاہ جستس کے سامنے پردہ حیرت کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔ یہ مقام تیز و استعجاب انسانی علم و تحقیق کی نسبت سے متعین ہوتا ہے، یعنی جس قدر علم و دانش کی منازل آگے بڑھتی جائیں گی، اسی نسبت سے یہ نظام بھی آگے سرکتا جائے گا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ایک خدا فراموش مادہ پرست اور ایک حق شناس عبد مومن کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اول الذکر اس مقام سے آگے وادی حیرت کو اپنی ذہنی قیاس آرائیوں کی آماجگاہ بناتا ہے اور اس طرح خود بھی ٹھوکریں کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی راہ سے گم کرتا ہے لیکن ایک حکیم مومن وہاں پہنچ کر بلاتامل پکار اُٹھتا ہے کہ اس سلسلہ دراز کی ابتدا اس قادر مطلق کی اسباب فراموش مشیت اور علل نا آشنا صمدیت کی رہین منت ہے جو انسانی سلاسل اسباب و ذرائع سے مستغنی اور علائق و علل سے بے نیاز ہے۔ وہ علی وجہ البہیت اس حقیقت عظمیٰ کا اعلان کرتا ہے اور اس طرح حیرت و استعجاب کی وہ وادی، جو اس خدا فراموش محقق کی قیاس آرائیوں سے تیرہ و تار ہو چکی تھی، اس مرد خود آگاہ و خدا مست کی مشعل ایمان و شمع یقان سے جگمگا اٹھتی ہے۔

”سب سے پہلا انسان“ کس طرح وجود پذیر ہو گیا۔ یہ مقام تیز ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ انسان نے جب آنکھ کھولی تو اپنے گرد و پیش **سب سے پہلا انسان**

ایک نگار خانہ حیرت دیکھا۔ سطح ارض کی حدود فراموش و سقتیں، فضا ئے آسمانی کی ناپید کنار پہنائیاں، سامنے ایک خوفناک بحر متلاطم، دائیں بائیں لرزہ انگیز دیوہیکل سلسلہ کوہ اور ایک معلق و مہیب چھت، افق کے پار سے ہر صبح ایک انگارہ آتشیں کی نمود اور ہر شام شفق کی جوئے خونی میں اس کا غروب، محفل انجم کی شمع فروزاں، ہلکشاں کی گرد و مرمریں، چاند کا سا غرور۔ وہ اس طلسم جو شرابا کو دیکھتا، تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ وہ بھلا کیسے سمجھ سکتا کہ کائنات کا یہ مخیر العقول سلسلہ کیا ہے؟ زمین کہاں سے آئی ہے، پہاڑ کیسے پیدا ہو گئے ہیں؟ سورج کہاں سے آتا اور کہاں چلا جاتا ہے؟ یہ چاند، یہ تارے، یہ دریا، یہ سمندر کیسے پیدا ہو گئے۔ یہ سوالات بار بار اس کے سامنے آتے اور ہر بار اسے ایک نئی دنیا نے حیرت میں چھوڑ جاتے۔ وہ بے چارہ کیا سمجھ سکتا کہ

سبز و گل کہاں سے آئے ہیں؟

ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

اور جب وہ عام عالم آفاق کے متعلق کچھ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کی تخلیق کس طرح سے ہو گئی تو بھلا اس معتمہ کو کیسے سلجھا سکتا کہ ”سب سے پہلا انسان“ کس طرح پیدا ہو گیا؟ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لے کہ سب سے پہلے، کسی کسی طرح ایک مٹی کا پتلا بن گیا ہو گا جس میں جان ڈال دی گئی ہو گی اور پھر اس پتلی کی پسلی چیر کر اس میں سے اس کے لئے ایک بیوی پیدا کر دی گئی ہو گی اور یوں یہ سلسلہ آگے بڑھ گیا ہو گا۔ وہ بے چارہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا لیکن جب انسان اور آگے بڑھ کر اپنے عہد شعور کو پہنچا، تو اس کے زمانہ طفولیت کی یہ توجیہ اس کے لئے باعث طماننت اور وجہ شکیبائی نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے اضطراب نے کاوش تجسس و خلش تحقیق کی صورت اختیار کی اور اس علم الاشیاء کی مدد سے جو اس کے لئے وجہ اختیار بنایا گیا تھا، اس نے ان پچ در پچ رموز کی گرہ کشائی کی کوشش شروع کی اور رفتہ رفتہ اس کی تحقیقات نے اس نتیجہ کی صورت اختیار کر لی جسے

(THEORY OF ORGANIC EVOLUTION)

آج نظریہ ارتقاء

تفصیل طویل ہیں لیکن ان کا حاصل یہ ہے کہ

- ۱۔ صفحہ ارض پر زندگی (LIFE) کی ابتدا پانی سے ہوئی ہے۔
- ۲۔ پانی اور مٹی کے امتزاج سے زندگی کے جرثومہ اولین کو پیکر عطا ہوا۔
- ۳۔ زندگی کے یہ جراثیم مختلف نوعوں میں تقسیم ہو کر ایک درخت کی شاخوں کی طرح بڑھنے پھولنے لگے۔
- ۴۔ ان جراثیم کے پیکروں میں ہزار ہزار سال کے مراحل کے بعد مختلف تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔

۵۔ ان طویل المیعاد مراحل کو طے کر کے سلسلہ تخلیق اس منزل پر پہنچا جسے ”تخلیق بذریعہ تناسل“ کہتے ہیں یعنی حیوانی زندگی۔

۶۔ حیوانی زندگی اسی قسم کے غیر محسوس طویل المیعاد مراحل طے کرنے کے بعد منزل پر منزل انسانی پیکر میں جلوہ ریز ہوئی۔ اس طرح نوع انسانی کی ابتداء ہوئی۔

اب دیکھئے قرآن کریم اس سلسلہ میں کیا کہتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ تخلیق انسانی کی اسکیم کا آغاز ’درجہ جمادات‘ (طین۔ مٹی) سے ہوا۔

وَمِمَّا أَنْخَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ طِينٍ (۳۲/۷)

انسانی تخلیق کی ابتدا مٹی سے ہوئی۔

اس اجمال کی تفصیل قرآن کے دیگر مقامات میں موجود ہے لیکن میرے پیش نظر چونکہ استیعاب نہیں، اس لئے میں ان تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ صرف اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

اس منزل جمادات میں (جو اس سلسلہ کا نقطہ آغاز ہے) زندگی محو خواب تھی۔ (کنتم امواتا ۲/۲۸) اس کی بیداری پانی کے چھینٹے سے ہوئی۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ۵ (۲۱/۳۰)

اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے بنایا۔ کیا یہ لوگ پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

زندگی کی جل پری نے اپنی آنکھ پانی کی گہرائیوں میں کھولی۔ سائنس کی تحقیق

سرچشمہ حیات

اس نقطہ پر پہنچی ہے کہ حیات کے جراثیمہ اولین (PROTOPLASM)

کی ابتدا سمندر میں ہوئی ہے۔ اسی لئے اس میں اسی نوعیت اور اسی تناسب کے اطلاح (SALTS) پائے جاتے ہیں جیسے سمندر کے پانی میں۔ یوں تخلیق انسانی کا قافلہ وادی خاک سے منزل آب کی طرف منتقل ہوا۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ط وَكَانَ رُبُّكَ قَدِيرًا ۵ (۲۵/۵۴)

اور اللہ وہ ہے جس نے انسان کو پانی سے پیدا کیا۔ پھر اس کے رشتے اور ناتے بنائے اور تیرا

رب (ہر بات پر) قادر ہے۔

پانی اور مٹی کے ”غلاصہ“ کے امتزاج سے اس جراثیمہ نے خلیہ (CELLS) کی شکل اختیار کی۔ جس کے بیوی کو قرآن

کریم نے طین لازب (یکپڑ کی سی چپ چپی مٹی) سے تعبیر کیا ہے۔

إِنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِنْ طِينٍ لَّازِبٍ ۝ (۳۷/۱۱)

ہم نے انھیں طین لازب (چپ چپی مٹی) سے تخلیق کیا ہے۔

طین لازب | یہ طین لازب وہی ہے جو تالابوں کی تہ میں اور جوہڑوں کے کنارے دکھائی دیتی ہے۔ جب پانی سوکھ جاتا ہے تو یہ سیاہ رنگ کی (کالی بھنگ) مٹی بڑی سخت ہوجاتی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ۝ (۵۵/۱۴) (یز ۱۵/۲۶)

اور بلاشبہ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا جو سوکھ کر بجھنے لگتا ہے۔

پانی اور مٹی کی آمیزش سے جرثومہ حیات نے پیکر کی شکل اختیار کی۔ ان خلیات (CELLS) میں ایک لیس دار مادہ (NUCLEUS) زندگی کے تمام عظیم المرتبت امکانات اپنے اندر لئے ہوتا ہے، جیسے ایک ننھا ساینج ایک تناور درخت کو اپنے اندر سمیٹے نمودار شگفتگی کے لئے ہمہ تن اضطراب ہو۔ حیات کا نقطہ آغاز یہی نفس واحدہ (LIFE CELL) ہے جس سے شجر زندگی کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ اس "نفس واحدہ" سے جاندار مخلوق کی شاخیں پھوٹیں

شجر ارتقاء | اور ایک طویل القامت درخت کی طرح سطح ارض پر پھیل گئیں۔ ہر شاخ کو مخلوق کی ایک الگ نوع (SPECIES) سمجھتے جو بڑھتی، پھولتی پھلتی اپنی اپنی سمت

میں، نشو و ارتقاء کے منازل طے کئے جا رہی ہے۔ ان تمام شاخوں میں سر بلند وہ شاخ ہے جو اس "نفس واحدہ" کے نچے سے بیج سے مختلف مراحل طے کرتی، درجہ بدرجہ، قدم بہ قدم، جادہ بہ جادہ، منزل بہ منزل انسانی پیکر تک پہنچتی ہے۔

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۚ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ۚ وَالشَّٰهَدَةُ
أَنْبَتَتْكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ۚ (۱۷۲، ۱۳۲، ۱۳۱)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ سے وقار کے آرزو مند نہیں ہوتے اور یقیناً اس نے تمہیں مختلف مراحل سے گزار کر پیدا کیا ہے اور تمہیں زمین سے اگایا ہے۔ ایک طرح کا اگانا۔

اس خورد بینی "نفس واحدہ" سے سلسلہ تخلیق آگے بڑھا۔ اس نشاۃ اولیٰ کے بعد وہ "نفس واحدہ" مختلف منازل میں ٹھہرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ وہ اس پیکر بشریت کے مقام تک پہنچا، جو اس حیات ارضی میں اس کی جائے

قرار ہے۔

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَوْذَعٌ وَمُسْتَوْدَعٌ ط قَدْ
فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ۝ (۶/۹۹)

وہی ہے جس نے تمہیں نفس واحدہ سے نشوونما دی۔ پھر تمہارے قرار پانے کی جگہ (مستقر) اور سپردگی کا مقام (مستودع) ہے۔ بلاشبہ ہم نے اپنی آیات سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے لئے تفصیل کے ساتھ بیان کر دی ہیں۔

اس انتقال مکانی، یعنی ایک مستقر سے دوسری منزل تک پہنچنے میں، قرن ہا قرن (الف سنتہ) گزر گئے اور یوں جراثیم حیات (LIFE CELLS) کے ابتدائی سرعہ کے بعد وہ مقام آگیا جہاں تخلیق کا سلسلہ بذریعہ تناسل شروع ہوا۔

ثُمَّ جَعَلْنَا نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ ۝ (۳۲/۸)

پھر اس کی (انسان کی) نسل کو حقیر پانی کے خلاصہ سے بنایا۔

یعنی ان تمام سابقہ طبقات سے گزار کر ہزار ہا سال کی تشکیل و تدبیر،
حیوانی زندگی کی ابتداء | ساخت و بافت کے بعد، اس کا سلسلہ ایک حقیر پانی کے پتھر سے جاری رکھا، یعنی حیوانی زندگی کا سلسلہ افزائش نسل۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ۖ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ

(۲۳/۱۲-۱۳)

اور دیکھو واقعہ یہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے نطفہ سے بنایا ایک ٹھہر جانے اور دباؤ پانے کی جگہ میں۔

قافہ حیات کی اس منزل میں جو مخلوق پیدا ہوئی، اس میں رینگنے والے اور پاؤں کے بل چلنے والے حیوانات سب شامل ہیں۔

ما غور فرمائیے قرآن کریم نے جائے قرار کو صرف امانت گاہ (مستودع) کہہ کر کس طرح اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ کیا ہے کہ موجودہ پیکر بشری میں حیات بطور امانت رکھی گئی ہے۔ حیات اس کی پیدا کردہ نہیں، نہ ہی اس کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِّن مَّاءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّن يَّمْشِي عَلَىٰ بَطْنِهِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّن يَّمْشِي عَلَىٰ رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّن يَّمْشِي عَلَىٰ أَرْبَعٍ ط (۲۷/۲۵)

اللہ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ ان میں سے وہ ہے جو اپنے پیٹ کے بل چلتا ہے اور ان میں وہ بھی ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے اور ان میں سے وہ بھی ہے جو چار پاؤں پر چلتا ہے۔

صرف رینگنے اور پاؤں کے بل چلنے والے ہی نہیں بلکہ پرندے بھی، یعنی وہ تمام مخلوق جس کا سلسلہ افزائش بذریعہ تناسل آگے بڑھتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ زندگی کی اس بڑی شاخ سے بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں ادھر ادھر پھوٹیں۔ اس لئے اس حد تک یہ مختلف اقسام کی مخلوق دراصل ایک ہی نوع کی مختلف شکلیں اور ایک ہی قافلہ کے مختلف افراد ہیں۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَيْرٍ يُطِيرُ بِحَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَلُكُمْ ۚ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ۝ (۶/۳۸)

اور زمین پر چلنے والا کوئی حیوان اور ہوا میں پروں سے اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں، جو تمہاری سی طرح گروہ (امت) نہ ہو۔ اور ہم نے نوشتہ (الکتاب) میں کوئی بھی بات فرو گذاشت نہیں کی۔ پھر (سب) اپنے رب کے حضور میں جمع کئے جائیں گے۔

نر و مادہ کا امتیاز | یہ وہ مقام ہے جہاں ذکور و اناث (نر اور مادہ) کا امتیاز محسوس طور پر سامنے آتا ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّن تَرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ أَزْوَاجًا ط (۳۵/۱۱)

اور اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر لطفہ سے، پھر تمہیں جوڑے بنادیا۔

یعنی اس مقام پر غلیاتِ حیات (LIFE CELLS) میں جنسی تخلیق (SEXUAL REPRODUCTION)

نمایاں ہو گئی۔ یہ جرثومے (GERM CELLS OR GAMETES) دوصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک (OVUM)

یعنی مادہ کا غلیہ اور دوسرا (SPERMATOZOON) نر کا غلیہ۔ یعنی ایک جرثومہ زندگی، ذوقِ تخلیق سے نر اور مادہ کے غلیوں میں بٹ گیا۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (۴/۱۸۹)

اللہ وہ ہے جس نے تمہیں نفسِ واحد (جرثومہ حیات) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔
وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا ذَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ (۵۱/۴۹)
اور ہم نے ہر شے کے جوڑے بنائے (اور ان امور کا ذکر اس لئے کیا کہ تم) اس سے بھولی ہوئی
حقیقتوں کی یاد تازہ کر سکو۔

اس نفسِ واحدہ نے پیکرِ حیوانی میں بھی قرن ہا قرن گزارے۔ ان اودار میں ”انسان“ ابھی قابلِ ذکر شے نہ تھا۔
كُلُّ اِنْسَانٍ عَلٰى الْاِنْسَانِ جَئِنَّمِنَ الدَّهْرِ لَكَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا ۝ (۷۱/۷۱)
کیا انسان پر وہ زمانہ نہیں گزر چکا، جب یہ قابلِ ذکر شے نہ تھا۔

پیکرِ انسانی | حیوانی زندگی کی ان تمام شاخوں میں سے ایک شاخ اور پرکواں بھری۔ یہ پیکرِ انسانی
کی شاخ تھی۔ پیکرِ حیوانی کو تدریج سنوارا گیا۔ اسے حشو و زوائد سے پاک کر کے اس

کے لطیف و نازک جوہروں میں جلادی گئی اور یوں عروسِ حیاتِ حریمِ بشریت میں جلوہ ریز ہوئی۔

الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ۝ (۸۲/۷۷)

وہ ذات جس نے تجھے پیدا کیا۔ پھر (ہر طرح) اسے درست کیا۔ پھر (اعضاء و جوارح میں) تناسب
پیدا کیا۔

پھر اسے احسنِ تقویم عطا فرمائی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ (۹۵/۷۷)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین میت میں پیدا کیا۔

یہ احسنِ تقویم کیا ہے؟ اس بہترین میت میں کون سی امتیازی خصوصیت ہے؟ وہ کون سا جوہر خصوصی ہے
جس کی بنا پر انسان سلسلہ ارتقاء کی سابقہ کڑیوں سے الگ تھلگ حیثیت کا مالک بن گیا؟ اسے قرآن کریم نے ایک
لفظ میں بیان فرمایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہی لفظ اس کی امتیازی خصوصیت کو ایک نمایاں جامعیت سے ادا کر
سکتا ہے۔ فرمایا۔ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوحِی ۝ (۳۲/۹) ”پھر اسے درست کیا اور اس
میں اپنی روح پھونکی“ یعنی شجر ارتقاء کی اس شاخِ بلند و بالا کو ہر طرح سے درست کیا۔ اس میں مناسب
صلاحیت و استعداد پیدا کی۔ اسے سنوارا اور آگے بڑھایا اور جب اس میں یہ صلاحیتیں پیدا ہو گئیں تو اسے درجہ
حیوانیت سے آگے بڑھا کر اس میں خدائی قوت کا شمع ڈالا۔ اب وہ دیکھنے، سننے، اور سمجھنے سوچنے والا انسان بن گیا۔

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (۳۲/۹)

شرفِ انسائیت

اور اس نے تمہارے لئے سمع، بصر اور قلب بنایا لیکن تمھوڑے میں جو شکر گزار ہیں۔
یہ ”روحِ خداوندی“ کیا ہے جس کی کرشمہ سازیوں نے ایک پیکر آب و گل کو کائنات کا جانِ مدعا بنا دیا؟ اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں..... اس دقت صرف اتنا دیکھئے کہ اس ”نفخِ روح“ سے حاصل کیا ہوا؟ قرآنِ کریم کے الفاظ میں اس سے سمع و بصر و قلب عطا ہوا۔ کہنے کو تو یہ تین لفظ ہیں لیکن غور سے دیکھئے تو شرف و مجدِ انسائیت کی پوری کی پوری دنیا ان تین گوشوں میں سمٹ آئی ہے۔ دنیا میں یہی ذرائعِ علم ہیں اور علم ہی وہ امتیازِ خصوصی ہے جس نے انسانی زندگی کو حیوانی زندگی سے نمایاں طور پر الگ کر دیا ہے۔ اس سمع و بصر سے انسان کن ذمہ داریوں کا حامل بن جاتا ہے۔ یہ پھر قرآن ہی کی ایک آیتِ مقدسہ میں دیکھئے، فرمایا:-

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَشْجَاءٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا
إِنَّا كَذِبْنَاهُ الْمَسِينِ إِذَا مَشَا كَرًّا وَارْتِمَا كَفُورًا۔ (۲۱-۳/۷۶)

یقیناً ہم نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا جو باہمی مل جانے والا ہوتا ہے۔ (پھر اسے ہم مختلف حالتوں میں متغیر و متبدل کرتے رہے۔) (حتیٰ کہ) اسے سفے اور دیکھنے والا بنا دیا۔ اسے (پھر) ہدایت کا راستہ دکھا دیا۔ خواہ اسے قبول کرے یا اس سے انکار کر دے۔

یہ ہے وہ سب سے بڑا امتیاز جو انسان کو حیوانی زندگی سے الگ کرتا ہے، یعنی عقل و شعور اور اس کی بنا پر اختیار و ارادہ۔ اس مقام

پر پہنچ کر سلسلہ ارتقاء کی یہ کڑی اپنی سابقہ کڑیوں سے ممتاز ہو جاتی ہے۔ انسانی پیکر اپنے سلسلہ کے گزشتہ طبقات کی استعداد اور صلاحیتوں کا حاصلِ جمع (SUM-TOTAL) نہیں، بلکہ یہاں پہنچ کر ان تمام صلاحیتوں اور جوہروں میں ایک اور ہی قسم کی تبدیلی پیدا ہوئی جو ارتقاء کے اس سلسلہ سے بالکل مختلف تھی جو اس وقت تک چلا آ رہا تھا۔ اس تبدیلی کا نتیجہ انسانی اختیار و ارادہ ہے جس سے بعض کائنات میں توجہ اور زندگی کی جوڑے رواں میں تلاطم برپا ہے۔ اختیار و ارادہ کے بغیر یہ دنیا پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں کا بے رنگ مجموعہ اور درندوں، پرندوں، پرندوں کا بے کیف مسکن (ZOO) رہتی۔ حسن کی ضیائے تابندہ اور عشق کی آتش سوزندہ اس کے نصیب میں نہ ہوتی۔ یہ سب ”نفخِ روح“ کی سحر کاریاں ہیں جن سے یہ دیرانہ رنگ و تعطر کا کاخانہ بن گیا۔ یہی وہ ”نفخِ روح“ تھی جس

سے یہ آدم خاکی مسجود ملائکہ قرار پایا۔

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝ فَادَا سُوۡیَتَهٗ
وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعَاۤءُکَ سَلٰجِدٍ ۝ (۴۱ - ۴۲/۳۸)

جب تیرے رب نے فرشتوں نے کہا کہ میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں۔ پھر جب میں اسے
(مختلف مراحل ارتقاء کے بعد) سنوار دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدہ
میں گرجانا۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے جواب اس سوال کا کہ ”سب سے پہلا انسان“ کس طرح وجود میں آگیا؟ کیسے کہ عقل و علم،
دانش و بینش اور علوم و فنون متعلقہ اس سے کچھ زیادہ یا الگ بھی پیش کر سکے ہیں اور یہ تبیان حقیقت ہوا کس زمانے میں؟
اس وقت جب دنیا سائنس اور اس کے مکتشفات سے آشنا تک نہ تھی۔ آگے بڑھنے سے پیشتر ایک مرتبہ پھر
نگہ بازگشت ڈالئے اس آئیہ مقدمہ پر جس سے اس موضوع کی ابتداء ہوئی ہے۔ نگہ ڈالئے اور غور کیجئے کہ یہ پوری کی
پوری داستان طول طویل کس حسن و اعجاز نگاری سے چند جملوں میں سمیٹ کر رکھ دی گئی ہے۔
ارشاد ہے ۱۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ السَّمٰوٰتِ اِلٰی الْاَرْضِ ثُمَّ یُعْرَجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ ۭ کَانَ
مِۡقَدٰۤاۡرُہٗا اَلْفَ سَنَۃٍ ۭ تَحۡسَبُوۡنَ ۙ ۝ الَّذِیْۤ اَحۡسَنَ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ وَبَدَآءَ خَلۡقَہٗ
اِلَّا نَسٰنٍ مِّنْ طِیْنٍ ۭ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَہٗ مِنْ نُّسْلَہٖ مِّنۡ تَّآءُرٍ مَّہِیۡنٍ ۭ ثُمَّ
سَوَّیَہٗ وَنَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوۡحِہٖ ۭ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَالْاَبۡصَارَ وَ
الْاَفۡۡۡۡۡۤیۡۡۤدَۃَ ط قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ ۝ (۵ - ۹/۳۲)

اللہ اپنے امر (ایکیم) کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے۔ پھر وہ ایکیم (اپنے ارتقائی مراحل
طے کر کے) اس کی طرف بلند ہو جاتی ہے۔ ایک (ایک) یوم (منزل) میں جس کی مقدار تمہاری گنتی کے
لحاظ سے ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے۔ مثلاً وہ ذات جس نے اپنی مخلوق میں ٹھیک ٹھیک تناسب
پیدا کیا اور انسان کی پیدائش کی ابتدا مٹی سے کی۔ پھر اسکی نسل کو حقیر پانی کے
غلامہ سے بنایا۔ پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے تمہارے لئے
سماعت و بصارت اور قلب بنایا لیکن بہت تھوڑے (انسان) ایسے ہیں جن کی ساعی شمار ہوتی ہیں۔

اس سلسلہ ارتقاء سے نوع انسانی وجود پذیر ہوئی۔

لیکن قرآن کریم تخلیق کائنات اور تشکیل انسانی (سلسلہ ارتقاء) کے ان اصولوں کو اس لئے بیان نہیں کرتا کہ اسے طبیعیات کے طالب علموں کے لئے نصاب کی کتاب بننا تھا۔ ان تفصیلات سے اس کا مقصود کچھ اور ہے۔ وہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد انسان سے کہتا ہے کہ ذرا غور کرو کہ کائنات میں محو و تثبیت اور فنا و بقا کا کون سا اصول کام کر رہا ہے اور کس جبروت و اقتدار سے کام کر رہا ہے۔ یہ ایسا بطش شدید و اخذ و میل کا قانون ہے جس کی گرفت سے کوئی باہر نہیں جاسکتا۔ (۸۵/۱۳ + ۸۳/۱۴)

وہ قانون ارتقاء کے اس بنیادی اصول کو مختلف گوشوں اور متنوع پہلوؤں سے دل نشیں کرتا ہے کہ اس کا رگہ سعی و عمل میں وہی نوع باقی رہ سکتی ہے جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہو۔ (جس کے اعمال صالح ہوں) وہی آگے بڑھ سکتی ہے جو اپنے اندر بڑھنے کی استعداد پیدا کرے۔ وہ دیگر انواع کی مثال دے کر اس سے خود انسانی زندگی پر استنبہاد کرتا ہے کہ ارتقاء کے اس عظیم نشان و رخت کو دیکھو اور غور کرو کہ کتنی شاخیں تھیں جو سوکھ سوکھ کر گر گئیں، کتنے پھول تھے جو مرجھا مرجھا کر زمین پر آئے اور راستہ چلنے والوں کے پاؤں تلے آکر مسلے گئے۔ اس کے برعکس کتنی شاخیں ہیں جو سرسبز و شاداب ہوئیں، کیسے کیسے شکستہ اور نورستہ پھول لائیں اور کیسے کیسے نفیس و لطیف پھل پیدا کئے۔ وہ کہتا ہے کہ فطرت کے اس قانون پر غور کرو اور سوچو کہ اقوام و ملل گزشتہ کا کیا حشر ہوا؟ اس کا ارشاد ہے کہ مختلف انواع کی طرح قوموں کی موت و حیات کا بھی یہی قانون ہے جو قوم زندگی کی اہل نہیں رہتی، فنا ہو جاتی ہے۔ اسے کوئی رعایت نہیں دی جاتی۔ اس فیصلہ (یعنی ان کے اعمال کے ظہور نتائج) میں ذرہ بھر تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝ (۸۴/۷)

اور ہر امت (گروہ، جماعت، نوع) کے لئے (ظہور نتائج) کا وقت معین ہے۔ جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر ایک ساعت کی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔

اس اصولی نکتہ کو بیان کر دینے کے بعد اگلی آیت میں یہ بتلویا کہ زندہ اور باقی رہنے کے لئے کیا قانون مقرر ہے

ارشاد فرمایا:-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي خَلَقْتُكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (۲۱/۱)
 اے انسان! میں نے تم کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے تاکہ تم سے ڈرنا شروع کرو۔
 اے اولادِ آدم! جب کبھی ایسا ہو کہ میرے پیغمبر تم میں پیدا ہوں اور میرے قوانین سے تمہیں
 مطلع کریں، سو اس وقت جو ان قوانین کی نگرداشت کرے گا اور (یوں) اپنے اندر زندہ رہنے
 اور آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کرے گا تو اس پر اسٹنٹ اور زوال پذیر ہو جانے کا کوئی غم اور
 اندیشہ نہ ہوگا۔

یہ تو ہیں وہ جو باقی رہیں گے، آگے بڑھیں گے، جنہیں ہلاکت و بربادی کا اندیشہ نہ ہوگا۔ برعکس ان کے
 وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
 النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (۲۱/۲۶)
 لیکن جو لوگ ان قوانین کو جھٹلائیں گے اور ان سے سرکشی برتیں گے تو وہ لوگ اہل جہنم ہوں گے
 جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

غور فرمائیے۔ پہلی آیت میں قوموں کی موت و حیات
قوموں کے عروج و زوال کے اصول کا ایک اصولی قانون بیان فرمادیا۔ اس کے بعد اس
 کی وضاحت کر دی کہ ہلاکت سے مامون اور بربادی سے مصئون و بے خوف رہنے کا کیا طریقہ ہے اور وہ کون سا
 نظام ہے جس پر چل کر انسان امن و سلامتی کی جنت میں پہنچ سکتا ہے۔ اس وقت اس نظام کی تشریح کا موقعہ نہیں۔
 یہاں صرف اتنا دیکھئے کہ قرآن کریم کی رو سے اس نظام کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس ضابطہ کو نصب العین حیات بنایا
 جائے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کو ملتا ہے۔ وہ نظام جس کے
 مطابق زندگی بسر کرنے کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قوم میں وہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی جس سے وہ فنا و برباد کر دینے
 والی مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے اور اسے کسی قسم کا خوفِ ہلاکت و حزنِ بربادی نہ رہے۔ لانخوف علیہم
 ولا هم يحزنون ۝ اگر وہ ایسا نہ کرے گی تو خدا کا قانون استخلاف و استبدال (LAW OF SUCCESSION

AND SUBSTITUTION) اپنا اہل فیصلہ کر دے گا اور اس قوم کی جگہ دوسری قوم آجائے گی۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ إِنْ يَشَاءْ يُدْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْكُمْ
 بَعْدَكُمْ مَا يَشَاءُ ۚ كَمَا أَنْشَأَكُم مِّنْ ذُرِّيَّتِهِ قَوْمٍ آخَرِينَ ۝ (۳۵/۱۶-۱۷/۱۹-۶/۱۳۳)
 (۳۵/۱۶-۱۷/۱۹-۶/۱۳۳)

اور (دیکھو) تیرا پروردگار بے نیاز ہے۔ (اس لئے وہ اپنے قوانین کے نفاذ میں کسی کا محتاج نہیں اور کسی سے دبتا نہیں) اور رحمت والا ہے۔ اگر وہ چاہے (تو اپنے قوانین مشیت کے ماتحت تمہیں ہٹا دے اور تمہارے بعد اس قانون مشیت کے مطابق جس قوم کو چاہے تمہارا جانشین بنا دے۔ جس طرح اس نے ایک دوسری قوم کی ذریت سے تمہیں اٹھا کھڑا کیا ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

وَإِنْ تَشْتَوُوا يُغَيِّرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۚ اللَّهُ جَلِيلٌ عَلِيمٌ

(۲۴/۳۸) (نیز ۵۶/۶۱، ۷۱/۷۲)

اور اگر تم نے (ان قوانین سے) سرکشی اختیار کی تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا اور وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ (بلکہ تم سے بہتر ہوگی۔ اسی لئے وہ تمہاری جگہ لے گی۔) معنی آتش نفس موسیقار کی طرح، ایک قوم کی راکھ کے ڈھیر سے دوسری قوم وجود کوش ہوتی ہے۔ ٹٹنے والی توپیں مٹ جاتی ہیں اور باقی رہنے والی ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

چوں جہاں کہنہ شود پاکست بسوزند اورا - وز ہماں آب و گل ایجاد جہاں نیز کنند

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، اس نکتہ کی تشریح کا یہ موقع نہیں کہ وہ نظام جس سے قوموں کو ثبات و استحکام حاصل ہوتا ہے، اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں لیکن اس ضمن میں ایک اصولی گوشہ ایسا ہے جس کی طرف اشارہ کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ مغرب کے نظریہ ارتقاء کی رو سے بقا (SURVIVAL) کے لئے اصلح (FITTEST) ہونا ضروری ہے لیکن قرآن کی رو سے قانون بقا و استحکام کے لئے اصلح کے ساتھ ساتھ انفع ہونا بھی ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بقا اس کا حصہ نہیں جو اپنی ذات میں باقی رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ یہ سعادت اس کی "قسمت" میں آتی ہے جو اپنی ذات میں محکم و خود گیر ہونے کے بعد انواع انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع رساں ہو۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ۔

وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَمَا شَاءَ اللَّهُ ۚ عَالِمُ الْغُيُوبِ (۱۳/۱۷)

یاد رکھو! کرۂ ارض میں قیام و بقا اس کے لئے ہے جو انواع انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع پہنچانے والا ہے۔

کے نظریہ نے اقوام یورپ کو یہ سبق دیا کہ جو

(SURVIVAL OF THE FITTEST)

بقا الاصلح

قوم سب سے زیادہ قوت سمیٹ لے گی اور رزق کے سرچشموں کو اپنے لئے وقف کر لے گی (خواہ اس سے باقی اقوام کے جسم میں خون کا قطرہ تک بھی باقی نہ رہے) زندگی اور اس کی شادابیاں اس کے حصے میں آئیں گی۔ انھوں نے اس قانون پر عمل کیا اور اس میں شبہ نہیں کہ اس سے ان اقوام پر غلبہ و تسلط حاصل کر لیا جو قوت تخلیق سے عاری ہو چکی تھیں اور جن میں زندگی کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی لیکن چونکہ بقا والا صلح کے قانون سے بقائے دوام حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ (اس سے حیاتِ خلد کا وہ فریب حاصل ہو سکتا تھا جسے ابلیس نے آدم کے لئے وجہ فسونِ نظر بنایا تھا)، اس لئے تھوڑے ہی عرصے کے بعد دنیا نے دیکھ لیا کہ ان اقوام کی اصلحیت (FITNESS)

کس قدر بے بنیاد ثابت ہوئی۔ قرآن کی رو سے زندگی کا قانون بقا والا نفع ہے۔ یعنی جو نظام نوع انسان کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہو اسی کو باقی رہنے کا حق حاصل ہے۔ دنیا، مغرب کے قانون بقا والا صلح کا تجربہ کر چکی ہے اور اب اس نظام کی تلاش اور انتظار میں ہے جو خود اپنی ذات ہی میں اصلح نہ ہو بلکہ نوع انسان کے لئے بھی نفع ہو۔ قرآن کا مقصود دنیا میں اسی نظام کی ترویج و تنفیذ بھی تھا، جسے میں اپنی تحریروں میں "نظام ربوبیت" سے تعبیر کرتا چلا آ رہا ہوں۔ انسانیت کا مستقبل اسی قوم کے ہاتھوں میں ہو گا جو اس نظام کی داعی اور حامل ہوگی۔

قانون ارتقاء کی رو سے وہی نوع آگے بڑھ سکتی ہے، جس کی مضر کی صلاحیتیں اس

نظام ربوبیت

قدر نشود نما حاصل کر لیں کہ وہ تجربی قوتوں کی ممانعت کر سکنے کی اہل ہو جائیں۔

نظام ارتقاء میں یہ وہ بنیادی اصول ہے جس سے کسی کو رعایت نہیں مل سکتی۔ انسانی معاشرہ میں یہ استعداد صرف نظام ربوبیت سے حاصل ہو سکتی ہے جس میں افراد معاشرہ کے مضر جوہروں کی اس قدر آبیاری ہو جاتی ہے کہ وہ یا س و قنوط (ابلیسیت) کی تمام تجربی قوتوں پر غلبہ پا کر زندگی کی بشارتوں سے بہرہ یاب ہو جاتے ہیں۔ خاک کے ذرے اپنے تدریجی مراحل طے کر کے بیکہ انسانی میں جلوہ بار ہو گئے۔ اس منزل تک قانون ارتقاء طبعی قوانین کے تابع چلتا تھا۔ ڈارون اور اس کے متبعین کی یہ غلط نگہی تھی کہ انھوں نے عالم انسانی کو بھی اسی لائحہ سے ہانکنا چاہا، حالانکہ کاروانِ حیات کو وادیِ انسانیت میں پہنچ کر جدا گانہ قوانین کی مشعل ہدایت دی گئی تھی۔ ایک حیوان کی زندگی یکسر انفرادی ہے اور وہ انفرادی طور پر اپنے طبعی تقاضوں (کھانے پینے) کی تسکین سے زندہ رہ سکتا ہے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے لیکن انسان کی زندگی انفرادی زندگی نہیں بلکہ معاشرتی زندگی ہے اور اس کے تقاضے حیوانی زندگی کے انفرادی تقاضوں

سے مختلف ہیں۔ یہ وہ عظیم قدر اہم، لطیف اور مبینی علی الحقیقت فرق ہے، جسے قرآن نے کفر و ایمان اور جنت و جہنم کے فرق سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

إِنَّ اللَّهَ يَخْلُقُ خَلْقًا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ (۲۲/۱۴)

یقیناً اللہ ان لوگوں کو جنہوں نے اس کے عطا فرمودہ نظام و قوانین کو نصب العین حیات بنالیا اور پھر ان کی روشنی میں ہمواریاں پیدا کرنے والے کام کئے، ایسے معاشرہ میں داخل کرے گا جس کی مثال ایسے باغات کی سی ہے جن کے میچے نہریں جاری ہوں تاکہ ان کی شادابیوں اور سرسبز یوں میں کبھی کمی نہ آئے اور اس کا ہر پودا ٹر بار ہو۔ ان کے برعکس، وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَيَسْتَمْتُونَ وَيَا كُنْ لَنْ كُنْ لَنَا كُلُّ الْأَنْعَامِ وَالنَّارُ مَشْوَى تَتَلَوْنَهَا (۲۴/۱۲) جو لوگ اس نظام سے انکار کرتے ہیں، وہ اس قسم کا انفرادی نظام قائم کرتے ہیں جس میں سامانِ زیست سے تمتع اور اکل و شرب بالکل اس انداز سے ہوتا ہے جس طرح حیوانی زندگی کا تقاضا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا معاشرہ جہنمی ہے کہ اس میں بالیدگی اور نشو و نما کی تمام صلاحیتیں جھلس کر رہ جاتی ہیں۔ اس سے اگلی آیت

میں ہے۔

وَكَيْفَ يَكُونُ لِلَّذِينَ هُمْ أَشَدُّ قُوَّةً مِنْ قُوَّةِ رَبِّكَ إِلَهٌ مِثْلُ مَا هُمْ أَهْلُكُمْ

فَلَا تَأْخُذْ بِهِمْ ۝ (۲۴/۱۳) نیز ۲۸/۷۸ - ۳۰/۹ - ۳۵/۳۳

اور کتنی ایسی بستیاں ہیں جو قوت میں ان لوگوں سے بڑھ کر تھیں جنہوں نے (اے رسول!) تجھے باہر نکال دیا ہے۔ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ سو کوئی ایسا نہ ہو جو ان کی شادابی کا سامان پیدا کر دیتا۔

اس لئے کہ ان تمام قوموں نے اپنے معاشرہ کو حیوانی قانون ارتقاء پر قائم رکھا جس میں بقا کی حیثیت

نہیں ہوتی۔ لہذا قانون خداوندی کے مطابق ان کی ہلاکت مقینی تھی۔ اس لئے کہ

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ يَتِيمَةٍ مِنْ رَبِّهِ كَمَنْ زُرِّيَتْ لَهُ سُوءٌ عَلَيْهِ وَأَتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ

(۲۴/۱۴)

جو قوم اپنے نشو و نما دینے والے کے واضح قوانین کی حامل ہو، ان جیسی کبھی نہیں ہو سکتی جن کے اعمال معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کریں اور وہ ایسے مقاصد کے پیچھے چلیں جو پستی کی طرف لے جانے والے ہوں لیکن یہ اعمال و مقاصد انہیں دکھائی دیں بڑے خوش آئند (کیونکہ وہ سمجھ

رہے ہوں کہ یہ اعمال ان کی بقا اور استحکام کے کفیل ہیں۔

انسانی زندگی میں عروج و زوال، ترقی و تنزل، صعود و ہیبوط، آگے بڑھنے اور رک جانے اور رفتہ رفتہ فنا ہو جانے کا یہی اٹل قانون ہے۔ اسی قانون کے مطابق امتوں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے رہے ہیں اور آج بھی ہو رہے ہیں۔ جس قوم نے ایسا نظام قائم کر لیا جو نوع انسانی کے لئے نفع ہو (یعنی ان کی رلوبہتیت کا کفیل) وہ ارتقاء حیات میں ایک منزل آگے بڑھ گئی۔ اسی منزل کا نام جنت ہے۔ یہ نظام صرف قرآن کے متعین کردہ خطوط پر متشکل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی صورت نہیں لیکن جو قوم نہ اپنی ذات کے لئے اصلح ثابت ہوئی نہ نوع انسانی کے لئے نفع، اس کی نشوونما کی تمام صلاحیتیں جھلس کر رہ گئیں۔ اُولَئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (58/18)

مندرجہ صدر مضمون پڑھ کر ایک صاحب نے لکھا۔

تکمّل

آپ نے لکھا ہے کہ انسان سلسلہ ارتقاء کی اوپر کی کڑی ہے۔ ارتقاء کا قانون یہ ہے کہ ایک علت (CAUSE) سے ایک معلول (EFFECT) پیدا ہوتا ہے اور یہ سلسلہ علت و معلول مسلسل آگے چلا جاتا ہے۔ چونکہ انسان کی ارتقاء (بقول آپ کے) مادہ سے ہوئی ہیں لہذا اس سے ظاہر ہے کہ انسان میں مادی تغیرات سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ مادہ پرست بھی یہی کہتے ہیں یہ کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

اگر یہ ارتقاء مادی ہے تو انسان کا مزید ارتقاء بھی مادی ہونا چاہیے۔ کیا صراطِ مستقیم پر چلنے کے یہی معنی ہیں؟ یعنی جس خط پر اس وقت تک ارتقاء ہوتا چلا آیا ہے اسی پر آگے ارتقاء ہو۔

اس کا جواب حسب ذیل دیا گیا تھا۔ آپ نے غالباً قانون ارتقاء کے طبعی کا پورا پورا مطالعہ نہیں کیا۔ اس قانون کا اصول یہی نہیں کہ ایک علت سے اس قسم کا معلول پیدا ہو جاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی شکل میں جاری رہتا ہے۔ یہ تصور نظریہ ارتقاء کے ابتدائی دور کی پیداوار ہے۔ بعد میں سائنس کی مزید تحقیقات نے یہ بتایا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک علت (CAUSE) اپنے سلسلہ کی کتنی ہی کڑیاں پھاند کر کسی ایسے معلول (EFFECT) تک جا پہنچتی ہے۔ جس کا پہلے تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ نتیجہ بالکل الوکھا اور یکسر غیر متوقع ہوتا ہے۔ اس نظریہ کا نام فجائی ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) رکھا گیا ہے۔ نباتات میں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ

ایک ہی قسم بچ سے الگ الگ قسم پھول پیدا ہو جاتے ہیں۔ انہیں اصطلاح میں (SPORTS) کہتے ہیں یہ واقع بڑا نادر الوقوع ہوتا ہے۔ اس لئے ارباب علم و تحقیق اس قسم (SPORTS) کی تلاش میں رہتے ہیں۔ انسانوں میں ایک فطین یا نابغہ (GENIUS) کی پیدائش اسی قسم (SPORTS) میں شمار کی گئی ہے چنانچہ اس باب میں (HOGBEN) لکھتا ہے :-

تیس سال کے گہرے تجربے نے اس امر کے لئے بین ثبوت ہم پہنچا دیا ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر مخلوط نسل کے انسانوں کے اندر اس قسم افراد پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن کے خصائص اپنے آباؤ اجداد سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ ان افراد کو (MUTANTS) یا (SPORTS) کہتے ہیں۔

(THE NATURE OF LIVING MATTER)

اس قسم ارتقاء سے جو چیز وجود میں آتی ہے، وہ اپنی سابقہ کڑیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ سائنس کی تحقیقات نے ایسی اشیاء کی تخلیق اور وجود کا پتہ تو لگایا ہے لیکن اس کے متعلق وہ کچھ نہیں کہہ سکی کہ یہ ہوتا کیسے ہے؟ چنانچہ پروفیسر (TAYLOR) اس باب میں لکھتا ہے :-

ان تمام اسباب و علل کا جن سے کوئی شے وجود پذیر ہوتی ہے، ہر ممکن محاسبہ کر لینے کے بعد بھی یہ حقیقت باقی رہ جاتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اپنے نشو و نما کے بعد یہ شے ایک ایسی خصوصیت کی حامل بن جائے جو ان عناصر میں کہیں بھی موجود نہ ہو، جن سے یہ شے مرکب تھی۔ یہ خصوصیت ایسی ہوتی ہے کہ ان تمام عناصر کا علم ہو جانے کے بعد بھی اس نرالی خصوصیت کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

(EVOLUTION IN THE LIGHT OF MODERN KNOWLEDGE)

ہمارے زمانہ میں اس فجائی ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) کا سب سے بڑا امام لائیڈ مارگن ہے۔ وہ اپنی کتاب میں (جو اسی نام پر ہے) لکھتا ہے :-

اگر یہ پوچھا جائے کہ جس چیز کو تم (EMERGENT) کہتے ہو وہ بالآخر ہے کیا؟ تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے نئے ہوتے ہیں تو اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ ان کی خصوصیات کے ظہور پذیر ہونے سے پیشتر کبھی

کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

یہ نئے ردِابطح کس طرح ظہور پذیر ہوتے ہیں، ان کے متعلق وائی کونٹ سمویل کہتا ہے کہ:-

علت و معلول کی زنجیر میں بعض اوقات ایسے مستثنیات آتے ہیں جنہیں صرف دستِ قدرت

ظہور میں لاسکتا ہے۔ (BELIEF AND ACTION)

فجائی ارتقاء کا نظریہ عصرِ حاضر کے اہم انکشافات میں سے ہے اور اس کے متعلق شرح و بسط سے لکھنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے لیکن ان مختصر سے اشارات سے اتنی بات تو واضح ہو گئی کہ قانون ارتقاء صرف وہی نہیں جو

آپ کے ذہن میں ہے، اس میں فجائی ارتقاء بھی شامل ہے جس کی ایک نئے عنصر کا ظہور

ظہور پذیر ہو جاتے ہیں جن کی تخلیق کے متعلق سائنس کچھ بھی نہیں کہہ سکتی کہ وہ کیسے ظہور میں آگئے۔ یہ عناصر سلسلہ علت و معلول کی سابقہ کڑیوں سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ اس تمہید کی روشنی میں انسانی سلسلہ تخلیق کو دیکھئے۔ پہلے سے سلسلہ طبیعی ارتقاء چلا آ رہا ہے۔ بَدَا اَخْلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ طِیْنٍ (انسانی تخلیق کی ابتدا جامد مادہ سے ہوئی)۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِیْنٍ (پھر مختلف ارتقائی منازل کے بعد یہ اس درجہ میں پہنچا جہاں افزائشِ نسل بذریعہ حمل ہوتی ہے) یہاں تک عام ارتقائی قانون کی کڑیاں چلی آ رہی تھیں۔ اس کے بعد یکایک ایک منزل سامنے آ جاتی ہے جو گذشتہ کڑیوں سے یکسر مختلف ہے۔ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوحِی (پھر اس میں اعتدال پیدا کیا اور اس میں "خدائی قوت" کا عنصر پھونک دیا۔ یہ بطریق فجائی ارتقاء ہوا۔ اب یہ "تُو")

(THOU) کہہ کر پیکار نے کے قابل ہو گیا کیونکہ اس میں انسانی خصوصیات کے حامل ذرائع علم و تصور (KNOWLEDGE

AND IMAGINATION) اور جذبات کا حامل "دل" پیدا ہو گئے۔ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ

وَالْاَفْصَادَ اور تمہارے لئے سماعت و بصارت اور دل بنایا)۔ یہ "نفخ من روحہ" (خدائی قوت کا شمع)

وہ نیا عنصر یا نیا رابطہ ہے جو سابقہ عناصر کی پیداوار نہیں بلکہ ایک جدید اور نرا اضافہ ہے۔ یہی انسانیت کا امتیاز

خصوصی ہے۔ اسی سے انسان صاحب اختیار دارادہ بنا ہے۔ اس کے بعد اس کی ارتقاء کا خط (LINE) وہ نئی ہٹری

ط (THOU) کا مخاطب کن انسانی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے، اس کے لئے (BUBER) کی کتاب (I AND THOU)

دیکھئے

ہوگی جسے نفخ من روحہ نے متعین کیا ہے، یعنی انسان کی موجودہ سطح و حصوں سے مرکب ہے۔ ایک خالص طبیعی ارتقاء کا نتیجہ ہے جسے اس کا طبیعی جسم کا کنا چاہیے۔ اس کی نشوونما اسی قانون کے مطابق ہوگی جو حیوانی زندگی کو محیط ہے۔ دوسرا حصہ وہ جو ”نفخ روح“ (خدائی قوت کی تنفیخ) سے ظہور میں آتا ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جسے انسان کی مضر صلاحیتیں کہا جاتا ہے۔ حصہ اول (یعنی جسم) درحقیقت ان صلاحیتوں کا مرکب یا ذریعہ شہید (پیکر) ہے۔ اس لئے اصل انسانیت بھی صلاحیتیں ہیں۔ (اس کی مزید تفصیل ذرا آگے چل کر آتی ہے) ان کی خصوصیات کا اہم نتیجہ انسانی اختیار و ارادہ ہے اور جسم اس اختیار و ارادہ کے فیصلوں کو نافذ کرنے کا ذریعہ۔ اب اس کا ارتقاء ان صلاحیتوں کے ارتقاء کا نام ہوگا۔ پروفیسر جوڈ اس باب میں لکھتا ہے:-

انسانیت کے ارتقاء کی اگلی منزل طبیعی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسی ہوگی۔ پہلے پہل انسان ارتقاء کی منزلیں طے کر کے حیوانیت سے انسانیت کے درجے پر آیا۔ پھر اس نے صنعت و حرفت کی مدد سے اپنے آپ کو آلات و اسباب سے آراستہ کیا۔ ہمارے اس دور میں انسان نے صنعت و حرفت پر پورا کمال حاصل کر لیا ہے۔ اب اس کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اس منزل سے آگے بڑھے اور جس طبیعی ارتقاء نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ حیوان سے ترقی کر کے انسان کے درجہ میں قدم رکھے، پھر اس کی جہتی ضرورتوں نے اس سے اوزار و آلات بنوائے اور وہ مشین اور اسٹیم کا خالق بنا۔ اسی طرح وہ آج مجبور ہے کہ اپنا قدم آگے بڑھائے اور اس کا یہ قدم مادی نہیں بلکہ نفسی اور ذہنی ترقی کی طرف ہوگا۔

صرف ذہنی اور نفسیاتی ارتقاء نہیں بلکہ جن کے ساتھ انسانی ذات (PERSONALITY) کا وہ ارتقاء بھی جو اس پر اس حقیقت کو منکشف کر دے کہ زندگی ایک غیر منقسم وحدت ہے، اس لئے ہر فرد کی اپنی صلاحیتوں کے ارتقاء کا راز تمام افراد انسانہ کی صلاحیتوں کی برومندی میں مضمر ہے۔ (اسی کا نام نظام روبرت عامر ہے جس کی طرف میں شروع سے دعوت دیتا چلا آ رہا ہوں اور جو قرآنی نظام کا نقطہ ماسک ہے) اسی قسم کا جامع ارتقاء کو (کسی اور موزوں اصطلاح کے نہ ہونے کی وجہ سے) ”ارتقاء انسانیت“ کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ قرآن نے اس کے لئے ترکیب نفس کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ لیکن چونکہ تصوراتِ بعجم کی بدولت اس اصطلاح کا عام مفہوم غیر قرآنی ہو چکا ہے، اس

لئے اس اصطلاح کو اس وقت تک استعمال نہیں کرنا چاہیئے جب تک یہ پھر قرآنی مفہوم کی آئینہ دار نہ بن جائے بہر حال اب انسانی ارتقاء اس جدید خط پر ہو گا اور چونکہ قرآن کی رُو سے زندگی صرف یہی طبعی زندگی نہیں، اس لئے اس ارتقاء کی منازل موت کے بعد بھی طے ہوتی رہیں گی۔

قرآن کا حرکتیاتی تصور

آپ نے ”صراطِ مستقیم“ سے جو مفہوم اخذ کیا ہے، وہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ قرآن کی یہ جامع اصطلاح بڑے اہم نکات کی حامل ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کچھ چکا ہوں، قرآن سے پہلے ذہن انسانی زندگی کی دوری حرکت کا قائل تھا، جس میں آگے بڑھنے کا تصور ہی نہ تھا۔ قرآن نے زندگی کا حرکتیاتی (DYNAMIC) تصور پیش کر کے یہ بتایا کہ حیات کسی چکر (CYCLIC) میں گردش نہیں کر رہی بلکہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ لہذا اس کی حرکت آگے بڑھنے کی (PRO-GRESSIVE) ہے۔ صراطِ مستقیم سے اس غلط فلسفہ حیات (یعنی زندگی کے چکر میں گردش کرنے) کا بطلان اور اس صحیح مقصود حیات (یعنی زندگی کے آگے بڑھنے) کا اثبات ہو گیا۔ پھر چونکہ ”مستقیم“ میں توازن قائم رکھنے کا پہلو بھی مندرجہ ہے، اس لئے یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ زندگی مختلف قوتوں میں توازن رکھتے ہوئے آگے بڑھنے کا نام ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ ”صراطِ مستقیم“ پر چلنے سے مراد یہ نہیں کہ زندگی اپنی موجودہ سطح پر چلتی رہے گی۔ زندگی کی راہ سیدھی بھی ہے اور بندیوں کی طرف جانے والی بھی یعنی ایسا خط جو پچھلے نقطہ سے اوپر کے نقطہ کی طرف جائے۔ ”لَا تَرْكِبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ“ (۸۷/۱۹) ”تاکہ تم طبقاً طبقاً اوپر چڑھتے جاؤ۔“ اس نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں بتا دیا کہ ”صراطِ مستقیم“ تمہارے اس نشوونما دینے والے درجہ کی راہ (قانون) ہے، جو ”ذی معارج“ (۶۰/۳) ہے۔ یعنی ”سیڑھیوں والا خدا“۔ سیڑھی سیدھی بھی ہوتی ہے اور اوپر کی طرف لے جانے کا ذریعہ بھی۔ (گھسٹے ہوئے اوپر جانے کا ذریعہ نہیں، بلکہ اُبھرتے ہوئے (JUMP) کرتے ہوئے اوپر چڑھنے کا ذریعہ) یہ وہ ذریعہ ہے جس سے انسان اَقْطَابِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۵/۳۳) یعنی موجودہ زمانہ و مکان کی حدود سے آگے نکل سکتا ہے لیکن جیسا کہ پہلے سمجھا جا چکا ہے، یہ ارتقاء اس نظام ربوبیت کے بغیر ناممکن ہے جو قرآن کی رُو سے قائم ہوتا ہے۔ اس نظام میں انسانی معاشرہ اپنی خطوط پر تشکل ہو جاتا ہے جن خطوط پر خارجی کائنات خدائی قوانین کے سامنے طوعاً و کرہاً سجدہ ریز، اپنی ارتقائی منازل طے کئے چلی جا رہی ہے یعنی خارجی کائنات طوعاً و کرہاً مشیت کے پروردگار کو پورا کر رہی ہے لیکن انسان اپنی دنیا میں اپنے اختیار و ارادہ سے اس پروردگار کو پورا کرتا ہے۔ اس طرح خدا اور بندے میں باہمی رفاقت کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے یعنی ایک عظیم اقدار پروردگار کی تکمیل میں ایک

دوسرے کے رفیق، بقول علامہ اقبالؒ

اس ارتقائی تبدیلی کے طرق و پہنچ میں خدا خود بندے کا رفیق بن جاتا ہے بشرطیکہ انسان اس باب میں پہل کرے۔ ان الله لا يغير ما بقوم حتى يغيروا ما بانفسهم۔ لیکن اگر وہ اس باب میں پہل نہیں کرتا، اگر وہ اپنی خودی کی مخفی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاتا، اگر وہ ابھرنے والی زندگی کے اندرونی تلاطم کا احساس نہیں کرتا، تو اس کی روح، پتھر کی قسارت اختیار کر لیتی ہے اور وہ (انسان نہیں رہتا بلکہ) جامد مادہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ (تشکیلِ جدید)

ہینرک یونیورسٹی کا پروفیسر ہنس ڈریش (HANS DRIESCH) اس مقام کے متعلق کہتا ہے کہ وہاں پہنچ کر ہم اپنے آپ کو خدا کا سپاہی کہہ سکتے ہیں۔ قرآن اس جماعت کو ”حزب اللہ“ کے نام سے پکارتا ہے۔ یہ ”حزب اللہ“ وہ معاشرہ ہے جو قرآنی نظامِ ربوبیت کی رُو سے تشکل ہوتا ہے۔ جس چیز کا نام ہم نے ”نفع روح خداوندی“ کا نتیجہ رکھا ہے، ذرا غور کیجئے کہ اس کی خصوصیت کبھی کیا ہے؟ قرآن نے اس فجائی ارتقاء کے بعد فرمایا کہ پھر انسان کو سماعت و بصارت اور فؤاد مل گئے۔

وقتِ فیصلہ

سماعت و بصارت وغیرہ اس خارجی دنیا کی معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ یہ معلومات انسان کی داخلی دنیا میں ایک مقام پر پہنچتی ہیں، جہاں سے مختلف امور کے فیصلے ہوتے ہیں۔ ”فیصلہ کرنے“ کا نام اختیار و ارادہ ہے۔ حیوانات کی نقل و حرکت ان کے جلتی تقاضوں (INSTINCTS) کی رُو سے ہوتی ہے لیکن انسان کے سامنے بیک وقت ایک سے زیادہ ممکنات (POSSIBILITIES) آتے ہیں۔ ان ممکنات میں سے وہ صرف ایک کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اس انتخاب کو فیصلہ کہتے ہیں اور یہ فیصلہ اختیار و ارادہ کی رُو سے ہوتا ہے۔ یہ ایک بنیادی خصوصیت ہے جو انسان کو حاصل ہے۔

انسانی جسم کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں۔ اس کا کام یہ ہے کہ خارجی دنیا کی معلومات حاصل کر کے ”اندر“ پہنچا دے اور پھر اندر سے جو فیصلہ صادر ہو اس کی تعمیل کرے۔ اس کے برعکس حیوانی سطح کی زندگی میں تمام تقاضے جسم کے ہوتے ہیں (جنہیں طبعی خواہشات کہا جاتا ہے) اور ”اندر“ کے فیصلے کو وہاں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

اب دو چیزیں ہمارے سامنے آگئیں۔ ایک حیوانی سطح کی زندگی جس میں جسم کے پورے تقاضے جلتی طور پر پورے ہوتے ہیں اور انسانی اختیار و ارادے کو اس میں کچھ دخل نہ ہو۔ (INSTINCTIVELY) دوسرے انسانی سطح کی زندگی، جس میں اصل شے انسانی فیصلہ ہو اور جسم اس فیصلہ کرنے والی قوت کے لئے آلہ اور ذریعہ

کا کام دے۔ اس اعتبار سے انسانی معاشرے کی تین قسمیں ہو جائیں گی۔

۱۔ جس میں نہ جسم کے تقاضے پورے ہوں نہ قوت فیصلہ کے استعمال کے مواقع۔ یہ زندگی انسانی سطح تو ایک طرف، حیوانی سطح سے بھی گئی گزری ہوتی ہے۔

۲۔ جس میں انسانی جسم کے تقاضے تو پورے ہوتے رہیں لیکن انسانی ذات کی تربیت و پرورش کا سامان نہ ہو۔ یہ حیوانی سطح کی زندگی ہوگی۔ اور

۳۔ جس میں جسم انسانی کے تقاضے بھی پورے ہوتے رہیں اور اس کے ساتھ ہی انسانی ذات کی وسعتیں بھی زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جائیں، یہ انسانی زندگی کی سطح ہوگی۔ قرآن بھی زندگی عطا کرتا ہے۔ اس میں ہر وہ عمل جو انسانی اختیار کو وسعت و تقویت بخشتا ہے، عمل خیر کہلاتا ہے۔ (خیر اور اختیار کا مادہ ایک ہی ہے) لیکن چونکہ اختیار و ارادہ تحریری مقاصد کے لئے بھی صرف ہو سکتا ہے اور تعمیری کے لئے بھی، اس لئے وہ اختیار و ارادہ کے استعمال کے لئے ایک روشنی، ایک میزان، ایک معیار بھی دیتا ہے، تاکہ ہر اختیار تعمیری نتائج کا حامل ہو، تحریری کا نہ ہو۔ یہ میزان، ضابطہ آئین خداوندی (قرآن) ہے۔

لہذا جس معاشرے میں

قرآنی معاشرہ

(۱) انسانی جسم کے تقاضے بطریق احسن پورے ہوتے رہیں۔

(ب) انسانی اختیارات کے حدود وسیع سے وسیع ہوتے رہیں اور

(ج) انسانی اختیارات کا استعمال وحی کی روشنی میں ہو۔

وہ قرآنی معاشرہ یا مسلمان کی زندگی ہے۔ اس معاشرے میں انسانیت اپنے ارتقائی منازل طے کر کے آگے بڑھے گی، اس میں تمام خارجی دنیا کی تسخیر ہوگی۔ (وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِیْعًا) اور چونکہ انسانی جسم بھی خارجی (طبیعی) دنیا سے متعلق ہے، اس لئے سب سے پہلے اس کی تسخیر ہوگی۔ یعنی جسم کا کام انسانی قوت فیصلہ (نفس) کے لئے معلومات فراہم کرنا اور اس کے فیصلوں کو جاری کرنا ہوگا، اس قوت میں جس قدر پختگی اور وسعت ہوتی جائے گی، اسی قدر انسانی زندگی دوام (IMMORTALITY) سے ہمکنار ہوتی جائے گی۔ جب جسمانی نظام طبعی قانون کے ماتحت مضمحل ہو کر منتشر ہو جائے گا، (جسے موت کہتے ہیں) تو اس پختگی اور وسعت یافتہ ذات (نفس) کا کچھ نہیں بچے گا۔ اس کے بعد اسے معلومات فراہم کرنے اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے والا اور نظام مل جائے گا۔

نظام ربوبیت

اس قوت کی پختگی اور وسعت صرف اسی نظام میں ہو سکتی ہے جسے نظام ربوبیت کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں ہر فرد اپنی محنت کے حاصل کو اپنے اختیار و ارادہ سے دوسروں کی پرورش و تربیت کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ اس سے اس کے اختیارات کی وسعتیں زیادہ ہوتی چلی جاتی ہیں لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانی جسم کے تقاضوں کے پورا کرنے کا انتظام از خود موجود ہو۔ اس نظام میں یہی ہوتا ہے۔ ہر فرد کی بنیادی ضروریات (جسم کے تقاضوں) کے پورا کرنے کا ذمہ نظام اپنے سر لے لیتا ہے اور افراد اس فکر سے آزاد ہو کر اپنی محنتوں کے حاصل کو پورے کے پورے معاشرے کی تعمیر و تربیت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ یہ ہے وہ معاشرہ (حزب اللہ) جس کی کھیتی بکیتی ہے۔ (هُمُ الْمُفْلِحُونَ) جس کے درخت برگ و بار لاتے ہیں یہی ہیں وہ جو سلسلہ ارتقاء کی اگلی منزلوں میں پہنچنے کے اہل ہوتے ہیں۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ نہ تو ان خاص طبعی ارتقار کی آخری کڑی ہے بلکہ اس کی "انسانیت" طبعی ارتقار کے سلسلہ علت و معلول سے الگ ہے اور نہ ہی اس کا مزید ارتقار طبعی ہو گا۔ طبعی ارتقار کی پیداوار صرف اس کا جسم ہے۔ اس میں جو ہر انسانیت غیر طبعی ہے۔ جسم انسانی اس جوہر انسانیت کے فیصلوں کے لئے معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ اور ان فیصلوں کو نافذ کرنے کا آلہ یا واسطہ ہے۔ اس کے بعد مزید ارتقار جسمانی نہیں بلکہ اس غیر طبعی جوہر انسانیت کا ہو گا۔ جسے ہم موت کہتے ہیں، وہ درحقیقت جوہر انسانیت کا جسم کے آسے کو چھوڑ دینے کا نام ہے۔ جوہر انسانیت (انسانی ذات) کی نشو و ارتقار قرآنی نظام ربوبیت سے ہوتی ہے۔ زندہ وہ ہے جس کے اختیار و ارادے کی قوتیں (قرآنی روشنی میں) اتمام خارجی کائنات کو (جس میں خود اس کا جسم بھی شامل ہے) مستحکم کئے جاتی ہیں۔ جو اس طرح زندہ ہے وہ موت سے نہیں مر سکتا۔ اسی کا نام سلسلہ ارتقار کی اگلی منزل طے کرنا ہے۔

سوچئے کہ ہم میں آج کتنے زندہ ہیں !

ایک صاحب نے لکھا تھا۔

آدمؑ آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی رُوسے انسان سلسلہ ارتقار کی منزلیں طے کرتا ہوا اس شکل میں آیا ہے۔ اس صورت میں آدمؑ سے کیا مراد ہوگی؛ کیونکہ اب تک تو یہی سمجھا جاتا تھا کہ ہم سب باوا آدمؑ اور اماں حواؑ کی اولاد ہیں، یعنی انسان کے ایک جوڑے سے ساری نسل آگے چلی ہے۔

آدمؑ کے متعلق میں تفصیل سے ابلیس و آدمؑ میں لکھ چکا ہوں۔ وہاں سے معلوم ہوگا کہ قرآن کے بیان فرمودہ

جواب

قصۂ آدمؑ میں آدمؑ سے مراد کوئی خاص فرد نہیں بلکہ اس سے مراد نوعِ انسانی کا نمائندہ (REPRESENTATIVE OF MANKIND) ہے اور وہ قصۂ کسی ایک شخص کی سرگزشت نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ماجریات و کیفیات کی نمائندگی ہے

مملکت کا قرآنی تصور

نوشتہ مارچ ۱۹۵۴ء

(کراچی یونیورسٹی کی ہسٹوریکل سوسائٹی کی دعوت پر محترم پروفیسر صاحب نے ۳۰ مارچ ۱۹۵۴ء کی شام کو مملکت کے قرآنی تصور کے عنوان سے یونیورسٹی کے طالب علموں کے ایک مختصر سے گروپ سے خطاب کیا تھا۔ ان کی اس تقریر کو ان کے اشارات کی رو سے مرتب کر لیا گیا ہے۔ اگرچہ اس تذکرہ میں انھوں نے پڑے اختصار سے کام لیا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس اختصار کے باوجود اس میں وہ بنیادی اصول آگئے ہیں جن کے واضح ہونے کی آج بڑی ضرورت ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ان کے ان مختصر سے اشارات کو بڑے غور اور فکر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔)

(طلوعِ اسلام)

عزیزانِ ملت !

آج کے اجتماع کی شرکت میرے لئے دو گونہ خوشی کا باعث ہے۔ ایک تو اس لئے کہ میں اس وقت نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ سے خطاب کر رہا ہوں۔ جیسا کہ میں ایک عرصہ سے کہتا چلا آ رہا ہوں، قوموں کا مستقبل ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ ان کی تقدیر کا نوشتہ انہی کی پیشانیوں کی پکیروں میں مضمر ہوتا ہے اور ان کی کشتی کی عافیت کا مدار انہی کی قوت بازو پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ قوم کے نوجوان طبقہ کو اپنا مخاطب قرار دیا ہے اور حضرت علامہ اقبالؒ کی ہمنوائی میں ہمیشہ اس کی آرزو کی ہے کہ

جوانوں کو مری آہِ محروم دے پھر ان شاہیں بچوں کو بالِ پیر دے
خدا یا آرزو میری یہی ہے مرا نورِ بصیرت عام کر دے

دوسری خوشی یہ ہے کہ آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ مملکت کا قرآنی تصور کیا ہے؟ اگر ہماری قوم کا نوجوان طبقہ یہ روش اختیار کر لے کہ زندگی کا جو مسئلہ اس کے سامنے آئے، اس کے متعلق وہ پوچھے کہ قرآن اس کی بابت کیا کہتا ہے، تو مجھے یقین ہے کہ ایک ہی نسل کی زندگی میں ہماری قسمت کا پانسہ پلٹ جائے۔

چونکہ آپ میں پولیٹکل سائنس کے طالب علم بھی موجود ہیں، اس لئے مجھے ان تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ مملکت کے تصور کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟ اور اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ مملکت کی تعریف (DEFINITION) کے متعلق اتنا کہ دینا کافی ہوگا کہ وہ بلند ترین معاشرتی ادارہ جو انسانوں کے تمدنی معاملات کو قانون اور ضابطہ کی رُخ سے سرانجام دینے کے لئے وجود میں آتا ہے، اسے مملکت کہتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا، ہمارے دور میں مملکت کی تین بنیادی خصوصیات بتائی جاتی ہیں۔ اول یہ کہ مملکت کو مذہب اور اخلاق سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ مملکت ہمہ گیر ہوتی ہے، یعنی وہ افراد کی پوری زندگی پر چھائی ہوئی ہوتی ہے اور اپنے عمل اور فیصلوں کے لئے کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتی۔ اور تیسرے یہ کہ مملکت اپنی قوت و طینت کی گروہ بندی سے حاصل کرتی ہے۔

شقی اول کے متعلق بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ مملکت افراد کے مذہب اور پرائیویٹ کیریئر کے معاملہ میں کوئی دخل اندازی نہیں کرتی لیکن اگر آپ بغور دیکھیں تو اس کا مطلب اس سے کہیں زیادہ عمیق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مملکت خود کسی ضابطہ اخلاق کی پابند نہیں ہوتی۔ مغرب (اور اس کی دیکھا دیگی باقی دنیا میں بھی) مملکت کی عمارت میکاؤلی کے نظام سیاست کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اس نظام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ مملکت کو ہر قسم ضابطہ اخلاق سے آزاد ہونا چاہیئے۔ اس کا مقصد مفاد خویش کا تحفظ ہے۔ ہر وہ اقدام جس سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہے جائز بلکہ مستحسن ہے اور ہر وہ فیصلہ جس سے اس کے مفاد پر زور پڑتی ہے مذموم ہے۔ مصلحت کو شقی اس کا ایمان اور مفاد پرستی اس کا مذہب ہے۔ چونکہ اس عقیدہ کی رُو سے مملکت خود اپنے آپ کو کسی اخلاقی ضابطہ یا مذہب کی پابند تسلیم نہیں کرتی، اس لئے وہ افراد معاشرہ پر بھی اس قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کرتی۔ اگر کوئی شخص مملکت کے قوانین کی پابندی کرتا ہے، تو اس کے بعد باقی معاملات میں اسے کھلی چھٹی ہے کہ وہ جو جی میں آئے کرے۔

جدید مملکت کی دوسری خصوصیت اس کی ہمہ گیری اور کلیت ہے۔ ایک طرف تو یہ کہ وہ افراد مملکت کی زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے معاملات میں مختار عمل ہوتی ہے۔ یعنی وہ اپنے سے بالاکسی قوت کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس باب میں شخصی حکومت یا جمہوریت میں کوئی فرق نہیں۔ جس طرح ایک مطلق الخان بادشاہ اپنے حکم کو آخری لفظ قرار دے کر نافذ کرتا ہے، اسی طرح جمہوری نظام میں کیا وہ فیصدی والے اپنے فیصلہ کو کامل اختیارات

کے ساتھ نافذ کر دیتے ہیں اور وہ اپنے اس فیصلے کے لئے کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتے۔

مملکت کی تیسری خصوصیت جذبہ وطنیت ہے۔ اگرچہ آج تک وطنیت (NATIONALISM) کی کوئی جامع تعریف نہیں ہو سکی لیکن اس کا عمومی مفہوم یہی لیا جاتا ہے کہ ایک خطہ زمین میں بسنے والے افراد جو ایک حکومت کے ماتحت زندگی بسر کریں، ایک نیشن (NATION) ہوتے ہیں۔ نیشن کا مفاد باقی تمام مفادات پر غالب ہوتا ہے۔ سب سے بڑی نیکی نیشن کے مفاد کا تحفظ ہے۔ حتیٰ کہ جو وطن پرست (PATRIOT) اپنی نیشن کے مفاد کے تحفظ کے لئے جان دے دے اسے شہید سمجھا جاتا ہے۔ اپنی نیشن کے تحفظ کے مقابلہ میں باقی افراد انسانہ کا تحفظ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں جدید مملکت کی بنیادی خصوصیات۔ قرآن جس بنیاد پر مملکت کی عمارت تعمیر کرتا ہے اس کی رو سے یہ تینوں خصوصیات باطل ہو جاتی ہیں۔ وہ مملکت کی عمارت آئیڈیالوجی (IDEOLOGY) پر استوار کرتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس ایک فرق سے جدید مملکت کے تصور اور مملکت کے قرآنی تصور میں کتنا بنیادی فرق آ جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ قرآنی مملکت اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتی کہ اس کے افراد کس آئیڈیالوجی کو تسلیم کرتے ہیں۔ چونکہ قرآن کی رو سے آئیڈیالوجی ہی کا دوسرا نام دین اور ایمان ہے، اس لئے قرآنی مملکت میں افراد مملکت آئیڈیالوجی کے معاملہ میں بے زام نہیں رہ سکتے۔ اس مملکت میں دو گروہ ہوں گے۔ ایک گروہ وہ جو قرآنی آئیڈیالوجی پر یقین رکھے اور دوسرا گروہ وہ جو اس آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کرے۔ مملکت کا نظم و نسق پہلے گروہ کے ہاتھ میں ہوگا۔ باقی رہا دوسرا گروہ، سو اس کے تمام انسانی حقوق کی ذمہ داری مملکت کے سر پر ہوگی اور وہ دیکھے گی کہ ان کے حقوق میں کسی قسم کی دست برد نہ ہونے پائے۔

آئیڈیالوجی کے پیش نظر یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآنی مملکت مختار کل نہیں ہوتی بلکہ یہ اس آئیڈیالوجی کی عائد کردہ حدود کے اندر ہی فیصلے صادر کر سکتی ہے۔ یہ ان حدود کو کسی صورت میں بھی توڑ نہیں سکتی۔ نہ اپنے آپ کو ان پابندیوں سے ادبچالے جاسکتی ہے۔ یہ پابندیاں غیر متبدل ہیں اور ان میں تغیر و تبدل یا ترمیم و تسیخ کا مملکت کو کوئی حق نہیں ہوتا۔ آئیڈیالوجی کے ماتحت وطنیت کا تصور بھی باطل ہو جاتا ہے۔ اس کی رو سے قومیت کی بنیاد آئیڈیالوجی پر ہوتی ہے نہ کہ وطن، رنگ، نسل، زبان وغیرہ کے اشتراک پر۔ خود ایک ہی وطن میں بسنے والے ایسے افراد جو اس آئیڈیالوجی کو صحیح تسلیم نہیں کرتے غیر قوم کے افراد کہلائیں گے اور اس کے برعکس دنیا کے کسی حصہ میں بسنے والا انسان جو اس آئیڈیالوجی کو صحیح تسلیم کرتا ہے، اس قوم کا فرد قرار پائے گا۔

آپ نے دیکھ لیا کہ اس ایک فرق کی بنا پر قرآنی مملکت کس طرح جدید مملکت سے یکسر منفرد ہو جاتی ہے، خواہ یہ مملکت جمہوری نظام کی حامل ہو یا آمریت کے نظام کی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ آئیڈیالوجی کیا ہے جس پر قرآنی مملکت مشکل ہوتی ہے۔ اس سوال کی تفصیل میں جائزے تو بات طویل ہو جائے گی لیکن اگر اسے سمٹا کر بیان کیا جائے تو بغیر کسی تردد اور تامل کے کہا جاسکتا ہے کہ یہ آئیڈیالوجی ہے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ————— مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ

یعنی وہی چیز جسے ہم کلمہ کہتے ہیں۔ کلمہ کے معنی نظریہ زندگی یا تصور حیات کے ہیں۔ اسی کو دورِ حاضر کی اصطلاح میں آئیڈیالوجی کہتے ہیں۔ اس آئیڈیالوجی کے تین اجزاء ہیں۔ پہلا جزو ہے لَا إِلَهَ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں کوئی قوت ایسی نہیں جس کے سامنے انسان اپنا سر جھکائے۔ ذرا غور کیجئے کہ قرآن نے اس تصور حیات سے انسان کا مقام کس قدر بلند کر دیا ہے۔ اس نے انسان کو وہ آزادی عطا کر دی ہے جو کسی کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ ہاں نے کہا تھا کہ اپنا حکم منوانا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ قرآن نے کہا کہ انسان اپنا حکم اشیائے فطرت سے تو منوا سکتا ہے، لیکن کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ قرآن کا یہی تصور تھا جس سے متاثر ہو کر برگساں نے کہا ہے کہ مملکت کا تصرف اشیاء پر ہونا چاہیئے، انسانوں پر نہیں۔ اس حقیقت کو قرآن نے اپنی ایک آیت میں نہایت واضح طور پر بیان کیا ہے جس میں اس نے کہا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يَقُولَ تِلْكَ لِي اللَّهِ إِلَّا كِتَابَ اللَّهِ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ لَا تَشْمَعُ يَقُولُ

لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي (۳/۸۹) کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ اللہ اسے کتاب، حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ دوسرے انسانوں سے یہ کہنے لگ جائے کہ تم میرے حکم کو مانو، غور کیجئے اس میں، اور تو اور خود نبی کے متعلق بھی یہ کہہ دیا کہ اسے بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انسانوں سے اپنے احکام منوائے۔

آپ کہیں گے کہ یہ تو انار کی ہوئی۔ اگر انسان کسی کا حکم نہ مانے تو پھر انسانی معاشرہ قائم کیسے رہے گا۔ کلمہ کے دوسرے جزو نے انسانوں کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اس انار کی کو ختم کر دیا، جب اس نے کہا کہ ————— لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ————— ہاں مگر ایک ذات ایسی ہے، جس کے قانون کی پابندی ضروری ہے اور وہ ذات ہے اللہ کی۔ اگر میں اس تفصیل میں چلا جاؤں کہ اللہ کسے کہتے ہیں اور اس کے قوانین کیا ہوتے ہیں تو یہ بحث فلسفہ، بلکہ مابعد الطبیعات کے دائرہ میں چلی جائے گی۔ اس لئے مختصر الفاظ میں یہ سمجھئے کہ اقبالؒ کے الفاظ میں خدا کے قوانین کی اطاعت غیر کے احکا کی اطاعت نہیں ہوتی بلکہ انسان کی اپنی بلند فطرت (IDEAL NATURE) کا اتباع

ہوتی ہے۔ خدا بھی ایک (PERSONALITY) ہے اور انسانی فرد بھی ایک (PERSONALITY) ۔ ان دونوں میں فرق درجہ کا ہے۔ خدا مکمل ترین (PERSONALITY) ہے اور انسان اپنی (PERSONALITY) کی تکمیل اس مکمل ترین ذات کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرنے سے کر سکتا ہے۔ (PERSONALITY) جہاں بھی ہو اس کے تقاضے یکساں ہوتے ہیں۔ یہ ہے مطلب اقبالؒ کے اس کہنے کا کہ قوانینِ خداوندی سے مراد انسان کی اپنی مثالی فطرت کے تقاضوں کی اطاعت ہے۔ جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے، وہ قرآنی تصور کی رو سے صفاتِ خداوندی کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے معنی ہوئے مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ سورۃ آل عمران کی جس آیت کا پہلا ٹکڑا پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ (یعنی کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنا حکم منوائے) اس کا اگلا ٹکڑا یہ ہے۔ وَلِلّٰهِ عَنِ ثَوَابٍ نَّاسِبَةٍ لِّكُلِّ شَيْءٍ رَّابِعٌ لیکن تمہیں چاہیے کہ تم ربانی بن جاؤ۔ اس نفی اور اس اثبات سے قرآنی آیہ یا لوجی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

لیکن یہاں تک گفتگو محض تجریدی ہے۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ قوانین خداوندی کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ یہ قوانین ہیں کہاں، اس کا جواب کلمہ کے تیسرے ٹکڑے — محمد رسول اللہ — میں ہے۔ یعنی یہ قوانین انسانوں کو رسالتِ محمدیہ کی وساطت سے ملیں گے۔ اسی کی تفصیل سورہٴ آل عمران کی مذکورہ بالا آیت کے تیسرے ٹکڑے نے کر دی جس میں کہا گیا ہے۔ بِمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ اَلْحَبِيبُ دِيْمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ یعنی اس کتاب کے ذریعہ سے جو تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے نقوش تمہارے لوحِ قلب پر نہایت گہرے ہیں۔

لہذا قرآنی مملکت کے معنی ہوئے۔ انسانی معاشرہ کی تشکیل قرآنی قوانین کے مطابق۔ یہی چیز قرآن نے سب سے پہلے خود نبی اکرم صلم سے فرمادی، جب آپ کو حکم دیا کہ **فَاَحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ** (۵/۴۸) کہ تم قرآن کے مطابق حکومت قائم کرو اور اس اصول کو اس نے کفر و ایمان کا معیار قرار دیا، جب کہا کہ **وَمَنْ تَمَّ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ** (۵/۴۴) جو قرآن کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں، یعنی قرآنی آئیڈیالوجی کے منکر ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نظریہ کی عملی صورت کیا ہے۔ آپ انسانی زندگی پر غور کیجئے۔ اس کے کچھ تقاضے تو ایسے ہیں جن میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ زندگی کے یہ غیر متبادل تقاضے بنیادی اور اصولی ہیں۔ انہیں مستقل اقدار کہتے ہیں لیکن زندگی کے دوسرے تقاضے ایسے ہیں جو زمان اور مکان کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ یا یوں کیئے کہ مستقل اقدار یا بنیادی اصول تو اپنی جگہ پر محکم رہتے ہیں لیکن ان کی عملی جزئیات مختلف زمانوں میں بدلتی جاتی ہیں۔ قرآن نے زندگی

کے ان بدلنے اور نہ بدلنے والے دونوں پہلوؤں کے متعلق رہنمائی دی ہے۔ اس نے کہا کہ وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَلِيَّاتِ ذَاتِ الْقُلُوبِ الْعَظِيمَةِ (۱۵/۸۷) یعنی ہم نے تجھے زندگی کے بنیادی اصولوں کا ضابطہ اور بار بار دہرائے جانے والے واقعات، دونوں کی رہنمائی دی ہے۔ یہ مستقل اور غیر تبدل اصول وہ حدود ہیں جن کے اندر انسانوں کو آزاد چھوڑا گیا ہے کہ وہ باہمی مشاورت سے اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق عملی جزئیات خود متعین کر لیں۔ اس کی بابت سب سے پہلے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ وَشَاءَ ذَرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۸) مملکت کے معاملات میں اپنے رفقاؤں سے مشورہ کیا کرو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کی جماعت کے متعلق کہا کہ ذَا مَرُءٍهُم مَّشُورَىٰ يَنْتَهِم (۴۲/۳۸) ان کی مملکت کے امور باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔ دوام اور تغیر (PERMANENCE AND CHANGE) کے اس فطری امتزاج کی رُو سے یہ نظام مملکت ارتقائی منازل طے کرتا، بڑھتی ہوئی انسانیت کی رہنمائی کرتا چلا جائے گا۔ قرآن نے شوریٰ کا اصولی حکم دیا ہے، اس کی جزئیات سے بحث نہیں کی۔ شوریٰ کی عملی مشینری زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلی جائے گی لیکن یہ شوریٰ جمہوریت کی بدلتی کامظہر نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ یہ اختیار کسی کو بھی نہیں ہوگا کہ وہ ان حدود سے تجاوز کر جائے جو قرآن نے مستقل طور پر متعین کر دی ہیں۔ اگر شوریٰ فیصلے ان حدود سے تجاوز کر جائینگے تو وہ مملکت قرآنی نہیں رہے گی۔

ان تصریحات سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن کی رُو سے مملکت مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن کی رُو سے مملکت وہ اجتماعی نظام ہے جس میں خدا کی صفات انسانی دنیا میں ایک ٹھوس شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ فلسفہ کی زبان میں اسے ہم (OBJECTIVISATION OF PERMANENT VALUES) کہہ سکتے ہیں اور چونکہ یہ مستقل اقدار خود انسان ہی کی مثالی فطرت کے پرتو ہیں، اس لئے یوں سمجھئے کہ قرآن کی رُو سے مملکت اس اجتماعی نظام کا نام ہے، جس میں افراد کی مضمحل صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ فلسفہ کی زبان میں اسے (ACTUALIZATION OF REALIZABLE HUMAN POTENTIALITIES) کہتے ہیں۔ یہ ہے نظام مملکت کا وہ مقصد جس سے قرآن نے اپنی ابتدا کی ہے جہاں کہا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، جس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ وہی نظام قابلِ حمد و ستائش ہو سکتا ہے جو قوانین خداوندی کے مطابق نوع انسانی کی ربوبیت کا حامل ہو۔

اس مقصد بلند کے لئے قرآن نے نظام مملکت اور افراد کے درمیان ایک معاہدہ تجویز کیا ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِآَنٍ لَّهُمْ الْجَنَّةُ (۹/۱۱) افراد معاشرہ اپنی وہی اور انسانی املاک نظام کے سپرد کر دیتے ہیں اور وہ ان کے بدلہ میں انھیں الْجَنَّةَ عطا کر دیتا ہے۔ الْجَنَّة کس کو

کہتے ہیں؛ اس کی تفصیل پورے قرآن میں دی ہوئی ہے۔ اس میں اس موجودہ زندگی کی تمام خوشگواہیاں بھی آجاتی ہیں اور انسانی صلاحیتوں کی وہ نشوونما بھی، جن کی رو سے یہ اس زندگی کے بعد زندگی کی اگلی منزلیں طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس جنت میں زندگی کی بنیادی ضرورتوں کی بہم رسانی نظام مملکت کے ذمہ ہوتی ہے، اس لئے کہ قرآن نے الْجَنَّةَ کے متعلق کہا ہے کہ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَصْحَقُ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) یعنی اس میں نہ کھانے پینے کی کوئی تنگی ہوگی اور نہ لباس اور مکان کی۔ اور اس کے ساتھ ہی لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ انھیں کسی قسم کا کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ لہذا قرآنی مملکت کی یہ اولین ذمہ داری ہوگی کہ وہ تمام افراد مملکت کے لئے کھانے پینے کا سامان اور لباس اور مکان بہم پہنچائے اور ان کی ہر قسم کی حفاظت کا انتظام کرے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

کس بناشد در جہاں محتاج کس نیکہ شرع ہمیں اس است دہس

○

یہ ہے عزیزان من! مملکت کا قرآنی تصور جس کے صرف اُبھرے ہوئے خطوط کی طرف میں اشارہ کر سکا ہوں قرآن سے ان اشارات کے متعلق تفصیلی گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن اس کی عملی ضرورت کا وقت وہ ہوگا جب قرآنی مملکت کی تشکیل کا مسئلہ درپیش ہو۔ والسلام۔

وہ مرد درویش.....

مارچ ۱۹۵۵ء

غالباً ۱۹۳۰-۳۱ء کا ذکر ہے۔ میں نے (جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے) رسالہ جامعہ میں حدیث کے متعلق ایک مضمون دیکھا۔ اس کا بیشتر حصہ خود میرے خیالات کا ترجمان تھا لیکن بعض مقامات ایسے بھی تھے جن میں مجھے کچھ تردد تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اس موضوع پر اس قسم کا مضمون دیکھا ہو۔ سلیجی ہوئی عبارت، خیالات صاف اور واضح، سادہ انداز، الفاظ کم از کم لیکن ہر لفظ اپنے مقام پر منتخب، محکم اور بخود خزیدہ، دلائل دلکش، تجربہ عالمانہ لیکن اسلوب بحث طالب العلمانہ۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ہر دعوے کی تائید قرآن سے۔ مضمون پڑھنے کے ساتھ ہی صاحب مضمون سے ملنے کا شوق دل میں اُبھرا۔ اسی وقت خط لکھا اور میرے ہی دن (ایک دوست کی زبانی) اس کا جواب آگیا۔ چنانچہ میں اتوار کے دن دہلیہر کے وقت قردل باغ پہنچا۔ قردل باغ اس زمانہ میں مختصر سی بستی تھی اور زیادہ ترجمانہ ملیہ کی وجہ سے مشہور۔ چنانچہ وہاں ”چھتر دانے کنوئیں“ کو تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہ ہوئی۔ مکان پر پہنچا، دھک دی، دروازہ کھلا تو خود صاحب خانہ اور (صاحب مضمون) میرے سامنے تھے۔ بلند قامت، سر کے بال قریب قریب سفید، لیکن مانگ نکلی ہوئی، کچھ دی ڈاڑھی لیکن تراش موزوں، کاڑھے کا کرتہ اور کاڑھے ہی کا پاجامہ، ازار بند کرتے سے نیچے لٹکا ہوا اور اس میں ایک چابی بندھی ہوئی، ہاتھوں میں دیسی جوتا، پیشانی کشادہ، ایک آنکھ کی سیاہی خدا اپنے مقام سے ہٹی ہوئی، لبوں پر مسکراہٹ اور چہرے پر بشاشت اور متانت کا ایسا امتزاج جو خیالات کی پاکیزگی اور حسن ذوق کا آئینہ دار ہو۔ میں نے اپنا نام بتایا تو بڑے شفقت آمیز انداز سے اندر آنے کے لئے کہا۔ کمرے کے اندر پہنچے تو مکان خود مکین کی سادگی کا مظہر۔ سامنے ایک چٹائی پچھ رہی تھی، جس پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا ڈسک تھا اور اس

پر بکھنے پڑھنے کا مختصر سامان۔ قلم، دوات، تھوڑے سے کاغذ۔ اسی چٹائی پر بیٹھ گئے اور دو ہی چار باتوں کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہم مدتوں کے ملاقاتی ہوں۔ ان کی باتوں کا بھی وہی انداز تھا جو تجربہ کا تھا۔ مختصر جامع ادب لکھیں، صاف، واضح اور شگفتہ، جن میں سادگی کے ساتھ عجیب قسم کا مصومانہ انکسار بھی تھا۔ قرآن — سینے، دل اور دماغ تینوں میں، کتب و آیات و سیر پر عبور، تاریخ اُمم، بالخصوص مسلمانوں کی تاریخ پر گہری نظر، شعر کا ذوق، ہنایت پاکیزہ، مذکورہ صدر مضمون کے اختلافی مقامات کے متعلق گفتگو رہی۔ میرے اعتراضات میں (بہ تقاضائے عمر — میں اس وقت ۲۶/۲ برس کا تھا) شدت اور جوش تھا۔ ان کے جواب میں نرمی اور متانت۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ دو تین اور حضرات ملنے کے لئے آگئے۔ ان میں ایک تو مولانا عبدالقادر قہوری (مرحوم) اور ایک صاحب بیٹی کو نسل کے ممبر اور تیسرے صاحب کسی ریاست کے عہدیدار۔ انہیں بھی اسی بے تکلفی سے چٹائی پر بٹھا دیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم تو مولانا! چائے پینے کے لئے آئے ہیں۔ مسکرا کر کہا یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ کہہ کر خود ہی اندر گئے (گھر میں ملازم کوئی نہیں تھا)۔ پہلے ایک دسترخوان لاکر بچھا دیا جو بتا رہا تھا کہ وہ گاڑھے کے پرانے کُتوں کو دھوا کر تیار کیا گیا ہے۔ پھر چار پانچ پرچیں پیالیاں (جن میں شاید ہی کوئی صحیح سالم ہو) ایلومینم کی ایک چائے دانی۔ میں ان چیزوں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس تکلف کے دور میں اس قدر سادگی کے لئے کتنے بڑے وسیع ظرف اور بلند نگاہ کی ضرورت ہے۔

یہ تو تھا چائے کا سامان، لیکن جب صاحب خانہ نے چائے پر گفتگو شروع کی تب معلوم ہوا کہ آنے والوں نے خاص طور پر چائے کی فرمائش کیوں کی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی (غبارِ خاطر میں) اپنی چائے کی رنگینی اور گرم جوشی کا بڑا حسین نقشہ کھینچا ہے لیکن چائے کا جو نقشہ دہلی کھنچ رہا تھا اس میں اور غبارِ خاطر کے نقشے میں اتنا ہی فرق سمجھئے جتنا فرق بادیہ نشین عربوں کے قہوۃ شغستانی اور عجمی محفلوں کے بادۂ ارغوانی میں ہوتا ہے۔ گفتگو میں عربوں کی سی سادگی، بے تکلفی، سینہ کی کشادہ ذوق کی پاکیزگی اور شگفتگی اُبل اُبل کر سامنے آرہی تھی۔ حتیٰ کہ لطائف بھی عربی کتب محاضرات ہی کے تھے۔ قریب ایک گھنٹہ تک یہ محفل گرم رہی۔ وہ محفل جس میں خلوص کی پہنائیاں، علم کی گہرائیاں اور ذوق کی بلندیاں، سب سمٹ کر آگئی تھیں۔

یہ تھی علامہ اسلم جیراج پوری (مدظلہ) سے میری پہلی ملاقات۔ دنیا میں خیالات کی ہم آہنگی کا رابطہ بھی عجیب رابطہ ہے اور جب اس ہم آہنگی کی بنیاد قرآن پر ہو تو پھر اس قلبی تعلق کا پوچھنا ہی کیا۔ (یہ میرا عمر بھر کا تجربہ ہے کہ جن لوگوں سے قرآن کی بنیادوں پر تعلق پیدا ہوا وہ رشتہ بڑا ہی محکم رہا) چنانچہ چند ہی دنوں کے بعد صورت یہ ہو گئی کہ میری خدمت کے بیشتر اوقات انہی کے پاس گزرنے لگے۔ اس زلزلے میں ہمارے دفاتر چھ ماہ کے لئے (سردی میں) دہلی رہا کرتے تھے اور گرمیوں کے

چھ ماہ شملہ میں گرمی کے موسم میں جامعہ میں کم و بیش تین ماہ کی تعطیلات ہو جاتیں اور مولانا اپنے وطن تشریف لے جاتے۔ (علامہ اسلم اپنے وطن میں "حافظ صاحب" اور جامعہ میں "مولانا" کے لقب سے متعارف تھے (اور اب بھی ہیں) یہ لقب ان کے لئے ایسا ریزرڈ ہو چکا تھا کہ ہر شخص جانتا تھا کہ جب صرف "مولانا" کہا جائے تو اس سے کون مراد ہوتے ہیں۔ اسی بناء پر وہ اجباب کے حلقہ میں بھی "مولانا" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ (بعض اوقات اتفاقات کی ستم ظریفی بھی عجیب ہوتی ہے۔ جو شخص مولانا ٹیٹ سے اتنا دور نکل چکا ہو، وہ عمر بھر "مولانا" کے نام سے موسوم رہے۔ یہ اتفاقات کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے!) بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ مولانا سے میرا ملنا موسم سرما ہی میں ہوا کرتا تھا۔

میں عربی ادب کی بعض کتابوں میں نا پختگی محسوس کیا کرتا تھا۔ میں نے چاہا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں اور عندل فرست مولانا سے یہ کتابیں از سر نو پڑھ لوں۔ چنانچہ (غالباً) ۱۹۳۵ء میں میں نے اس کے متعلق مولانا سے ذکر کیا اور وہ اس کے لئے بخوشی رضامند ہو گئے۔ چنانچہ میں شملہ سے تنہا دہلی آ گیا اور چونکہ مولانا بھی اس زمانے میں اکیلے ہی رہتے تھے، اس لئے فیصلہ ہی ہوا کہ میں انہی کے ساتھ رہوں۔ یہ چھ مہینے کا عرصہ میری زندگی کے یادگار دنوں میں سے ہے۔ میں آیا تو تھا عربی ادب کی نا پختگی دور کرنے کے لئے لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ آگ لینے کو جائے بیٹری مل جائے [ہمارا بیٹری جھٹہ قرآن کے رموز و غوامض پر بحث و تحقیق میں گزرتا۔ اس زمانے میں مولانا کا ایک لازم تھا رحمت اللہ۔ وہی روٹی پکاتا تھا۔ (بلکہ اسے روٹی پکانا بھی میں نے ہی سکھایا تھا) اور مولانا کا چھوٹا لڑکا (عزیزی معظم سلمہ اللہ تعالیٰ جو اس زمانہ میں طبیہ کالج میں پڑھتا تھا اور اب اعظم گڑھ میں ایک کامیاب طبیب ہے) یہ ساتھ تھے۔ اوپر کے کمرے میں میری اور مولانا کی چار پائی آمنے سامنے بھی رہتی۔ رحمت اللہ مولانا کو حقہ بھر کر دے جاتا اور ہم باتوں میں مصروف رہتے۔ ان باتوں کا محور تو (ظاہر ہے) قرآن ہوتا لیکن شاید ہی کوئی ایسا موضوع تھا جو اس محور کے گرد نہ گھومتا۔ میں اس زمانے میں (اپنی تصنیف) معارف القرآن کے ابتدائی مراحل میں سے گزر رہا تھا، اس لئے میرے پیش نظر بھی ہر وقت قرآن رہتا تھا اور مولانا کے تو سنے ہی میں قرآن تھا۔ نہ معلوم اس چھ ماہ کے عرصہ میں ہم نے قرآنی تحقیق کے ضمن میں کتنا کچھ کھنگال ڈالا۔ میں نے اپنی حیثیت ہمیشہ ایک شاگرد کی سی سمجھی لیکن مولانا کی کشادہ نگاہ کا یہ عالم تھا کہ بڑے سے بڑے مسئلہ پر بھی انہوں نے اگر دیکھا کہ میری رائے صحیح ہے تو وہ اسے ایسی خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے کہ بعض اوقات مجھے شبہ گزرتا کہ وہ کہیں میرے پاس خاطر سے ایسا تو نہیں کرتے (لیکن بعد کے تجربے نے بتایا کہ دین کے معاملہ میں مولانا کسی کے پاس خاطر سے کوئی بات قبول کرتے ہیں نہ کوئی خیال چھوڑتے ہیں۔ وہ اختیار صرف اسے کرتے ہیں جسے حق سمجھتے ہیں۔ اگر کسی بات کے متعلق تحقیق ہو جائے کہ وہ قرآن کے مطابق نہیں تو اسے نہایت جرات اور آسانی سے جھٹک کر الگ کر دیتے ہیں) اس قیام کے دوران میں

مولانا کا علمی تجر، قرآن سے عشق اور سب سے بڑھ کر ان کی سیرت و کردار کی بندی نگر کر میرے سامنے آگئی۔ میں نے دیکھا کہ (بذریعہ ڈاک استفسارات کے علاوہ) ممالک اسلامیہ کے جید علماء اور مشاہیر اکثر انھیں ملنے کے لئے آتے اور اہم مسائل پر ان سے استفادہ کرتے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ اگرچہ حدیث کے متعلق ان کا مسلک اہل حدیث سے مختلف تھا اور فقہ کے متعلق ارباب فقہ سے الگ لیکن اہل حدیث اور اہل فقہ کے بڑے بڑے علماء اس انداز سے آپ کے پاس آتے جیسے کوئی شاگرد استاد کے پاس، یا کوئی خود اپنے بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ ملت اسلامیہ کا درد ان کے رگ و پے میں سرایت کئے تھا۔ مصر، ہوا حجاز، شام، ہوا ترکی، ایران، ہوا ہندوستان، کہیں مسلمانوں پر کوئی آفت آئے، مولانا مضطرب و پریشان ہو جاتے اور ان کی خیر طلبی کی دعائیں مانگنے لگتے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ رات کو ۳ بجے کے قریب اٹھتے، تہجد پڑھتے، حفظ کردہ قرآن کی منزل دہراتے۔ اس کے بعد نہایت عجز و الحاح سے دعائیں مانگتے۔ اپنے لئے قرآن سمجھنے اور قرآن پر چلنے کی دعا اور باقیوں کے لئے اس عمومی دعا کے علاوہ ان کی پریشانی دور ہونے کی دعائیں۔ (ان دعاؤں میں میرا نام السرا شامل ہوتا اور چہ عجب کہ اب تک شامل ہوتا ہوا) افراد کے بعد ملت کی اجتماعی بہبودی کے لئے دعائیں مانگتے۔ اس کے بعد اللہ کے حضور ایک خاص سجدہ شکرانہ گزارتے، جس میں نہایت عجز اور مسرت سے کہتے کہ مجھ سے زیادہ اس دنیا میں خوش نصیب کون ہو سکتا ہے جسے اے میرے پروردگار، تیرے سوانہ دنیا میں کسی کی محتاجی ہے نہ کسی کا ڈر۔ وہ اس دوران میں مجھے کبھی نہ جگاتے۔ سمجھتے کہ میری عمر ابھی سونے کی ہے۔ (اگرچہ میں ایسی کچی نیند کا واقع ہوا ہوں کہ ذرا سی آہٹ سے میری آنکھ کھل جاتی اور اب تک یہی عالم ہے لیکن میں نیم بیدار نیم خفت بستر پر پڑا رہتا تھا کہ ان کے تحلیل میں خلل انداز نہ ہوں) اس کے بعد وہ تھوڑی سی ورزش کرتے اور مجھے آواز دیتے کہ صبح کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ مکان سے ملحقہ مسجد میں نماز کے لئے جاتے۔ وہاں کا امام، عام ”بچی وٹی“ والا امام تھا لیکن مولانا ہمیشہ اسی کے پیچھے نماز پڑھ دیتے۔ مجھے کبھی کبھی اس کا بھی خیال آتا لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر روک دیتے کہ یہ امام محلہ والوں کا منتخب کردہ امام ہے، اس لئے نماز اسی کو پڑھانی چاہیئے۔ نماز سے واپسی پر چائے ملتی۔ دو پیالی چائے۔ (خواہ کسی برائڈ کی ہو بلکہ برائڈ کا لفظ تو میں نے استعمال کیا ہے۔ وہاں کبھی برائڈ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا) اور اس کے ساتھ ایک پیسے والا نان پاؤ۔ یہ ہوتا عام طور پر ان کا ناشتہ لیکن (جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں) چائے کا وقت تو ان کے لئے (غالب کے الفاظ میں) ”شگفتن گل ہائے ناز“ کا وقت ہوتا۔ میں اُس زمانے میں چائے نہیں پیتا تھا۔ اس لئے چائے کے وقت سب سے پہلا موضوع میری یہی ”کم نصیبی“ ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی دلچسپ لطائف اور کتب محاضرات کے شہ پارے، عربی، فارسی اور اردو کے نہایت پاکیزہ اور بلند پایہ اشعار۔ بعض اوقات خود اپنے (پڑانے) اشعار بھی

(کیونکہ اس زمانے میں انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا تھا) چائے کے بعد حقہ کی ایک چلم۔ پھر وہ جامعہ تشریف لے جاتے اور میں دفتر آجاتا۔

مولانا کی "دردیشی" کا یہ عالم تھا کہ وہ علی گڑھ کالج کی پروفیسری چھوڑ کر جامعہ میں آئے تھے۔ (جامعہ میں چھوٹے بڑے سبب ان کی عزت کرتے اور ان کا نام بڑی ہی عقیدت اور احترام سے لیتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عزت اور عقیدت کے بجائے "محبت" کا لفظ اس کیفیت کا زیادہ بہتر ترجمان ہوگا۔) جامعہ پر اس زمانے میں بڑی عسرت کا دور تھا۔ ویسے تو وہاں تمام اساتذہ کا مشاہرہ اسی روپے مقرر تھا لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے ملتے صرف چالیس ہی تھے۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ یہ چالیس بھی کئی مہینوں تک نہ مل سکے۔ میں نے مولانا کو اس زمانے میں بھی کبھی پریشان نہ دیکھا۔ مجھ پر اس کا اثر تھا لیکن ان پر اس کا مطلقاً کوئی اثر نہ تھا۔ وہ بالکل ویسے ہی مطمئن اور شاداں و فرحاں زندگی بسر کرتے۔ وہ جو اقبالؔ نے کہا ہے۔

_____ با اضطراب موج سکونِ گہر بدہ _____ تو میں نے مولانا کے قلب کو اس کا یہ صحیح منظر پایا۔ انہوں نے اپنی زندگی کو اس قدر سمار رکھا تھا کہ جس مقام پر لوگ عسرت محسوس کرنے لگتے ہیں وہ ان کی زندگی کا معمول بن چکا تھا لیکن یہ سٹاؤ بھل کی وجہ سے نہ تھا بلکہ سیر چشمی اور مومنانہ استغناء کی بنا پر تھا۔ (میں مولانا سے بعد معذرت اس حقیقت کا انکشاف کر رہا ہوں کہ) ان کی آمدنی کا بیشتر حصہ مستحقین کی امداد میں صرف ہوتا تھا اور وہ اس کا کسی کو علم تک بھی نہیں ہونے دیتے تھے اور اس امداد کی بعض شکلیں بھی عجیب ہوتیں۔ (مثلاً) ایک دفعہ کا ذکر ہے (اور یہ اس زمانے کے بعد کا واقعہ ہے) جب میں ان کے ہاں قیام پذیر تھا کہ ایک شام میں ان کے ہاں پہنچا تو کھانے کا وقت تھا۔ سالن میں شلغم تھے۔ معظم میاں کو شلغم ناپسند تھے۔ آلو بہت پسند تھے۔ (جب میں وہاں مقیم تھا تو "کیا پیسے لگا" کے مسئلہ پر اکثر میں اور معظم اکثریت میں ہوتے اور مولانا اقلیت میں رہ جاتے) میں نے پوچھا کہ کیا معظم یہاں نہیں جو آج پھر شلغم پک رہے ہیں۔ ہنس کر کہا نہیں۔ ان شلغموں کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ تم نے نیچے "بڑے میاں" کو دیکھا ہے۔ یہ جہلم کے رہنے والے ریٹائرڈ فوجی سپاہی ہیں۔ دو چار دن ہوئے ملازمت کی تلاش میں آگئے۔ میں نے پوچھا کہ بڑے میاں! روٹی پکانا جانتے ہو۔ کہنے لگا کہ جی ہاں! فوجی سپاہی کو کیا نہیں آتا۔ میں نے کہا اچھا ہماری روٹی پکادیا کرو۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اسے روٹی سالن کچھ بھی تو پکانا نہیں آتا۔ جب میں نے کہا کہ میاں یہ کام تو تجھ سے نہیں ہو سکے گا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے اپنی درد بھری داستان سنائی، جسے سننے کے بعد اسے الگ کر دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ اب یہ ہر روز کوئی نہ کوئی دلچسپ بات کرتا ہے۔ آج صبح میں نے کہا کہ بڑے میاں تجھے کوفتہ پکانا آتا ہے، کہنے لگا۔ "کوفتہ کوفتہ گول گول" میں نے کہا ہاں، گول گول۔ کہنے لگا! پکالوں گا۔

اب جو شام کو کھانا سامنے آیا تو اس میں شلغم ہیں۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا کہ یہی تو ہیں گول گول، گونگو (پنجاب میں شلغم کو گونگو کہتے ہیں) یہ کہہ کر مولانا کھکھلا کر ہنس پڑے۔ اس کے بعد جب تک وہ بڑے میاں خود ہی ملازمت چھوڑ کر نہیں چلے گئے، مولانا نے کبھی ایک لفظ بھی ترش روئی سے نہیں کہا۔ اس نے جو کچھ پکا دیا، ہنس کر کھالیا۔ (یا علی گڑھ کی پرانی اصطلاح میں، یوں کہتے کہ ”کھا دیا“)

دیئے تو مجھے بہت سے واقعات یاد ہیں، جن سے مولانا کی وسعتِ ظرف اور بلندئِ سیرت کا اندازہ ہو سکتا ہے لیکن ان میں ایک واقعہ ایسا ہے، جس کے نقوش میرے دل کی گہرائیوں میں اترے ہوئے ہیں۔ ایک دفعہ مولانا نے ہندوستان کے ایک نامور اہل قلم کی کتاب پر تبصرہ لکھا، جس میں بتایا کہ اس کتاب میں کتنی باتیں قرآن کے خلاف ہیں۔ یہ تبصرہ ان پر ذرا سخت پڑا۔ اس زمانہ میں خود مولانا کی ایک کتاب زیرِ طباعت تھی، جس کا ہر چار علمی حلقوں میں پہلے ہی سے ہو رہا تھا۔ ان صاحب کے مجھ سے بھی مراسم تھے۔ وہ میرے پاس آئے اور مولانا کی کتاب کو ایک فتنہ عظیم قرار دے کر کہا کہ میں اس کے خلاف لکھوں؟ میں نے کہا کہ میں جب تک اس کتاب کو دیکھ نہ لوں، اس وقت تک اس کے خلاف کس طرح کچھ لکھ سکتا ہوں۔ انھوں نے بہت اصرار کیا لیکن میں اس پر آمادہ نہ ہوا۔ جب وہ مجھ سے مایوس ہو گئے تو وجہِ معر میں پہنچے اور وہاں اس (آنے والی) کتاب کے خلاف محاذِ قائم کرنے کی کوششیں شروع کیں اور وہ اس حد تک کامیاب بھی ہو گئے کہ وہ کتاب مکتبہ جامعہ کی طرف سے شائع نہ ہو۔ یہ سب کچھ مولانا کے علم میں تھا لیکن میں نے دیکھا کہ مولانا نے ان کے متعلق نہ تو ان سے کبھی ایک حرف تک کہا اور نہ ہی ان کے ساتھ اپنے تعلقات میں کوئی فرق آنے دیا۔ یہ کچھ انہوں نے ظاہر داری کے طور پر نہیں کیا تھا، اس لئے کہ ظاہر داری مولانا کی طبیعت کے یکسر خلاف ہے۔ ان کے دل میں فی الواقعہ ان صاحب کے خلاف کوئی طال نہیں تھا۔ چنانچہ اس کے بعد کئی مرتبہ یہ واقعہ زیرِ گفتگو آیا اور مولانا ہمیشہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ وہ معذور ہیں۔ ان کی طبیعت ہی ایسی ہے۔ ان کے علاوہ کئی اور لوگ بھی تھے جو آئے دن مولانا کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے اور ان میں بعض نہایت پست سطح پر بھی اتر آتے لیکن میں نے ان میں سے کسی کے خلاف مولانا کی زبان سے ایک لفظ بھی سختی کا نہیں سنا۔

یوں تو اس عرصہ میں مولانا سے ہر ملاقات ایک نہ ایک اثر چھوڑ جاتی تھی لیکن شروع جنوری ۱۹۳۸ء میں لاہور کا سفر ایک یادگار واقعہ ہے۔ انظر کا لجینٹ مسلم برادر ہڈ کے زیرِ اہتمام لاہور میں (غالباً پہلا) یومِ اقبال سنایا گیا اور اس میں شرکت کے لئے اجاب دہلی کا قافلہ مولانا کی زیرِ قیادت روانہ ہوا۔ افرادِ کارواں میں واقع الحروف کے علاوہ محترم اسد ملتانی صاحب، شیخ سراج الحق اور (ہمارے ایک مرحوم دوست) قاضی محمد اشرف تھے۔ یومِ اقبال کے اجتماعات میں شرکت کے

علاوہ خود علامہ اقبالؒ سے (ہماری آخری) ملاقات زندگی کے ناقابل فراموش لمحات میں سے تھی۔ اس تقریب اور اس ملاقات کا حال خود مولانا نے بھی ایک مضمون میں قلم بند فرمایا تھا (جو غالباً رسالہ نیرنگ خیال کے اقبال نمبر میں شائع ہوا تھا) نیز علامہ اقبالؒ سے اس آخری ملاقات کی روداد میں نے بھی ایک مقالہ میں محفوظ کر لی تھی جو طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا۔ (اب یہ روداد علامہ اقبالؒ سے متعلق میرے مجموعہ مضامین میں شامل ہوگی) ۱۹۳۸ء میں طلوع اسلام شائع ہوا، تو مولانا نے اسے اپنی خصوصی (قلمی) اعانت سے نوازا۔ جب جامعہ اوکھلا میں چلا گیا (جو نواحات دہلی میں ایک بستی ہے) تو صورت یہ رہتی کہ جمعہ کے روز (جب جامعہ میں چھٹی ہوتی) مولانا میرے ہاں تشریف لاتے اور اتوار کے دن میں مع اپنے دیگر اجاب کے، جو مولانا سے بھی اتنے ہی قریب تھے جتنے مجھ سے، اوکھلا چلا جاتا۔ یوں تو مولانا کے ملنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، جس کی دو سقیمیں ہندوستان سے باہر تک پھیلی ہوئی تھیں، (اب بھی ہیں) لیکن جو خصوصی اور قلبی تعلق انہیں اس حلقہ اجاب سے تھا، وہ شاید کسی اور کے حصہ میں نہ آیا ہوگا۔ اس اعتبار سے اس حلقہ اجاب کی مجلس ایک خاص رنگ لئے ہوتی تھی۔ اتوار کی دوپہر باہر دھوپ میں چارپائیاں بچھ جاتیں۔ دریا کی تازہ مچھلی آجاتی کر دھائی چڑھ جاتی۔ مچھلی تلی جا رہی ہے اور اہم ترین مسائل و حقائق پر گفتگو ہو رہی ہے۔ اجاب میں بے لوث تعلق، قلبی یگانگت، مخلصانہ محبت، خیالات میں یک نگیں، ذوق کی ہم آہنگی، باہمی کوئی راز نہیں، درمیان میں کوئی پردہ حائل نہیں، کسی قسم کی مغایرت نہیں۔ ایک دوسرے میں کسی غلط فہمی کا اندیشہ نہیں۔ فرق مراتب ضرور ملحوظ رکھا جاتا لیکن مولانا نے اپنے آپ کو کبھی باقی اجاب سے بڑا محسوس نہیں ہونے دیا۔ ان محفلوں کے متعلق میرے ہی نہیں بلکہ دیگر اجاب کے بھی یہ تاثرات تھے کہ مولانا کی موجودگی میں دل کو ایک خاص قسم کا انبساط اور سکون حاصل رہتا تھا۔ محفل کیا، حقائق و لطائف کی سمیٹی ہوئی دینا ہوتی۔ گفتگو نہایت متین لیکن شگفتہ و شاداب، پُر مغز لیکن صاف اور سادہ، ٹھوس لیکن رداں اور شیریں، موضوع ہمیشہ واقعات اور اشیاء سے متعلق ہوتے۔ ذاتیات ان میں کبھی نہ آنے پاتیں۔ اگر کسی کی ذات درمیان میں آ بھی جاتی، تو نہ کسی کی بے جا تعریف ہوتی نہ ناحق تنقیدیں۔ مولانا کا حافظہ اتنا قوی تھا (اور خدا کرے اب تک ایسا ہی ہو) کہ واقعات کی جزئیات اس طرح بیان کئے جاتے، جیسے کتاب پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ یہ محفلیں درحقیقت ہماری درسگاہ تھی۔ اور اب محسوس ہوتا ہے کہ حاصلِ زیست بھی۔

اسی دوران میں میری کتاب معارف القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی، جس کا مقدمہ مولانا نے (بکمال عنایت) خود تحریر فرمایا۔ اس کے بعد اس کی دوسری اور تیسری جلد بھی ویں شائع ہوئی۔ قرآنی تحقیق کے اس تمام دشوار گزار مراحل میں مولانا کی رفاقت اور شفقت میرے لئے ہر مقام پر وجہ تقویت رہی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اسے ان کی طرف سے حوصلہ افزائی

کہوں یا غایتِ شفقت کہ جب لوگ ان کے پاس قرآنی مطالب سمجھنے کے لئے آتے، تو آپ انہیں میرے پاس بھیج دیتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ میری موجودگی میں لوگ ان کے پاس آتے، تو آپ میری طرف اشارہ کر دیتے۔ میں نے کئی مرتبہ عرض کیا کہ آپ کی موجودگی میں مجھے لب کشائی کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ ایک مرتبہ میرے زیادہ اصرار پر فرمایا کہ قرآن کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے سامنے اپنے زمانے کے تقاضے ہوں۔ تم اس دور کے تقاضوں کو بہتر سمجھتے ہو، اسی لئے قرآن کو بھی بہتر سمجھ سکتے ہو اور سمجھا بھی ہے، اس لئے یہ فریضہ اب تمہیں ہی ادا کرنا ہوگا۔ آپ غور فرمائیے کہ اس قسم کی کشادہ ظنی، وسعتِ قلب اور بلند نگہی، قرآن کے علاوہ اور کون سی چیز پیدا کر سکتی ہے۔ اتنا ہی نہیں، کئی مسائل ایسے بھی آجاتے، جن میں مجھے ان سے اختلاف ہوتا۔ وہ ان مقامات پر مجھے ٹوکنے، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنے خیال کو مجھ پر زبردستی ٹھونسے کی کوشش کی ہو۔ وہ دلائل و براہین سے مجھے سمجھانے کی کوشش فرماتے لیکن اگر اس کے باوجود میں کہہ دیتا کہ میرا اس سے اطمینان نہیں ہوا تو ماتھے کی شکن تو ایک طرف، دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے متعلق کسی قسم کی کبیدگی پیدا نہ ہوتی۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ ان کی موجودگی میں کسی نے مجھ سے کسی ایسی بات کے متعلق پوچھ لیا جس میں ان کا خیال مجھ سے مختلف تھا۔ میں نے اپنے خیال کے مطابق بات سمجھانی شروع کر دی۔ مولانا نہایت خاموشی سے رہتے اور حقیقت پتے پتے کبھی مداخلت نہیں کی لیکن جب میں مستفسر سے کہہ دیتا کہ اس باب میں مولانا کا خیال کچھ اور ہے اور وہ ان کی طرف رجوع کرتا تو پھر آپ پوری وضاحت سے اپنے خیال کو پیش کرتے۔ مولانا سے اخذ فیض کا یہ ”حسین و سادہ و رنگین“ سلسلہ اسی طرح جاری تھا کہ تقسیم ہند کا زمانہ آگیا۔ میں (او) اس صلقہ کے دیگر اجاب (اس زمانے سے ”پاکستانی“ واقع ہوئے تھے، جب (۱۹۴۷ء میں) علامہ اقبالؒ نے اپنے الہ آباد کے خطبہٴ صدارت میں اسکی طرف اشارہ کیا تھا۔ لہذا ہمارے لئے تشکیلِ پاکستان، جن مسرتوں اور شادمانیوں کا موجب ہو سکتی تھی، وہ ظاہر ہے۔ لیکن اس ہجومِ مسرت میں یہ خیال ہم سب کے لئے وجہٴ ہزار اضطراب تھا کہ مولانا پاکستان نہ جاسکیں گے۔ اس خیال سے بالخصوص جو کچھ میرے دل پر گزری تھی، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بہر حال، یہ افراد کارواںِ خون کی ندیاں پیرتے اور آگ کی خندقیں پھاندتے کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گئے لیکن مولانا وہیں رہ گئے۔ اتنے برسوں کے بعد، مولانا سے اس طرح علیحدگی کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس لئے مجھے ان کی کمی ہر سانس میں محسوس ہو رہی تھی۔ مولانا نے میرے اس اضطراب کو محسوس فرمایا اور (ان کا کرمِ ملاحظہ فرمائیے کہ) تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ میرے پاس (کراچی) تشریف لے آئے اور اس طرح پھر سے میرے گھر کی تائیکیاں نور سے بدل گئیں اور دلی کی محفلیں پھر سے تازہ و سرسبز ہو گئیں لیکن مولانا کا یہ آنا عارضی تھا۔ اس لئے کچھ عرصے کے بعد وہ واپس تشریف لے گئے۔

اس کے بعد میں اب تک اسی امید میں دن گزار رہا ہوں کہ شاید کبھی حالات مساعد ہو جائیں اور مجھے اس چشمہ علوم و معارف سے، اتنے عرصہ کی تشنہ کامی کا صلہ مل جائے، اگرچہ اس باب میں مولانا کے جوابات ابھی تک حوصلہ شکن ہیں۔ چنانچہ ان کا جو حالیہ خط موصول ہوا ہے۔ جو میرے اس خط کے جواب میں تھا جس میں میں نے ضمناً ذکر کیا تھا کہ بعض احباب کے تقاضے پر، میں آپ سے اپنے روابط کے متعلق کچھ لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں [اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

ان ملاقاتوں کے سلسلے آپ کو بخوبی یاد ہوں گے جس میں آپ نے حدیث اور تیز قرآن کے متعلق اتنا کچھ سمجھ لیا کہ مجھ سے بھی آگے نکل گئے۔ بلکہ کبھی کبھی مجھے دامن پکڑ کر پیچھے کھینچنا پڑا۔ کل آپ کا کارڈ ملا۔ اس وقت میں ایک ادبی محفل میں صدارت کر رہا ہوں جس میں ----- بھی تھے۔ انہوں نے بھی آپ کے شوق ملاقات کا پیغام پہنچایا۔ مگر میں تو ایک بار پہلے بھی آپ کو لکھ چکا ہوں کہ ”وہ قطرہ ہوں شبنم کا جو خار مغیلاں پر پیرانہ سالی کہیں کے سفر کی اجازت نہیں دیتی سوائے ایک سفر کے

محمد اسلم - جامعہ نگہ - دہلی

بایں ہمہ، میں مایوس نہیں ہوں۔

یہ ہے مولانا سے میرے روابط کی داستان، جسے میں نے بعض احباب کے تقاضے پر مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ باقی رہے خود مولانا تو ان کے متعلق اگر آپ مجھ سے دو لفظوں میں پوچھنا چاہیں تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ اس وقت میری نگاہوں کے سامنے کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں جس کے افکار و کردار دونوں میں قرآن اس وسعت اور گہرائی سے سمایا ہو۔ اللہ تعالیٰ انہیں تادیر سلامت رکھے۔

نورِ قرآن درمیان سینہ اش
جامِ جم شرمندہ آئینہ اش

[یہ تعارف مارچ ۱۹۵۵ء میں لکھا گیا تھا۔ افسوس کہ اُسی سال دسمبر میں مولانا دہلی میں انتقال کر گئے]

پروفیسر ٹوئن بی سے چھ سوالات

پروفیسر ٹوئن بی (TOYN BEE) علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُن کی ساری عمر تہا زیب عالم کی تحقیقات اور مطالعہ میں گزری ہے اور اس کی زندہ شہادت ان کی وہ مقررہ آرا کتاب ہے جو (A STUDY OF HISTORY) کے عنوان سے دس ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ آپ اس کے موثر خیال سے متفق ہوں یا نہ ہوں، یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے اس دور کا جو ترکہ آنے والی نسلوں کی طرف منتقل ہوگا، اس میں یہ کتاب ضرور شامل ہوگی۔ اس میں شبہ نہیں ہے اس سے پہلے اسپنگ لور کی بلند پایہ کتاب (DECLINE OF THE WEST) بھی اس موضوع پر ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کی اہمیت میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی لیکن ٹوئن بی کا اُفق نسبتاً وسیع اور اس کی نگاہ مقابلہ کشادہ ہے۔ انہی پروفیسر ٹوئن بی سے پچھلے دنوں نیویارک ٹائمز کے نمائندوں نے عند الملاقات چھ سوالات پوچھے یہ سوال اور ان کے جواب ”ریڈنر ڈائجسٹ“ کی جون ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں شائع ہوئے ہیں۔ انکی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر انہیں ’معدہ پرویز‘ صاحبہ کے ہدیہ قارئین عیا جاتا ہے۔ (حلولِ اسلام اگست ۱۹۵۵ء)

پہلا سوال: تہذیب مغرب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ فنا ہو جائے گی یا باقی رہے گی؟
 جواب: میں کبھی ناامید نہیں ہوا کرتا۔ میرا خیال ہے کہ تہذیب مغرب کو نہ زوال آئے گا اور نہ ہی یہ فنا ہوگی۔
 اتنا اضافہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اس سے یہ مطلب نہیں کہ یہ خود بخود آگے بڑھتی اور بلند ہوتی چلی جائے گی۔
 میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ چیز ہم اہل مغرب کے امکان میں ہے کہ ہم کوشش کر کے اپنی تہذیب کو بچا سکتے
 ہیں۔ مجھے اس کی توقع ہے کہ وہ تخریبی قوتیں جو آج ہمارے سامنے آرہی ہیں، ہم میں ایک ایسا جذبہ پیدا
 کر دیں گی، جس سے ہم اپنی غلط روش سے تائب ہو کر اپنی اصلاح کریں گے اور زندگی کی ایک نئی شاہراہ
 پر چل پڑیں گے۔

سوال یہ ہے کہ اگر تہذیب مغرب ایک متارع عزیز ہے تو پھر اس سے تائب ہو کر ایک
 تبصرہ نئی روش پر چلنے کے معنی کیا ہیں؟ جب ہم موجودہ روش سے تائب ہو کر ایک نئی روش
 پر چل نکلے تو پھر یہ کہنا غلط ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب کا مستقبل شاندار ہے۔ اس تہذیب کو تو ہم نے اس دن چھوڑ
 دیا، جب ہم ایک نئی شاہراہ پر چل پڑے۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی تہذیب میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ انسانی امن اور فلاح کی ضامن بن سکے۔ اس
 کی بنیادی کمزوریاں یہ ہیں کہ وہ

(۱) نوع انسان کی عالمگیر برادری کے تصور کے بجائے قومیت کے تنگ دائروں میں گھری ہوئی ہے۔ ان دائروں میں
 مسلسل تصادم کا موجود رہنا ناگزیر ہے۔

(۲) اس کے پاس کوئی غیر متبادل اصول ایسے نہیں، جن پر ہر حالت میں عمل پیرا رہنا اہل مغرب کا ایمان ہو۔ نتیجہ یہ
 کہ ان اقوام کے فیصلے ان کی مصلحتوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

(۳) یہ تہذیب خدا کے قانون مکافات عمل پر ایمان نہیں رکھتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو قوم اتنی قوت فراہم کر لیتی
 ہے کہ اسے دوسری قوموں کی مخالفت کی پروا نہ رہے، وہ بلاتامل سب کچھ کرتی چلی جاتی ہے۔

ہمارا یہ منہ تو نہیں کہ ہم اہل مغرب کو ان کی کسی روش پر ٹوکیں، اس لئے کہ ہم تو اپنی زیست تک کے لئے ان کے
 محتاج ہیں لیکن قرآن کی دی ہوئی بصیرت کے ماتحت ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جس تہذیب کی بنیاد خدا کی
 متعین کردہ غیر متبادل اقدار پر نہ ہو، اس کی تقدیر میں فلاح اور بقا نہیں ہو سکتی۔

دوسرا سوال کیا روس اور جمہوری اقوام مغرب سفر زندگی میں دوش بدوش چل سکتے ہیں۔

جواب ۱: جی ہاں! تاریخ کا تجربہ ہمیں ایسا ہی بتاتا ہے۔ سترھویں صدی میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کا خیال یہ تھا کہ جب تک دوسرا فرقہ ختم نہیں ہو جاتا ان کے لئے جینا ناممکن ہے۔ اسی طرح صلیبی جنگوں کے زمانے میں ایسے عیسائی اور مسلمان موجود تھے، جن کا خیال یہ تھا کہ جب تک دشمن کے مذہب کو نیست و نابود نہ کر دیا جائے۔ ہماری بقا محال ہے۔ بائیس صدیاں گزر گئیں اور یہ فرقے اور گروہ بدستور موجود ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ روس اور جمہوری اقوام کو دوش بدوش رہنے میں کچھ ناگواری بھی ہوگی اور خطرات بھی لیکن یہ اس وقت تک ہوں گے، جب تک ہم یہ سمجھتے رہیں کہ ہمیں مجبوراً ایک دوسرے کے ساتھ چلنا ہے لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ ایک تیسری عالمگیر جنگ نہ ہونے پائے تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور باہمی اعتماد بھی پیدا کریں۔ دور اندیشی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ایسی راہیں نکالیں جن سے ہمیں ان مسائل کے حل کرنے میں جن سے آج روس اور جمہوری قومیوں دونوں کو واسطہ پڑ رہا ہے، ایک دوسرے سے تعاون کریں۔

تبصرہ | اس میں شبہ نہیں کہ دنیا میں مختلف نظریات زندگی رکھنے والی قومیں دوش بدوش چلتی جاتی ہیں لیکن فطرت کا اٹل قانون یہ ہے کہ بقا اسی نظام کے حصّہ میں ہے جو عالمگیر انسانیت کے لئے نفع رساں ہو۔ **وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَمَا شَاءَ اللّٰهُ** (۱۳/۱۷) فطرت کا اٹل فیصلہ ہے۔

تیسرے سوال: وہ اہم مسائل حیات کیا ہیں جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔

جواب ۱: سب سے پہلی چیز یہ کہ ہم تیسری جنگ عظیم کو کس طرح سے روک سکتے ہیں۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو جائیں تو پھر اگلا سوال یہ ہے کہ دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کی مد بندی کیسے کی جائے۔ صحت کے متعلق حفاظتی تدابیر کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی آبادی اس سرعت سے بڑھ رہی ہے کہ یہ خطرہ ہے کہ ایک دن پوری نوع انسان بھوک سے نہ مر جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم افزائش نسل کے متعلق اپنی ذہنیت میں جلد سے جلد تبدیلی پیدا کریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جس قسم کی عائلی زندگی ہم بسر کر رہے ہیں، اس میں یہ مشکل ہے کہ ہم اپنی عادات کو جلدی سے بدل لیں یعنی یہ مشکل نظر آتا ہے کہ ہمارے مردوں اور عورتوں کے ذہن میں یہ بات آسکے کہ بچوں کی تعداد کا مسئلہ ایسا ہے جس میں باہر کی دنیا والے بھی دخل اندازی کا حق رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان بچوں کی غذا اور سامان پرورش کا انتظام تو انھی باہروں ہی نے کرنا ہے۔

اگر ہم نے جنگ کو روک دیا اور افزائش نسل پر بھی پابندیاں عائد کر دیں تو اس کے بعد تیسرا اہم سوال مذہب کے

اجیا کا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ انسان آزادی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور اس کی روحانی زندگی کا دائرہ ایسا ہے جس میں اسے سب سے زیادہ آزادی کی ضرورت ہے۔ لہذا آنے والی دنیا کا جو نقشہ سامنے آرہا ہے اس میں شاید مذہب کا میدان ہی ایسا ہوگا جس میں انسان کو آزادی حاصل ہوگی۔

میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آج کل تین قوتیں ایسی ہیں جو آزادی کے خلاف نہر آزمائیں اور ہمارے معاشرے کو آمریت کی طرف لے جا رہی ہیں، یعنی بڑھتی ہوئی آبادی کا دباؤ، نئے نئے آلات حرب اور عمرانی عدل کا تقاضا۔ جہاں تک سیاست اور معیشت کا تقاضا ہے، یہ نظر آتا ہے کہ فرد کی آزادی دن بہ دن کم ہوتی جا رہی ہے۔ لہذا اگر ہم نے مذہب کے معاملے میں بھی آزادی کو برقرار نہ رکھا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آزادی دنیا سے بالکل معدوم ہو جائے گی۔ اور اگر آزادی ہی معدوم ہو گئی تو پھر انسان، انسان نہیں رہے گا۔

تبصرہ | حیرت ہے کہ پروفیسر ٹوئن بی نے قومیت اور رزق کی صحیح تقسیم کو ان اہم مسائل میں شمار نہیں کیا، جو امنِ عالم کے لئے اس قدر خطرہ کا موجب بنے ہوئے ہیں۔ افزائشِ نسل پر پابندیوں کا خیال بجا اور درست لیکن جب تک دنیا کا نظام ”رب العالمین“ کی بنیادوں پر قائم نہیں ہوتا، ہمارا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ ”رب العالمین“ کا تصور ہی صحیح آزادی بھی دے سکتا ہے کیونکہ اس کی رُو سے معاشرہ، حکومت یا نظام کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فرد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما کرے، یعنی اس نظام میں فرد کو معاشرہ کی قربان گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھایا جاتا بلکہ معاشرہ فرد کی نشوونما کا ذریعہ بنتا ہے۔

چوتھا سوال، اگر مذہب کا احیاء نہ ہوا تو مغرب پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟

جواب، اگر ایسا نہ ہوا تو مغرب کا مستقبل خوش آئند نہیں ہو سکے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے مغربی اندازِ زندگی میں فرد کی تقدیس کو اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ انسانی ذات کی قدر و قیمت سے انکار کرتی ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ فرد صرف جماعت کے لئے ہوتا ہے۔ اگر ہم نے اپنے مغربی تصورِ حیات کو برقرار رکھنا ہے تو اسے محکم بنیادوں پر قائم کرنا ہوگا۔ اس کی اصلی بنیادیں مذہب ہی پر قائم تھیں۔ ہم اہل مغرب کے دلوں میں فرد کی تقدیس کا جو تصور موجود ہے تو اس کا سبب بھی یہی ہے کہ یہودی اور نصاریٰ دونوں کے ہاں یہ عقیدہ موجود تھا کہ خدا کی نگاہوں میں انسانی ذات کی ایک مطلق قدر موجود ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر مذہب نہ رہے تو ہمارا یہ عقیدہ اور کس بنیاد پر قائم رہ سکے گا۔

تبصرہ | اس میں شبہ نہیں کہ انسانی ذات کے تقدس کا تصور وہ محور ہے جس کے گرد اس اور فلاح کا پورا نظام گھومتا ہے لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ یہ تصور یہودیت یا عیسائیت کا عطا فرمودہ ہے۔

یہودیت ہزنی آدم کو نہیں، بلکہ صرف بنی اسرائیل (بلکہ ان میں بھی صرف دو خاندانوں) کو خدا کی چہیتی اولاد قرار دیتی ہے۔ باقی رہی عیسائیت، سو اس کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرتاً گناہگار ہوتا ہے۔ نیز وہ بھی غیر اسرائیلیوں کو عزت و تکریم کا مستحق نہیں سمجھتی کیونکہ انجیل کے بیان کے مطابق 'حواریوں کو تعلیم یہ دی گئی تھی کہ "بیٹوں کی روٹی کتوں کے آگے نہ ڈالو"۔ یہ عظیم اعلان آپ کو قرآن ہی میں ملے گا کہ "وَلَقَدْ كَسَبْنَا بَنِي آدَمَ الْفِتْنَةَ ۖ وَكُنَّا لَهُمْ شَاقِّينَ" ہم نے بنی آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔

پانچواں سوال: کیا ہمارا موجودہ دور ایٹم بم اور کیونوزم جیسی بے مثل چیزوں کی رُود سے ایک منفرد دور نہیں ہے۔
جواب: ایٹم بم انسانوں کی تباہی کے لئے "پہلا آلہ جنگ" نہیں۔ یہ تو اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں اس سے پہلے بارود اور ہوائی جہاز آچکے ہیں۔ نہ ہی موجودہ اشتراکی حکومتیں وہ پہلی حکومتیں ہیں جنہوں نے کسی خاص آئیڈیالوجی یا مذہب کو شمشیر کے زور پر پھیلانے کا مسلک اختیار کیا ہو۔ جس بات میں ہمارا زمانہ منفرد ہے، وہ یہ ہے کہ جس نوعیت کی لڑائی اب لڑی جاتی ہے، اس سے پہلے کبھی نہیں لڑی جاتی تھی۔ اس سے پہلے لڑائی کا مفہوم یہ تھا کہ ایک سپاہی میدان جنگ میں خطرات کو مول لے کر یا اپنی جان دے کر ان کی محافظت کر رہا ہے جو اس کے پیچھے ہیں لیکن ایٹم بم نے میدان جنگ اور رسول آبادی کی تفریق ہی کو مٹا دیا ہے۔ اب تو جنگ سے مراد عالمگیر تباہی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ ہمارے ذرائع رسل و رسائل اس قدر تیز ہو گئے ہیں کہ ہم نے گویا فاصلہ کے تصور ہی کو مٹا دیا ہے۔ فاصلہ کے تصور کو مٹانے سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پوری نوع انسان ایک خاندان کی شکل اختیار کر لے لیکن ہم نے ایسا کرنے کے بجائے اس چیز کو خود اپنی تباہی کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جس میں اگر ہم چاہیں تو تمام نوع انسانی ایک خوش حال برادری کی طرح بھی رہ سکتی ہے اور یا سب کے سب موت کے گھاٹ اتارے جاسکتے ہیں۔

تبصرہ | ظاہر ہے کہ تمام نوع انسانی ایک برادری کی شکل اُس وقت اختیار کر سکتی ہے، جب قوموں کے موجودہ دائرے مٹ جائیں اور انسانیت کی تشکیل ایک عالمگیر آئیڈیالوجی پر ہو جائے۔ قرآن

ایک ایسے ہی نظام کا عملی تصور پیش کرتا ہے۔

چھٹا سوال: کیا آپ کا خیال ہے کہ مستقبل کیونوزم کے ہاتھ میں رہے گا۔

جواب: نہیں میرا ایسا خیال نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ کمیونزم آخر کار انسانوں کے لئے جاذبِ نگاہ بننے میں ناکام رہ جائے گی۔ اس لئے کہ انسانوں کی انفرادی مشکلات اور ذاتی تکالیف میں جس روحانی سہارے یا رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، کمیونزم میں وہ چیز نہیں۔ مجھے کسی ایسے مذہب یا آئیڈیالوجی کا علم نہیں جو انسانوں کی مشکلات میں سہارا نہ بہم پہنچاتی ہو اور اس کے باوجود وہ ان کے نزدیک جاذبِ نگاہ ہو۔ ان وجوہات کی بناء پر میرا عقیدہ یہ ہے کہ مستقبل کمیونزم کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اُس مذہب کے ہاتھ میں ہے جو انسان کو انفرادی مصائب میں روحانی سہارا دے سکے۔

لیکن اس عقیدے کو عام کرنے کے لئے ہمیں بڑی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ کمیونزم ایک بہت بڑی تحریک ہے۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے کہ ہم اس انتظار میں خاموش بیٹھے رہیں کہ ایک دن نوعِ انسانی کے سامنے کمیونزم کا پردہ خود بخود چاک ہو جائے گا اور یہ اس سے متنفذ ہو جائے گی۔ اگر ہم نے سعی و تبلیغ کی تو ہم انسانوں کو صحیح راستے پر لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہمارا ایمان صداقت پر مبنی ہے اور صداقت میں وہ قوت ہوتی ہے کہ وہ آخر الامر کامیاب جاتی ہے۔“

تبصرہ | آپ غور کیجئے کہ تاریخ کے اتنے بڑے مبصر نے اس مقام پر کتنی بڑی غلطی کھائی ہے۔ کمیونزم تو پیدا ہی اس لئے ہوئی ہے کہ جو مذہب انسانوں کے سامنے تھا، وہ ان کی مشکلات اور مصائب کا صحیح اور عملی حل پیش کرنے کی بجائے انھیں محض ”روحانی سہاروں“ پر جینے کی تلقین کرتا تھا۔ یہ سہارے صرف عقیدہ کی بنیادوں پر قائم رہ سکتے تھے۔ جب انسانوں نے دیکھا کہ وہ سہارے ان مشکلات کا صحیح حل پیش نہیں کرتے تو انھوں نے ان سہاروں کو چھوڑ دیا اور کمیونزم کے آشوش میں چلے گئے۔ کمیونزم کا توڑ اس نظامِ زندگی کے اندر ہے جو افرادِ انسانیہ کی تکالیف اور مصائب کا صحیح حل پیش کرے، یعنی ایسا نظام جس میں فرد کے سامنے کوئی ایسی تکلیف اور مصیبت آئے ہی نہیں جس کے دور کرنے کی ذمہ داری تنہا اس پر ڈال دی گئی ہو۔ قرآن ایک ایسا عملی نظام پیش کرتا ہے اور نوعِ انسانی کو ایسا سہارا دیتا ہے جو محض ذہنی اور تصوراتی نہیں ہوتا بلکہ ان کی مشکلات کا حقیقی علاج بنتا ہے۔ پروفیسر ٹون بنی کے ذہن میں مذہب کا وہ تصور ہے جسے عیسائیت نے پیش کیا۔ یہ اس تصورِ مذہب کی ناکامی ہی تو ہے جس نے کمیونزم کو جنم دیا ہے۔ لہذا اُس کے احیاء سے کمیونزم کا مقابلہ کیسے ہو سکے گا؟ کمیونزم کا مقابلہ صرف قرآنی نظامِ ربوبیت کر سکتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اسے مغرب کا تحت الشعور قبول نہیں کر سکتا کیونکہ اس میں خود ان کے نظامِ سرمایہ داری کی بھی توفی ہوتی ہے اور جہاں تک پروفیسر ٹون بنی کا تعلق ہے انھیں ذرا کھرج کر دیکھئے، جلد کے نیچے سے کٹر عیسائی نکلیں گے۔

اُردو زبان میں نماز

(جون ۱۹۵۷ء)

اخبارات سے اطلاع ملی ہے کہ لاہور میں ایک تحریک بدیں غرض شروع ہوئی ہے کہ نماز (عربی زبان کے بجائے) اُردو زبان میں پڑھی جائے۔ سوال یہ ہے کہ قرآنی نقطہ نگاہ سے یہ خیال کیسا ہے؟ ظاہر ہے کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے اس کا بیشتر حصہ قرآن کریم پر مشتمل ہوتا ہے۔ لہذا یہ سوال سمٹ کر یہاں آجاتا ہے کہ کیا قرآن عربی زبان کے بجائے اُردو زبان میں پڑھا جاسکتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر، کیا قرآن کا ترجمہ (اُردو یا کسی اور زبان میں، حتیٰ کہ خود عربی زبان کے اور الفاظ میں) قرآن کہلا سکتا ہے؟ اس سوال کا دو ٹوک جواب تو یہ ہے کہ قرآن اپنے الفاظ میں خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی ہے اور ان الفاظ کی جگہ کوئی اور الفاظ خواہ وہ عربی زبان ہی کے کیوں نہ ہوں، کبھی قرآن نہیں کہلا سکتے لیکن اس ضمن میں بعض گوشوں سے مجھے جو خطوط موصول ہوئے ہیں، ان سے مترشح ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال ہے کہ خدا کی طرف سے نئی اکرم کی طرف قرآن کا مفہوم وحی ہوا تھا، الفاظ نہیں۔ چونکہ حضور کے اولین مخاطب عرب تھے، اس لئے آپ نے اس مفہوم کو ان لوگوں کی زبان میں بیان فرمادیا۔ لہذا جن لوگوں کی زبان عربی نہیں، وہ اگر قرآن کے مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کر لیں تو یہی قرآن کا بدل ہو جائے گا۔ یہ ہے وہ غلط تصور، جس کے ایک غلط خیال | ازالہ کے لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ اس نکتہ پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے ورنہ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ نماز اُردو زبان میں پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں، اس کا جواب تو ایک لفظ میں دیا جاسکتا ہے۔ یعنی — نہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں لکھا ہے کہ یہ سوال کہ قرآن کا صرف مفہوم قلبِ نبویؐ پر وحی ہوا تھا یا اس کے

الفاظ بھی، ہماری تاریخ میں ایک مرتبہ (مسئلہ خلقِ قرآن کے سلسلہ میں) بڑی شدید بحث کا موضوع بن گیا تھا۔ لیکن ایک تو اُس زمانے میں اس مسئلہ کی نوعیت کچھ مختلف تھی۔ دوسرے جن لوگوں نے اب اس سوال کو اٹھایا ہے، وہ قدامت پرست طبقہ سے متعلق نہیں بلکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ کے افراد ہیں، اس لئے مناسب یہی ہے کہ ان سے ان کی زبان میں گفتگو کی جائے تاکہ ان کے سامنے حقیقت واضح طور پر آجائے۔

وحی کا انکار | ہمارے جدید تعلیم یافتہ گروہ میں کچھ لوگ تو وہ میں جو یہ سمجھتے ہیں کہ قرآنِ کریم (معاذ اللہ) خود نبی اکرمؐ کے اپنے خیالات و تصورات کا مجموعہ ہے۔

دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو (جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے) یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے خیالات تو خدا کی طرف سے انشاء ہوئے تھے لیکن ان خیالات کو حضورؐ بیان اپنے الفاظ میں فرماتے تھے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو سرِ درست ہمارا مخاطب ہے

جنہیں سب سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ خیالات اور الفاظ میں باہمی تعلق کیا ہوتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے ضربِ کلیم میں ”جان و تن“ کے عنوان کے تحت کہا ہے۔

ارتباطِ حرف و معنی، اختلاطِ جان و تن

جس طرح اخگر قبائوش اپنی خاکستر ہے

اس شعر میں انھوں نے نہایت مختصر اور مرکب انداز سے اس فلسفیانہ بحث کو سمودیا ہے جس کی رُو سے اس اہم سوال کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ لفظ اور خیال کا باہمی تعلق کیا ہے۔ اس سوال کو انھوں نے اپنے خطبات

(خطبہ اول) میں بھی ضمنی طور پر چھیڑا ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

بہم اور بے زبان احساس (FEELING) اپنے مقصود تک پہنچنے کے لئے تخیل (IDEA) کی

شکل اختیار کرتا ہے اور تخیل اپنا لباس آپ بُن کر (لفظ کی صورت میں) مرنی طور پر سامنے آجاتا ہے۔

یہ کہنا محض استعارہ نہیں کہ تخیل اور لفظ دونوں احساس کے بطن سے بیک وقت پیدا ہوتے

ہیں۔ یہ منطقی اندازِ فہم (کا نقص) ہے جو یہ تصور کرتا ہے کہ تخیل اور لفظ ایک دوسرے کے بعد پیدا

ہوتے ہیں اور اس طرح اپنے لئے آپ مشکلات پیدا کر لیتا ہے۔ (CONCEPT)

میں تصور

ڈاکٹر بک (R.M. BUCKE) اپنی مشہور کتاب (CONSCIOUSNESS)

اور لفظ کے باہمی تعلق کے سلسلے میں لکھتا ہے:

ہر لفظ کے لئے ایک تصور ہوتا ہے اور ہر تصور کے لئے ایک لفظ۔ ایک دوسرے سے الگ رہ کر ان کا وجود ہی باقی نہیں رہ سکتا۔ کوئی نیا لفظ معرض وجود میں نہیں آ سکتا، جب تک وہ کسی تصور کے اظہار کا ذریعہ نہ ہو اور کوئی نیا تصور پیدا نہیں ہو سکتا، جب تک اس کے ساتھ ہی اس کے اظہار کے لئے ایک نیا لفظ وجود میں نہ آجائے۔ (ص ۲۷)

پروفیسر اربن (W.M URBAN) نے اپنی کتاب (HUMANITY AND DEITY) میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے کہ وجدان (INTUITION) اور الفاظ کا باہمی تعلق کیا ہے۔ وہ کروش (CROCH) کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ

الفاظ کے بغیر وجدان کا وجود ہی ناممکن ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص پہلے کسی شے کا تصور کرے اور اس کے بعد اس تصور کے اظہار کے لئے الفاظ تلاش کرے۔ یہ تصور خود الفاظ سے ترتیب پاتا ہے (ص ۲۸) اس لئے وجدان کو الفاظ سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ (ص ۲۹)

اسی سلسلہ میں وہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ جو کچھ مذہب کی زبان بیان کرتی ہے، اسے دوسرے الفاظ اور اسلوب میں بیان کیا ہی نہیں جاسکتا۔ (ص ۲۹)

اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ الہامی کتابوں کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے اس نے شاعری (POETRY) کو بطور مثال پیش کیا ہے، جس سے مطلب یہ ہے کہ آپ کسی بلند پایہ شعر کا ترجمہ کر کے وہ بات پیدا ہی نہیں کر سکتے جو اس شعر کے اصل الفاظ سے پیدا ہوتی ہے۔

عصر حاضر کے مفکرین کی یہ تحقیق قرآن کے اس دعوے کی تائید کرتی ہے کہ قرآن بالفاظہ قرآن ہے۔ وہ عربی زبان کی منزل من اللہ کتاب ہے، یعنی اس کے الفاظ منزل من اللہ ہیں، جن کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ اس کا ایک ایک حرف اپنی جگہ پر ہمالیہ پہاڑ کی طرح محکم اور اٹل ہے۔

اول تو عربی زبان ہی ایسی وسیع، گہری اور جامع ہے کہ (ماہرین علم السنہ کی تحقیق کے مطابق) دنیا کی کوئی دوسری زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

عربی زبان کی وسعت

(حتیٰ کہ سائنٹفک ہونے میں بھی نہیں) ڈاکٹر پاک کی جس کتاب کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، اس میں اس موضوع پر بڑی دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ (یہ بحث اس وقت ہمارے پیش نظر موضوع سے خارج ہے۔ اس کے متعلق تفصیلی گفتگو میری لغات القرآن

میں آئے گی، جس سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ خدا نے جہاں بنی اسرائیل کو نبوت و حکومت کے لئے منتخب کیا تھا، دوسری طرف بنی اسماعیل کے ذمے (گویا) یہ فریضہ عائد کر دیا تھا کہ وہ عربی زبان کو اس حد تک (DEVELOPE) کریں کہ وہ خدا کے آخری پیغام کے اظہار کا ذریعہ بن سکے۔ یہ ہے وہ عربی زبان جس کے ان الفاظ میں جنہیں خود خدا نے منتخب کیا، قرآن نازل ہوا۔ اس کے بعد آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ کیا قرآن کے الفاظ کا بدل کوئی اور الفاظ ہو سکتے ہیں؟ بدل ہونا تو ایک طرف، قرآن کا تو لفظی ترجمہ بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو اس کے پورے مفہوم کو ادا کر سکے۔ یہ وہ حقیقت ہے، جس کا اعتراف غیر مسلم محققین تک نے کیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر گیب (H.A.R. GIBB) اس باب میں لکھتے ہیں:-

قرآن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا | جس طرح ایک بلند پایہ شعر کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں کیا

جاسکتا (اس کا انداز و اسلوب ہی جداگانہ ہوتا ہے جس میں) اس کے الفاظ اس طرح بکھر ہوئے ہوتے ہیں جس طرح (کسی حسین و جمیل) تصویر کو مختلف ٹکڑوں میں منتشر کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان ٹکڑوں سے اصل تصویر کو سامنے لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ہر لکیر کے بیچ و خم اور اس کے رنگوں کے لطیف اور نازک فرق کا، ایک طویل مدت تک ہنایت خورد خوض سے مطالعہ کیا جائے لیکن یہ معاملہ تصویر کے خطوط و الوان ہی کا نہیں بات اس سے کہیں آگے ہے۔ قرآن کے الفاظ کا صوتی اثر بھی ایسا ہے کہ سننے والے کے دل کو اس کے پیغام کی معنویت سے ہم آہنگ کرے میں اس کی موسیقی کا بڑا ہی عمل دخل ہے۔ ایسا عمل دخل جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی کتاب کو دوسرے الفاظ میں پیش کرنے کا مطالبہ یہ ہے کہ آپ اس کی اصلی صورت کو مسخ کر رہے ہیں۔ آپ سونے کی جگہ مٹی کے ڈیھلے رکھ رہے ہیں۔ آپ زمین کی دل میں پھنسی ہوئی بوجھل عقل کو لاہوتی فضاؤں میں اُڑنے والے شایین وحی کا مقام عطا کر رہے ہیں۔

آپ قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں! آپ کو معلوم ہے کہ اس سے آپ کرتے کیا ہیں؟ آپ عربی زبان کی ان تراکیب کی جگہ جو ترشے ہوئے جواہرات کی طرح مختلف پہلو کھتی ہیں، ایسے الفاظ لے آتے ہیں، جن کا مفہوم متعین ہوتا ہے اور جو محض اس جگہ ٹھونس دیئے جاتے ہیں اور اگر یہ ترجمہ لفظی ہے تو یہ اور بھی بے رنگ اور بھیکا ہوتا ہے۔ قرآن کے جو حصے

قصص یا احکام سے متعلق ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان میں یہ کمی زیادہ نقصان دہ نہ ہو، اگرچہ جب ان حصوں کا بھی لفظی ترجمہ سامنے آئے گا، تو پڑھنے والا سمجھے گا کہ یہ تو ایک عجیب بے ربط اور ہوا سی کتاب ہے اور اگر اس ترجمہ میں آپ کہیں قرآن کی جہالی نزاکتوں اور جہالی ضرب کاریوں اور خطا و قفوں کو بھی لے آئیں۔ (اگر ان کا کسی اور زبان میں منتقل کیا جانا ممکن ہوگا) تو سامعین کے دل پر اس کا عجیب اضطراب انگیز، بلکہ کارلائل کے الفاظ میں بے ہنگم سا اثر ہوگا۔ (مثلاً قرآن کی ایک سادہ سی آیت ہے۔ اِنَّا نَحْنُ حُنَّ وَنُمِيتُ قَدِ اَلَيْسَا الْمَصِيُو (۵۰/۴۳) انگریزی کیسا، دنیا کی شاید کوئی زبان بھی ایسی نہیں جو اس شدت اور قوت کا مظاہرہ کر سکے جو ان چھ الفاظ میں

پانچ مرتبہ ”ہم“ کے استعمال سے پیدا ہو رہی ہے۔ (MODERN TRENDS IN ISLAM)

یہ ہے قرآن کے الفاظ کی اہمیت اور ان کا مقام۔ آپ سوچئے کہ اگر ان الفاظ کی جگہ کسی اور زبان کے الفاظ رکھ دیئے جائیں تو کیا یہ الفاظ قرآن کے اصل الفاظ کا بدل ہو سکتے ہیں یا وہ مقصد پورا کر سکتے ہیں جس کے لئے قرآن کے اصل الفاظ آئے ہیں؟ اس کا تجربہ آپ ہر روز کرتے ہیں۔ قرآن کے اپنے الفاظ، ہمارے تراجم کا اثر گت جیسے غیر مسلم کے دل میں اثر و جذب کا ایک حشر برپا کر دیتے ہیں لیکن

جب ہم (مسلمان) اسی قرآن کا ترجمہ پڑھتے ہیں تو اس سے ہمارے دل پر کس قدر اثر ہوتا ہے، اس کے متعلق ہم میں سے ہر ایک خود واقف ہے۔ اسے کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ مثال کے طور پر سورہ ق کی اسی آیت کو لیجئے، جسے گت نے پیش کیا ہے۔ وہ ان لفظوں میں پانچ مرتبہ ”ہم“ کے استعمال سے وجد میں آ رہا ہے۔ آپ آپ اس کا ترجمہ دیکھتے۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

تحقیق ہم جلاستے ہیں اور مارتے ہیں اور طرف ہماری ہے پھر آنا۔

انگریزی زبان میں خود گت نے جو ترجمہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔

(VERILY WE GIVE LIFE AND DEATH AND UNTO
US IS THE JOURNEYING)

اسی قسم تراجم، مارا ڈلوک پکھتل، محمد علی لاہوری اور یوسف علی کے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ کیا ان تراجم سے آپ کے دل پر وہی اثر مرتب ہوتا ہے جو اصل الفاظ سے گت کے دل پر ہوا ہے؟ اس کی وجہ ہماری استعداد یا زبان کی کوتاہ دستی نہیں بلکہ قرآن کے نخل طیب کی بلندی ہے۔ اسی مشکل کے پیش نظر

میں نے "لغات القرآن" کے بعد جب "مفہوم القرآن" کا کام ہاتھ میں لیا تو اس میں قرآنی آیات کا ترجمہ نہیں دیا بلکہ ان کا مفہوم بیان کیا ہے۔ یہ مفہوم بھی کسی طرح نہ اصل کا بدل ہو سکتا ہے نہ ہی اس کی حیثیت مستقل قرار پاسکتی ہے۔ جب زمانہ کی علمی سطح اور بلند ہو جائے گی، تو یہ مفہوم بھی ناکافی ہو جائے گا۔ اگر کسی دور کے ترجمہ کو سند دوام عطا کر دی جائے تو اس سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ بالکل واضح ہیں۔ اس باب میں (مشہور مؤرخ) ڈاکٹر ٹون بی اپنی

کتاب (AN HISTORIAN'S APPROACH TO RELIGION) میں لکھتا ہے:

عیسائیت اور اسلام نے جب اپنی آسمانی کتابوں کا ترجمہ فلسفہ یونان کی اصطلاحات میں کیا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابیں بے جان اور بے روح ہو کر رہ گئیں۔ اس سے دوسری خرابی یہ پیدا ہوئی کہ زمانہ مابعد کی سائنٹفک تحقیقات نے جن صداقتوں کا انکشاف کیا، وہ یونان کے فلسفہ اور مابعد الطبیعیات سے کہیں مختلف تھیں۔ لہذا ان آسمانی کتابوں کا یونانی ترجمہ ان کی صداقتوں کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو گیا۔ یونان کا فلسفہ ایک وقتی اور مقامی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے برعکس یہ آسمانی کتابیں اپنی اصلی شکل میں زمان کی قید سے ماوراء تھیں۔ (ص ۱۲۶)

لہذا قرآن کا جو مفہوم بھی کسی ایک دور میں بیان کیا جائے، وہ وقتی ہو سکتا ہے، ابدی نہیں ہو سکتا۔ ابدیت کی سند صرف قرآن کے اپنے الفاظ کو حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کا بھی مخالف ہوں کہ قرآن کا ترجمہ بلا متن شائع کیا جائے۔ ترجمہ متن کا بدل نہیں ہو سکتا۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ نماز میں (یا کسی اور جگہ جہاں) قرآن کی آیات آنی چاہئیں، وہاں کوئی دوسرے الفاظ (خواہ عربی زبان کے بھی کیوں نہ ہوں) انہیں لائے جاسکتے اور چونکہ نماز میں قرآن پڑھا جاتا ہے، اس لئے اردو زبان میں نماز، نماز نہیں کہلا سکتی۔

کہا یہ جاتا ہے کہ جو نماز آجکل پڑھی جا رہی ہے، اس میں لوگ (باستثناء چند) نماز کے الفاظ کا مطلب ہی نہیں سمجھتے، اور انہیں بغیر سمجھ کے ہی دہرائے جلتے ہیں۔ اس لئے اس نماز سے حاصل کیا ہے۔ اس کی جگہ کیوں نہ ایسے الفاظ بولے جائیں، جن کا ہم مطلب سمجھ رہے ہوں۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ جس نماز میں الفاظ کے معنی نہ سمجھے جائیں، وہ بلا سمجھے الفاظ کا دُہرانا نماز بے مقصد اور بے روح ہوتی ہے۔ قرآن نے ایسی نماز پڑھنے سے

روکا ہے۔ سورۃ نسا میں ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ** (۴/۴۳) اے ایمان والو! تم جب نشہ یا نیند کی حالت میں ہو تو صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ، جب تک تم یہ نہ جانو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس آیت میں **حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ** سے اس حکم کی علت غائی سامنے آجاتی ہے، یعنی صلوٰۃ اسی صورت میں صلوٰۃ ہے، جب صلوٰۃ ادا کرنے والا یہ جانتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی شخص پر نشہ یا نیند کے غلبہ کی وجہ سے یہ حالت طاری ہو جائے کہ جو کچھ وہ زبان سے کہہ رہا ہے اس کا علم نہ رکھے یا جہالت کی بناء پر ایسا ہو، تو حکم دونوں کا ایک ہی ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نکتہ کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ جن الفاظ کا آپ مطلب نہیں سمجھتے، ان کے دُہرانے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ قرآن کی کھلی ہوئی تعلیم ہے۔ لہٰذا صلوٰۃ کا مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے، جب انسان اس کے الفاظ کا مطلب سمجھے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جب ہم نماز کے الفاظ کا مطلب نہیں سمجھتے، تو پھر ان الفاظ کی جگہ اُردو کے الفاظ کیوں نہ بولیں؟ ایسا کہنے کے معنی یہ ہیں کہ درد سر کا علاج سر کاٹ ڈالنا ہے۔ یہ غلط ہے۔

سردرد کا علاج

درد سر کا علاج سر کاٹ ڈالنا نہیں بلکہ اس علت کا ازالہ ہے جو درد سر کا موجب ہے، یعنی اس جہالت کا دُور کرنا جس کی وجہ سے نماز کے الفاظ کے معنی نہیں سمجھے جاتے۔ بنائیں گے کہ کام یہ ہے کہ

(۱) ہم حکومت پر زور ڈالیں کہ ملک میں ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی ہو۔

(۲) ابتدائی تعلیم میں نماز کے الفاظ کے ساتھ ان کا مفہوم بھی بتایا اور یاد کرایا جائے۔

(۳) ثانوی سے آخر تک عربی زبان لازمی قرار دی جائے۔

اس سے نماز بھی بے معنی نہیں رہے گی اور قرآن بھی سمجھ میں آجائے گا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسا کیوں نہ کر لیا جائے کہ نماز میں عربی الفاظ کے ساتھ

عربی، اُردو نماز

ساتھ اُردو ترجمہ بھی دہرایا جائے۔ یہ تجویز ناقص بھی ہے اور خطرناک بھی۔ مثلاً

۱۔ اس وقت نماز باجماعت کے علاوہ انفرادی طور پر بھی نماز پڑھی جاتی ہے۔ ختمی کہ باجماعت نماز میں بھی فرضوں کے

۱۔ میں اپنے موضوع سے بہت دُور چلا جاؤں گا ورنہ میں اس کی وضاحت کرتا کہ یہ تصور کہاں سے پیدا ہوا کہ الفاظ کا بے سمجھے دہرنا بھی ایک اثر پیدا کرتا ہے۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ تصور یکسر غیر قرآنی ہے۔

۲۔ قرآنی معاشرہ میں تو آخر تک تعلیم مفت ہوگی لیکن آغاز کار کے لئے اگر ابتدائی تعلیم ہی مفت ہو جائے تو ہمارا ایک قدم صحیح سمت کی طرف اٹھ جائیگا۔

علاوہ؛ باقی نماز الگ الگ پڑھی جاتی ہے۔ نماز باجماعت میں تو آپ ایسا کر لیں گے کہ امام کی عربی قرات کے ساتھ اُردو کے الفاظ بولتے جائیں لیکن انفرادی نماز میں اس کی کیا شکل ہوگی؟

۲۔ نیز جن نمازوں میں، یا فرضوں کی جن رکعتوں میں قرات بلند آواز سے نہیں ہوتی، ان میں اُردو ترجمہ کا التزام کس طرح کیا جائے گا؟ یا جو الفاظ کسی حالت میں بھی بلند آواز سے نہیں کہے جاتے، ان کے ترجمہ کی کیا صورت ہوگی؟ یکساں ہو گا کہ امام عربی کے ان الفاظ کو تو چپکے سے کہہ جائے اور اُردو ترجمہ پکار کر کہے؟

۳۔ یہ مثالیں تو اس تجویز کے عملی پہلو سے متعلق ہیں لیکن اس میں خطرہ یہ ہے کہ آپ نماز کی ایک اور شکل پیدا کر کے اُمت میں ایک نئے فرقے کا اضافہ کر دیں گے۔ یہ ایسا جرم ہو گا جو ان تمام (مزعوم) خواہندگان کو لے ڈوبے گا، جس کے پیش نظر آپ اس جدت کو اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھئے! قرآن کی رُوسے فرقہ بندی شرک ہے اور شرک جرم عظیم۔ ہر نئی نماز ایک نئے فرقہ کی بنیاد ہوتی ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہر فرقہ اپنی نماز سے پہچانا جاتا ہے اور اپنی نماز کی جزئیات کو علیٰ حالہ قائم رکھنے پر کس قدر متشدد ہوتا ہے، اس لئے کہ اگر اس کی نماز کی وہ جزئیات مٹ جائیں جن سے وہ نماز دوسرے فرقوں کی نماز سے متمیز ہوتی ہے تو خود اس فرقہ کا وجود معرض خطر میں پڑ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے، وہیں اس سے بچنے کے لئے۔ ”وحدتِ صلوٰۃ“ کا ذکر کر دیا ہے۔ سورہ روم میں ہے۔

وَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ دَلَا تَكْفُرُ ۚ إِنَّ الْكُفْرَ أَكْبَرُ ۚ وَمِنَ الْاِثْمِ الشِّرْكَ ۚ إِنَّ الشِّرْكَ أَكْبَرُ ۚ إِنَّ الْاِثْمَ عَظِيمٌ ۚ

کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوۡا ۖ - (۳۲-۳۱/۳۰)

”تم صلوٰۃ قائم کرو اور (مومن بننے کے بعد پھر) مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔ یعنی ان میں سے جنہوں نے دین میں فرقہ پیدا کر دیئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے اور پھر حالت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ اپنے اپنے معتقدات میں مگن ہو کر بیٹھ گیا۔“

ابھی وجہ ہے کہ میں شروع سے (نماز کو) بمعنی بنانے کی ضرورت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ (میرا مسلک) اس کی شدت سے تلقین کرتا ہوں کہ اس وقت جس جس طریق سے نماز پڑھی جا رہی ہے اس میں کسی قسم رد و بدل کرنے کا کسی فرد کو حق حاصل نہیں۔ اس قسم رد و بدل سے مختلف فرقوں کی نماز میں وحدت تو پیدا نہیں ہو سکے گی، البتہ ایک نیا فرقہ ضرور پیدا ہو جائے گا۔ وحدتِ صلوٰۃ اور وحدتِ اُمت لازم و ملزوم ہیں اور وحدت

ط۔ آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہو گا کہ سری ہارہار کی اس تلقین اور تاکید کے باوجود مخالفین ہر جگہ یہ پردہ لیکنہ کرتے ہیں کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

اُمت، صرف اسلامی نظام پیدا کر سکتا ہے۔ لہذا جب تک اُمت میں اسلامی نظام قائم نہیں ہو جاتا، نماز میں کسی قسم کی جدت پیدا کرنا، اُمت میں مزید تفرقہ پیدا کرنا ہے اور تفرقہ پیدا کرنا ایسا سنگین جرم ہے، جس کے مقابلہ میں حضرت ہارون نے کچھ وقت کے لئے بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی تک کو بھی گوارا کر لیا تھا۔ (دیکھئے ۲۰/۹۴) لہذا جو لوگ نو روزوں، تین نمازوں یا نماز اُردو یا اُردو۔ عربی نماز کی جدتیں پیدا کر رہے ہیں، وہ دین یا اُمت کی کوئی خدمت نہیں کر رہے۔ الٹا اسے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اُمت کے اصلی مرض کی تشخیص کی جائے اور اپنی توانائیوں کو اس کے مداوا میں صرف کیا جائے۔ جس درخت کی جڑ سوکھ رہی ہو، اس کے پتوں پر پانی چھڑکنا، خود پانی کا ضائع کر دینا نہیں، تو اور کیا ہے؟

پھر یہ بھی سوچئے کہ جب جماعت میں مختلف زبانیں بولنے والے لوگ شریک ہوں گے تو آپ عربی الفاظ کا ترجمہ کون سی زبان میں کریں گے؟ کیا ان تمام زبانوں میں جنہیں مقتدی سمجھتے ہوں؟ اس سے جو صورت حال پیدا ہوگی، اسے تصور میں لایا جاسکتا ہے!

بہر حال یہ ہیں اس تحریک کے خطرناک پہلو۔ لہذا کرنے کا کام یہ نہیں۔ کرنے کا کام وہی ہے، جس کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا ہے، یعنی قوم کی جہالت دور کرنے اور اسے قرآن سے قریب لانے کے لئے عملی اقدامات۔

کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

(بقیہ گذشتہ ورق سے) یہ شخص مین نمازوں کی تعلیم دیتا ہے اور وہ بھی ایک نرالی قسم کی نماز کی۔ اس سے ان کا مقصد واضح ہے۔ اس لئے کہ جب تک وہ یہ نہ کہیں کہ یہ شخص ایک نئی قسم کی نماز ایجاد کر رہا ہے، لوگوں کو یہ فریب کس طرح دے سکتے ہیں کہ یہ ایک نیا فرقہ پیدا کر رہا ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قرآن کے باطنی معانی

جون ۱۹۵۷ء

(چند اہم اشارات)

اللہ تعالیٰ نے وحی کے متعلق ایک اصول بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ وَمَا آتَيْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلسَانٍ قَوِيٍّ
ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا۔ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (۱۴/۴) تاکہ وہ ان کے لئے خدا کے پیغامات کا
اظہار واضح کر دے۔

یعنی وہ اصول یہ ہے کہ خدا کی وحی، اس رسول کی اولین مخاطب قوم کی زبان میں آتی ہے اور مقصد اس سے
یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم اس وحی کا مطلب سمجھ لے۔ اس کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَكَذَلِكَ أَفْهِمْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّتَذَرَاهُ الْقُرْآنُ وَمَنْ حَوْلَهَا

(۴۲/۴)۔ نیز (۴۶/۲)

اور اس طرح ہم نے تیری طرف عربی قرآن نازل کیا ہے تاکہ تو اہل مکہ اور اس کے گرد و نواح کے لوگوں
کو (ان کی غلط روش زندگی کے عواقب سے) متنبہ کر دے۔

عربوں کی زبان میں لفظ عربی کے معنی عربوں کی "زبان" بھی ہے اور "واضح" بھی۔ لہذا قُرْآنًا عَرَبِيًّا کے معنی ہوں گے
وہ قرآن جو عربی زبان میں ہے اور واضح ہے۔ دیگر مقامات میں اسے عَرَبِيٌّ مُبِينٌ کہہ کر بات کو اور واضح کر دیا۔
مثلاً سورہ نحل میں ہے۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ کہتے
ہیں کہ اس رسول کو کوئی آدمی آکر سکھاتا ہے۔ لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُ ذُنُوبَ الْإِنْسَانِ أَنْ يَقُولَ۔ ایسا کہتے وقت یہ
اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جس آدمی کی طرف یہ اشارہ کرتے ہیں (کہ وہ آکر رسول کو سکھاتا ہے) اس کی زبان انجی ہے۔

ظاہر طور پر متعلق ہوتے ہیں لیکن دوسرے معانی وہ ہیں جو ان الفاظ کے باطن میں پنہاں ہیں اور یہ باطنی معانی قرآن کے اصلی اور حقیقی معانی ہیں۔ ہمیں اس زمانے میں یہ عقیدہ ملتا ہے اور جیسا کہ اس زمانے میں عام رواج ہو چکا تھا، اس عقیدہ کی تائید میں اس قسم کی وضعی حدیثیں بھی ملتی ہیں کہ

ما من اية الا ظهر منها وما بطن۔

ہر آیت کا ایک ظاہری مفہوم ہوتا ہے اور ایک باطنی۔

حالانکہ جو شخص قرآن تو ایک طرف (زمانہ ظہور نبوی کے عربوں کے مزاج اور خصائص ذہنی پر نگاہ رکھتا ہے، وہ بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ عربوں کے ہاں ”باطنی تعلیم“ کا تصور تک نہ تھا۔ وہ جانتے ہی نہ تھے کہ الفاظ کے باطنی معانی بھی ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں احادیث کے جو مجموعے ہیں، ان میں وضعی حدیثیں بھی ہیں اور صحیح بھی، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان میں قرآن کی کسی آیت کی تفسیر میں یہ نہیں لکھا کہ فلاں لفظ کے باطنی معانی یہ ہیں۔ بہر حال قرآن ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ اس میں کوئی اشارہ تک بھی ایسا نہیں ملتا کہ اس کے الفاظ کے باطنی معانی بھی ہیں اور جب قرآن اس قسم کا تصور نہیں دیتا، تو ایسی حدیثیں جن سے اس تصور کی تائید ملتی ہے، لامحالہ وضعی اور جعلی ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں، مختصر الفاظ میں یہ دیکھ لینا چاہیے کہ ”باطنی معانی“ کا مطلب کیا ہے اور یہ تصور آیا کہاں سے ہے؟ ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں جن توہم پرستیوں میں مانوڑ تھا ان میں سب سے گہری چیز سحر کا عقیدہ تھا۔ اس عقیدہ کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ علمائے عمرانیات انسانی تاریخ کے اس دور کا نام ہی عصر سحر (MAGIC AGE) قرار دیتے ہیں۔ سحر کی بنیاد ہی اس عقیدہ پر ہے کہ ہر لفظ اور ہر عدد کی تہہ میں ایک باطنی معنی پوشیدہ ہوتا ہے۔ اگر انسان اس باطنی معنی کا احاطہ کرے تو اس سے عجیب و غریب کام لے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ جادو کے منتر (یا تعویذ) جواب بھی سرج میں، ایسے الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں جو یا تو بالکل بے معنی ہوتے ہیں اور اگر ان کے الفاظ با معنی ہوتے ہیں، تو عبارت بالکل مبہم ہوتی ہے۔ یہ اس لئے کہ ان منتروں میں الفاظ کے ظاہری معانی سے سرکاری نہیں ہوتا مطلب ان کے باطنی معانی سے ہوتا ہے۔

افراد کی طرح اقوام بھی اپنے زوال کے زمانے میں اس قسم کی توہم پرستیوں کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ بیت المقدس کی پہلی تباہی کے بعد، بابل کی اسیری کے زمانے میں، یہودی قوم اپنے ضعف و انحطاط کی انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ اس زمانے میں ان کا رجحان باطنی تعلیم اور سحر پرستی کی طرف مائل ہو گیا۔ (اگرچہ ان میں اس کے آثار اس سے پہلے بھی پائے جاتے تھے لیکن اس نے شدت اسی زمانے میں اختیار کی تھی) اس کا سب سے پہلا اثر یہ تھا کہ انھوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ

تورات کے الفاظ کے ظاہری معنوں کے ساتھ باطنی معانی بھی ہیں۔ چنانچہ یہودی تصوف کی سب سے اہم کتاب زہار میں ہے کہ

تورات کی روح درحقیقت اس کے باطنی معنوں میں پوشیدہ ہے۔ انسان ہر مقام پر خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ تورات کے ان باطنی معانی کا راز پا جائے۔

ان باطنی معانی کے متعلق تاکید تھی کہ ان کا علم خواص تک محدود رہے۔ عوام ان سے مطلع نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ مشنا ("کتاب حقیقت") میں لکھا ہے کہ

کتاب پیدائش کے باطنی معانی کی تعلیم ایک وقت میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو نہیں دینی چاہیے اور کتاب حزقیل کے پہلے باب کی تعلیم تو ایک آدمی کو بھی نہیں دینی چاہیے تاوقتیکہ اس نے مقام ولایت حاصل نہ کر لیا ہو۔

ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہ باطنی معانی اور حروف ابجد کے اعداد عجیب و غریب تاثر کے حامل ہیں۔ ان حروف و اعداد کے متعلق کتاب زہار میں ہے۔

خدا نے ان کے نقوش تیار کئے۔ پھر ان کے سانچے بنائے۔ ان کا وزن کیا۔ ان میں اول بدل کیا نہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملایا اور ان کے پر اسرار مجموعے کائنات کی ہر شے کی روح پیدا کی۔ چنانچہ کائنات میں جو کچھ موجود ہے، وہ بھی انہی کی قوت کے سہارے قائم ہے اور جو کچھ پیدا ہوگا وہ بھی انہی کے ذریعے پیدا ہوگا۔

یہودیت سے یہی عقیدہ عیسائیت میں آیا۔ ادھر ایران میں مجوسیت باطنی تعلیم کا گہوارہ تھی۔ یہ تھا وہ زمانہ جس میں قرآن نازل ہوا جو ان تمام توہم پرستیوں کے خلاف صدائے احتجاج تھا۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ علم و حقیقت کی دنیا میں الفاظ کے باطنی معانی کا کوئی دخل نہیں۔ قرآن علم کی بناء پر نازل ہوا ہے اور اس کے معانی صاف، واضح، غیر مبہم اور بتین ہیں۔ حتیٰ کہ اس میں جو بسیط حقائق ABSTRACT TRUTHS آئے ہیں، انہیں بھی محسوس تشبیہات میں بیان کیا گیا ہے۔ ان تشبیہات سے کیا بات سمجھانی مقصود ہے، اس کی بابت علم کی پختگی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ (۳/۶)۔ یہ تھی قرآن کی تعلیم، لیکن جب بعد میں یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت کے عقائد و مسالک، چور دروازے سے اسلام میں داخل ہو گئے، تو ہمارے ہاں بھی یہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ (تورات کی طرح) قرآن کے الفاظ کے بھی باطنی معانی ہیں اور انہی معانی سے قرآن (بلکہ ذات خداوندی) کی حقیقت کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اگرچہ یہ عقیدہ

جاسیوں کے ابتدائی دور میں ہی پیدا ہو گیا تھا لیکن جس شخص نے اسے ایک منظم فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا، وہ ہسپانیہ کے مشہور صوفی محی الدین ابن عربی ہیں، جنہیں عام طور پر شیخ اکبر کہا جاتا ہے۔ انہوں نے فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم میں اپنے باطنی عقائد کو بڑی شد و مد سے پیش کیا ہے وہی فصوص الحکم جس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا ہے کہ

اس میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔ (اقبال نامہ، جلد ۱ ص ۴۲)

شیخ اکبر کے ملفوظات اور بیہودوں کی کتاب زہار کو آٹھ سائے رکھنے اور دیکھنے کہ یہ دونوں کس حد تک ملتے جلتے ہیں۔ انہوں نے قرآن کی تفسیر اس کے الفاظ کے باطنی معانی کی رو سے کی ہے۔ یہ تفسیر کس قسم کی ہے، اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ قرآن کریم میں زمین (الارض) کے متعلق ہے۔ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى۔ (۲۰/۵۵) ہم نے تمہیں اس (زمین) سے پیدا کیا ہے۔ اس میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں بار بار نکلائیں گے

ابن عربی و وحدت الوجود کے عقیدے کے علمبردار ہیں۔ چنانچہ وہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ہم سب احدیت سے نکلے تھے۔ فنا ہو کر پھر احدیت میں جا چھپیں گے، پھر بتھاڑے گی اور دوبارہ نمودار ہوں گے۔ (فصوص الحکم)

یہاں سوال پیدا ہو گا کہ "الارض" کا مفہوم احدیت (ذات خداوندی) کس طرح لیا گیا۔ اس کے متعلق شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ اولیاء ان کے متعلق براہ راست رسول خدا سے دریافت کر لیتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ

جس مقام سے نبی لیتے تھے، اسی مقام سے انسان کامل، صاحب الزماں، غوث، قطب لیتے ہیں۔

اسی کی تشریح میں دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ

ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف و الہام کے ذریعہ خود اللہ تعالیٰ سے لے لیتے ہیں۔

یہ ہے الفاظ قرآنی کے "باطنی معانی" کی سند! یہ ایسی سند ہے جس کا کوئی ثبوت ہی نہیں مانگ سکتا۔ اس لئے کہ ثبوت مانگنے پر جواب یہ ملے گا کہ رات ہم دربار خداوندی میں گئے تھے، وہاں ہم نے اللہ میاں کو خود یہ معانی بیان کرتے ہوئے سنا۔

فرمائیے اس کے بعد آپ کیا کہیں گے۔ حتیٰ کہ جب یہ لوگ اس قسم کی تعلیم پیش کریں گے کہ فرعون

کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے کہ انادب سے الاعلیٰ کیونکہ فرعون ذاتِ حق سے جدا نہ تھا اگرچہ اس کی صورت فرعون کی تھی۔ (فصوص الحکم)

تو آپ اس پر بھی معترض نہیں ہو سکیں گے کیونکہ وہ کہیں گے کہ یہ قرآن کی فلاں آیت کا باطنی مفہوم ہے جسے ہم نے براہِ راست اللہ تعالیٰ سے معلوم کیا ہے اور یہی مفہوم حقیقی اور اصلی ہے۔ جو مفہوم الفاظِ قرآنی کے ظاہری معانی کی رُو سے متعین کیا جاتا ہے، وہ ”چھوڑی ہوئی ہڈیوں“ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ مولانا روم کا یہ مشہور شعر اپنی باطنی معنی کے متعلق ہے۔

ماز قرآن مغز را برداشتم
استخوان پیش سگاں انداختم

آپ غور کیجئے کہ یہ قرآن کے خلاف کتنی بڑی سازش تھی۔ اس سے اسلام کو جو نقصان پہنچا، اس کے متعلق علامہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا کسی قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک ہنایت لطیف (SUBTLE) طریق تہنیک کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ (اقبال نامہ جلد ۱ ص ۳۵)

اُس دن سے آج تک ہمارے ہاں یہ طریق مسلسل چلا آ رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن ہمارے ہاں عملاً منسوخ ہو چکا ہے اور ہر اس عقیدہ اور تصور کا نام اسلامی تعلیم قرار پا چکا ہے جسے اسلام مٹانے کے لئے آیا تھا۔ چونکہ اسی طریق (قرآن کے باطنی معانی متعین کرنے کے طریق) کے ایجاد یا اختیار کرنے والے اسلاف کے گرد تقدس کا نورانی ہالہ قائم ہو چکا ہے، اس لئے جذبات کی رُو میں بہہ جانے والے اس طریق کی مدافعت کرتے اور اسے مسلسل آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہی ہے وہ حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے کہا تھا کہ

وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا. وَلَئِنْ أَتَيْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاءَكَ

مِنَ الْإِعْلَامِ مَالِكٌ مِنَ اللَّهِ مِن ذَلِيلٍ ذَلَا قَاتِي. (۱۲/۲۷)

اور اس طرح ہم نے اس قرآن کو عربی میں فیصلے دینے والی کتاب بنا کر بھیجا ہے۔ اگر تو اس علم کے آجانے کے بعد ان کے جذبات کی اتباع کرے گا تو خدا کے خلاف تمہارا کوئی کارساز اور بچانے والا نہیں ہوگا۔

قرآن کی موجودگی میں باطنی معنی کے عقیدہ اور مسلک کی تائید اور مدافعت وہ جذبات پرستی ہے، جس سے قرآن نے اس شدت سے روکا تھا۔

آخر میں ہم اسے پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ قرآن عربی زبان کی واضح اور بین کتاب ہے۔ اس کے سمجھنے کا طریق یہ ہے کہ

- (۱) پہلے یہ دیکھا جائے کہ عربی زبان میں اس کے الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔
- (۲) پھر اس پر غور کیا جائے کہ معاملہ پیش نظر کے متعلق قرآن نے دیگر مقامات میں کیا کہا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔

ثُمَّ إِنِّي عَلَيْنَا لَبَّيْنَاكَ (۴۵/۱۹)

قرآن کی تشریح (اس کے معانی کو ابھار کر سامنے لانا) ہمارے ذمے ہے۔

اس کی آیات کی تفصیل خود خدا نے کی ہے۔

كِتَابٌ مُّخَصَّنَا لَكَ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنِّي حَزِينًا (۱۱/۱)

یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات پختہ بنائی گئی ہیں۔ پھر حکمت اور خبر رکھنے والے خدا کے ہاں سے ان کی تفصیل کی گئی ہے۔

قرآن کی یہ تفصیل تمہیں، تصریف آیات (یعنی آیات کو پھر پھر کر لانا) کی گئی ہے۔

وَكَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۴/۱۰۶)

اور اس طرح ہم آیات کو پھر پھر کر لاتے ہیں تاکہ وہ کہہ دیں کہ تو نے سب کچھ سمجھا دیا ہے اور تاکہ ہم اہل علم کے لئے اس کی تہنیں کر دیں۔

اس کے لئے کسی ایک موضوع کے متعلق قرآن کے تمام متعلقہ مقامات کا سامنے رکھنا ضروری ہے۔

اس کے بعد

(۳) اس کا اطمینان کر لیا جائے کہ جو مفہوم متعین کیا جا رہا ہے، وہ قرآن کے کسی مقام کے خلاف تو نہیں ہے۔

لئے کہ قرآن نے اپنے مخالفانہ ہونے کی یہ دلیل دی ہے کہ

لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (۴۲/۸۲)

اگر یہ قرآن اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بہت سے اختلاف پاتے۔
یہ ہے قرآن کے سمجھنے کا طریقہ۔ اس قرآن کے سمجھنے کا جس کے متعلق خدا نے خود کہہ دیا ہے کہ یہ سمجھنے کے لئے بڑا آسان ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّنَّا الْقُرْآنَ لِلَّذِينَ خَلَوْا مِنْ مَّوَدِّهِ (۵۴/۱۷)
”اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے بڑا آسان بنایا ہے۔ کوئی ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرے؟“

اس کی یہ آسانی اس کی زبان کی آسانی ہے۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (۵۸/۲۴ ف ۹۷/۱۹)

ہم نے اسے تیری زبان میں آسان بنا دیا ہے تاکہ یہ اس سے نصیحت حاصل کر سکیں۔

اس قسم کی روشن اور جگمگاتی کتاب (۵۴/۱۷) کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے معانی باطنی ہیں، کتاب کے دعاوی کو جھٹلانا ہے۔ جو کتاب بَيِّنَاتٍ لِّلنَّاسِ (۳/۱۳۷) اور رَبُّنَا تَبَيَّنَ لَنَا صَحِيحٌ شَيْنِي (۱۶/۸۹)

ہو، اس کے مطالب و معانی میں بطون کا کیا کام؟ بَيِّنَاتٍ کے تو معنی ہی ظہور (MANIFESTATION)

کے ہیں۔ بَيِّنَاتٍ الشَّجَرُ کے معنی ہیں درختوں کے پتے باہر نکل آئے۔ بَيِّنَاتٍ النَّقَرُ کے معنی ہیں سینک اُبھر کر باہر نکل آیا۔ ایسی کتاب کے معنی کو مخفی اور مستور سمجھنا، کتاب کے خلاف محاذ جنگ قائم کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ ذرا اس نکتہ پر غور کیجئے۔ ایک شخص قرآن کی کسی آیت کے الفاظ کے معانی محاذِ عرب کے مطابق متعین

کرتا ہے اور آیت کے مفہوم کی تائید قرآن کے دوسرے مقامات سے بھی لاتا ہے۔ آپ کو اس میں کوئی سقم نظر آتا ہے تو آپ اسے بتا سکتے ہیں کہ اس نے لغت میں فلاں مقام پر غلطی کھائی ہے اور اس کا پیش کردہ مفہوم قرآن کے فلاں مقام سے متضاد ہوتا ہے۔ اس طرح صحت و سقم میں باسانی تمیز ہو سکتی ہے لیکن اگر ایک شخص کا دعویٰ یہ ہو کہ اس نے اس آیت کا مفہوم الفاظِ قرآنی کے باطنی معانی کی رُو سے متعین کیا ہے تو آپ اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً اگر وہ یہ کہے کہ باطنی معانی کی رُو سے خمر سے مراد (معاذ اللہ) عمر ہیں اور میسرہ سے (پناہ بخدا) ابو بکرؓ۔ تو فرمائیے اس کے خلاف آپ کیا کہہ سکیں گے؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ اپنے پیش کردہ باطنی

معانی کو صحیح قرار دیں اور دوسروں کے پیش کردہ باطنی معانی کو غلط !
 آپ نے غور فرمایا کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے ؟ یاد رکھئے ! خدا کی کتاب صاف اور
 واضح عربی زبان کی کتاب ہے، جس کے باطنی معانی کوئی نہیں۔ باطنی معانی کا عقیدہ ہی غیر قرآنی ہے اور
 اسلام کے خلاف سازش۔ فہل منے مدکر۔

لاہور کا ایک علمی مذاکرہ

(فروری ۱۹۵۹ء)

نظارتِ دینیہ و عربک سوسائٹی، دیال سنگھ کالج، لاہور کی طرف سے ۱۴ جنوری ۱۹۵۹ء، تین بجے دن کے لئے ایک علمی مذاکرہ کا اعلان ہوا جس کا عنوان تھا ”اسلام، سائنس اور علومِ مشرق“۔ صدارت کے لئے جسٹس شیخ محمد شریف صاحب، سابق چیئرمین اسلامک لاکمیشن کا نام تجویز کیا گیا تھا۔ مذاکرہ میں حصہ لینے والوں کے اسماء گرامی میں لاہور کے اکثر اربابِ علم و فکر شامل تھے اور پرویز صاحب کو مخمد مبصرین دعوت دی گئی تھی۔

محترم پرویز صاحب کو اس کا علم اس وقت ہوا جب مذاکرہ سے ایک دن پہلے مطبوعہ پروگرام ان تک پہنچا۔ بایں ہمہ، دیال سنگھ کالج کے طلباء سے سابقہ مراسم کی رعایت سے وہ شریک مذاکرہ ہوئے لیکن صرف مبصر کی حیثیت سے۔ اجتماع لاہور کی روایات کا آئینہ دار تھا۔ علاوہ مختلف کالجوں کے طلباء اور پروفیسر حضرات کے، شہر کے اربابِ فکر و بصیرت کی اچھی خاصی تعداد بھی شریک اجتماع تھی اور ہال کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ ابھی ڈاکٹر رفیق احمد خان اور علامہ علاؤ الدین صدیقی ہی مقرر کر پائے تھے کہ صدر نظارتِ دینیہ (مرزا عبد المجید صاحب) نے یکایک اعلان کر دیا کہ اب چوہدری غلام احمد پرویز، اپنے خیالات سے مستفید فرمائیں گے۔ حاضرین کی طرف سے اس اعلان کا گرمجوشی سے استقبال ہوا۔ جیسا کہ ظاہر ہے، اعلان غیر متوقع (اور پروگرام کے خلاف) تھا لیکن چونکہ یہ جناب معلّٰن کے، پرویز صاحب کے ساتھ ان دیرینہ مراسم پر مبنی تھا جس کا انہوں نے اعلان کے ساتھ اظہار فرمایا تھا، اس لئے پرویز صاحب کے لئے مجالِ انکسار نہ تھی۔ چنانچہ وہ اُسٹھ اور دس پندرہ منٹ کے اندر (جو وقت مقررین کے لئے طے شدہ تھا) برجستہ تقریر فرمائی جسے قارئین کی دلچسپی اور استفادہ کے لئے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

(طوبیٰ اسلام)

صدر محترم و برادران عزیز !

اس مذاکرہ میں موضوع زیر بحث یہ ہے کہ اسلام اور سائنس کا باہمی تعلق کیا ہے ؟ ظاہر ہے کہ سائنس سے مراد وہ علوم ہیں، جن کی رو سے خارجی کائنات (اور خود انسان کی طبعی زندگی) کے متعلق تحقیق کی جاتی ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ اس تحقیق کا مدار ان معلومات پر ہوتا ہے جو حواس (SENSES) کے ذریعے حاصل کی جاتی ہیں۔ دوسری طرف جب ہم اسلام کے متعلق گفتگو کریں گے، تو ہمیں اس کے اولین اور اساسی سرچشمہ قرآن کریم کی طرف آنا ہوگا۔ قرآن علوم سائنس کی کتاب ہے، نہ کہ اس میں کیمیا اور طبیعیات کے فارمولے اور ایٹم بم بنانے کے طریقے درج ہوں۔ وہ ایک ضابطہ حیات ہے جو انسان کے قلب و نگاہ میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے، جس سے ہر شے کا صحیح مقام سامنے آجاتا ہے۔ لہذا (سمٹ سمناکر) سوال کی شکل یہ رہ جاتی ہے کہ قرآن خارجی کائنات اور ادراک بالحواس (SENSE- PERCEPTION) کے متعلق انسان کو کس قسم کا نقطہ نظر دیتا ہے ؟ کیا زاویہ نگاہ پیش کرتا ہے ؟ ان مسائل کے متعلق اس کا (ATTITUDE) کیا ہے ؟ اگر وہ نقطہ نگاہ سامنے آجائے تو اس سے اسلام اور علوم سائنس کا تعلق واضح ہو جائے گا۔

لیکن قبل اس کے کہ میں اس باب میں قرآن کا نقطہ نظر پیش کروں، چند الفاظ میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نزول قرآن سے پہلے خارجی کائنات اور ادراک بالحواس کے متعلق دنیا نے مذاہب کا (ATTITUDE) کیا تھا۔ اس پس منظر میں قرآن کا نقطہ نگاہ زیادہ واضح طور پر سامنے آسکے گا۔

جب ہم علم و فکر کی تاریخ کے متعلق بات کریں گے تو ہماری نگاہ لامحالہ خطہ یونان کی طرف اٹھے گی، جہاں کے حکماء کو اس باب میں اولیت کا مقام حاصل ہے۔ ان حکماء میں سقراط اور افلاطون کی جو حیثیت ہے، وہ ارباب علم کی نگاہوں میں پوشیدہ نہیں۔ سقراط کے نزدیک خارجی کائنات اس قابل ہی نہیں کہ اسے کسی توجہ کا مستحق قرار دیا جائے۔ وہ انسان کے لئے مطالعہ کا موضوع خود انسان کو قرار دیتا ہے۔ افلاطون اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ محسوس کائنات کا درحقیقت وجود ہی نہیں۔ حقیقی وجود عالم امثال (WORLD OF IDEAS) کا ہے جو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے، وہ اس عالم کا سایہ بلکہ ہماری نگاہوں کا فریب (ILLUSION) ہے لہذا جو معلومات ہمیں حواس کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں، وہ قطعاً اس قابل نہیں کہ ان پر اعتماد کیا جاسکے۔

افلاطون کا یہ نظریہ اگر فلسفہ کی دنیا تک محدود رہتا، تو کچھ زیادہ نقصان کا موجب نہ بنتا لیکن یہ انسانیت کی بد بختی تھی کہ اس سے مذہب کی دنیا بھی متاثر ہو گئی اور یہ نظریہ ان کے نزدیک عین حقیقت بن گیا۔ ہندو دھرم (بلکہ ان کے تصوف

ویدانت کی رو سے پرکرتی (مادہ) مایہ (فریب) کا جال ہے، سراب ہے۔ کائنات ایشور کا خواب ہے۔ جب اس کی آنکھ کھل جائے گی، تو ہستی اور اس کے تمام مناظر خود بخود معدوم ہو جائیں گے۔ کائنات کے متعلق اس تصور کا لازمی نتیجہ تھا کہ مادی دنیا کو قابل نفرت سمجھا جائے۔ اس سے دور بھاگا جائے۔ یہاں کی ہر شے کو حقارت کی نظروں سے دیکھا جائے۔ چنانچہ ان کے ہاں یہی مسلک مذہب کا منہی اور انسانی زندگی کا کمال سمجھا گیا۔

دنیا کے متعلق یہی تصور بدھ مت کی بنیاد ہے اور اسی پر عیسائیت کی عمارت استوار ہے۔ یہ تھا افلاطونی نظریہ کا اثر جس نے پوری کی پوری دنیا سے مذہب کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا کہ اتنے میں قرآن کا نزول ہوا اور اس نے طلسم افلاطون کی دھجیاں فضا میں بکھر کر رکھ دیں۔ اس نے علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی پوری تائیدات کے ساتھ اس انسانیت کش تصور کو چیلنج دیا اور حتم و یقین کے ساتھ لٹکار کر کہا کہ

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بِإِلَاطٍ ذَٰلِكَ
نُطْقُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ (۳۸/۲۷)

ہم نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، باطل پیدا نہیں کیا۔ جو ایسا سمجھتے ہیں، وہ حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔

یہ انداز منفيانہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی مثبت طور پر اعلان کیا کہ

خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ (۲۹/۲۴)

اللہ نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس میں حقیقت کو تسلیم

کرنے والوں کے لئے بہت بڑی نشانی ہے۔

کائنات کے متعلق یہ پہلی آواز تھی جو ”مذہب“ کے ایٹم سے بلند ہوئی اور اس نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ اس نے کہا کہ کائنات حقیقت (REALITY) ہے، فریب نگاہ نہیں ہے۔ یہ اس قابل ہے کہ اس پر پوری سنجیدگی سے (SERIOUSLY) غور و فکر کیا جائے۔ یہ یونہی رائیگاں جانے کے لئے (باطل) پیدا نہیں کی گئی۔ اس کی تخلیق کے پیچھے بہت بڑا مقصد (PURPOSE) ہے۔ یہ خواب نہیں، فی الواقعہ موجود ہے۔ جو اسے فریب نگاہ اور سراب سا سمجھتے ہیں، وہ کافر ہیں۔ ان کا یہ نظریہ ”علم و حقیقت پر مبنی نہیں، ظن و قیاس پر مبنی ہے۔ ان کے برعکس، جو لوگ اسے حقیقت (REALITY) سمجھتے ہیں، وہ مومن ہیں اور ان کے لئے اس میں حقائق کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

کائنات کے متعلق (صحیح اور غلط) تصور کو کفر اور ایمان کا مدار قرار دینا، نہ صرف دنیا سے مذاہب بلکہ جہانِ فکر و

نظر کے لئے بھی بڑی اچنبھے کی بات تھی۔ قرآن کی اس انقلاب آفریں آواز نے، کاروانِ انسانیت کا رخ ایک نئی سمت کی طرف موڑ دیا۔ اس سے دنیا کو کیا کچھ حاصل ہوا، اس کے متعلق ارباب فکر و بصیرت سے پوچھئے۔

کائنات کے متعلق اس قسم کا تصور دینے کے ساتھ قرآن نے علم کی ایک ایسی تعریف (DEFINITION) پیش کی ہے، جس نے انسانوں کے سامنے ایک جہان نو کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے پہلے یہ کہا کہ لَا تَقْفُ مَا كَيْفَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو، اس کے پیچھے مت لگا کرو اور اس کے بعد علم کے متعلق کہا کہ اِنَّ الشَّيْءَ الَّذِي اَبْصَرْتَهُ اَنْفُؤُكَ اَوْ لَيْتَ كَانَ عَنْهُ مَسْئَلٌ (۱۷/۳۶) یاد رکھو! تمہاری سماعت

اور بصارت اور فؤاد، ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ جس بات کو علم کہہ کر پکارا گیا تھا، اس کے ساتھ تمہاری تائید اور شہادت موجود تھی یا نہیں؟ اس سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے، علم اسے کہا جاسکتا ہے، جس کے ساتھ سمع، بصر اور فؤاد کی شہادت موجود ہو۔ قرآن سمع و بصر کا ذکر، حواس (SENSES) کے نمائندہ کی حیثیت سے کرتا ہے اور فؤاد وہ ہے، جسے آج کی اصطلاح میں (MIND) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے ان ہر دو عناصر (SENSES AND MIND) کو علم کی بنیادیں قرار دے کر کس طرح پوری کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔

سمع و بصر، ادراک بالحواس (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) کو محیط ہیں اور فؤاد (CONCEPTUAL KNOWLEDGE) کو حاوی۔ قرآن کا کہنا یہ ہے کہ تم حواس کے ذریعہ کائنات کے متعلق معلومات حاصل کرو اور پھر انہیں فؤاد کی بارگاہ میں پیش کرو تا کہ وہ ان سے صحیح صحیح نتائج مستنبط کر سکے۔

یہ ہے ہر اور ان عزیز کائنات کے متعلق وہ تصور جو قرآن نے پیش کیا اور یہ ہے ادراک بالحواس کا وہ مقام، جس کا اس نے تعین کیا۔ کائنات کے متعلق یہ تصور اور حواس کا یہ مقام آپ کو دنیا سے مذاہب میں کہیں نہیں ملے گا۔ یہ صرف قرآن کے پیش کردہ دین میں ملے گا۔ اس تصور سے انسان کی نگاہ میں جو تبدیلی واقع ہوتی ہے، اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہ کائنات کو اپنے گہرے مطالعہ کا موضوع بنائے اور اس کے محیر العقول نظام پر غور و فکر کرے۔ یہ وہ چیز ہے جسے قرآن عقل و بصیرت اور ایمان و تقویٰ کا لازمی تقاضا قرار دیتا ہے۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالاَخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ۔

یہ حقیقت ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں اور رات اور دن کی گردش میں ارباب عقل و بصیرت کے لئے نشانیاں ہیں۔

الَّذِيْنَ يَذْكُرْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَقُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ۔

یہ وہ لوگ ہیں جو کھڑے بیٹھے لیٹے، ہر وقت قوانین خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔
 وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ. اور ارض و سما کی تخلیق پر غور و فکر کرتے ہیں۔ کائنات کی ایک ایک چیز کو لیتے ہیں اور اس کے متعلق ریسرچ کرتے ہیں اور علی وجہ البصیرت پکاراٹھتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا (۱۹۰ - ۱۸۹/۳) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے کارگاہ کائنات کی کسی شے کو باطل پیدا نہیں کیا۔ یہ تمام سلسلہ ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے وجود میں لایا گیا ہے۔ یہ نہ ہی بیکار ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔

قرآن اپنے دعاوی کے اثبات کا طریقہ یہ بتاتا ہے کہ
 سَخَّرْنَاهُمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ دَعَا أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَلَبَّسَتْ لَهُمُ آذُنُهُ الْفَقْ (۴۱/۵۲)
 ہم انفس و آفاق کی دنیا میں انہیں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے۔ حتیٰ کہ یہ بات ابھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ ایک حقیقت ثابتہ ہے۔“

مطلب اس کا صاف ہے۔ جوں جوں انسانی علم آگے بڑھتا اور بلند ہوتا جائے گا، خارجی کائنات اور خود انسانی دنیا کے راز ہائے سرستہ بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے اور جو لوگ ان حقائق مستور کو یوں بے نقاب دیکھ لیں گے، ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن کا ایک ایک دعویٰ کس طرح سچا ہے۔ بالفاظ دیگر، قرآن کے دعاوی کی صدا پر علی وجہ البصیرت وہی لوگ ایمان لاسکیں گے جو خارجی کائنات اور انسانوں کی داخلی دنیا میں غور و فکر کریں گے۔

وقت ہمیں ورزہ میں اس موضوع پر قرآن کریم کی بے شمار آیات آپ کے سامنے پیش کر کے اس حقیقت کو واضح سے واضح تر کرتا چلا جاتا کہ قرآن سائنٹفک ریسرچ پر کس قدر زور دیتا ہے اور اس کے نتائج کو کس طرح علم و ایمان کے استحکام کا موجب اور حق و صداقت کی نائید کا باعث قرار دیتا ہے۔

میں نے شروع میں بتایا تھا کہ قرآن کے نزدیک علم کی تعریف یہ ہے کہ اسے سمجھ و بصیر اور فواد کی شہادت حاصل ہو۔ اسی کو علم سائنس کہتے ہیں۔ اب میں آخر میں ایک ایسی آیت پیش کرتا ہوں، جس سے آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے علماء کا لفظ ٹھیک انہی لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے، جنہیں ہم آج سائنسدان (SCIENTISTS) کہتے ہیں۔ سورہ فاطر میں ہے۔ اَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً۔ کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ اپنے قانون طبعی کے مطابق) بادلوں سے بارش برساتا ہے۔ فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّتَعَلِّقًا أَلْوَانُهَا۔ پھر ایک ہی پانی (اور سٹی) سے قسم قسم کے پھل پیدا کرتا ہے، جن کے رنگ مجدا جدا ہوتے ہیں۔ وَمِنْ الْجِبَالِ

جُدَدٌ بَيِّنٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرِيبٌ مُّسَوَّدٌ (۳۵/۲۷) زمین اور اس کی پیداوار پر ہی نہیں، اس سے آگے بڑھ کر، تم نے پہاڑوں کی ساکت و صامت چٹانوں پر بھی کبھی غور کیا ہے کہ ان میں رنگارنگ طبقات کیوں ہیں؟ کوئی سفید، کوئی سرخ، کوئی کالا بھنگا۔ اگر تم ان (پہاڑوں) سے پوچھو گے تو یہ تمہیں بتائیں گے کہ یہ شاہراہ ارتقاء کی کون کون سی منزلوں سے گزرے ہیں، جن کے نشانات مختلف طبقات کی شکل میں موجود ہیں۔ وَ مِنَ السَّيِّئَاتِ ذَٰلِكَ آيَاتٌ لِّمَنْ خَلَقَ مِنْكُمْ خَلْقًا مُّخْتَلَفًا ۚ أَلَمْ يَكُنْ لَكُمْ يَوْمَ الْبَاقِ قَابِلٌ ۚ غور ہے کہ انسان حشرات الارض اور مویشیوں کی الگ الگ قسمیں کیوں ہیں۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے بندوں میں سے صرف ”علماء“ کا طبقہ ہی ایسا ہے جو کائنات کے میٹر العقول سلسلہ پر غور و خوض سے قانون خداوندی کی عظمت اور ہیبت کے احساس سے لرزہ بر اندام رہتا ہے اور اس حقیقت کا علی وجہ البصیرت مشاہدہ کر لیتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ (۳۵/۲۸) یقیناً خدا کا قانون بڑے غلبہ اور سطوت کا مالک اور کائنات کو تحریکی عناصر سے محفوظ رکھنے کا ضامن ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ ”عُلَمَاءُ“ کا لفظ کس مقام پر آیا ہے اور کن لوگوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد اس موضوع پر کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ اسلام اور سائنس کا باہمی تعلق کیا ہے۔

اس مقام پر آپ کے دل میں لازماً یہ خیال پیدا ہو گا کہ اقوام مغرب نے علوم سائنس میں اس قدر ترقی کی ہے لیکن اس کا نتیجہ وہ جہنم ہے، جس میں آج ساری دنیا اس بُری طرح مانوڑ ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے فطرت کی بے پناہ قوتوں کو تو مستخر کر لیا لیکن ان کا استعمال مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کے مطابق نہیں کیا۔ یہ اس لئے کہ مستقل اقدار ان کے سامنے ہی نہیں۔ یہ اقدار، عقل انسانی کی پیداوار نہیں۔ انسانی فکر انھیں پیدا کر نہیں سکتا۔ یہ وحی کے ذریعے ملتی ہیں اور قرآن کی دفتیں میں محفوظ ہیں۔ جب تک فطرت کی قوتوں کو قرآن کی راہ نمائی میں صرف نہیں کیا جاتا، دنیا جہنم کے عذاب سے نجات نہیں پاسکتی۔

اس مختصر سے وقت میں جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا ملخص (SUMMARY) یہ ہے کہ قرآن کی رو سے

جو قومیں تسخیرِ فطرت نہیں کرتیں، وہ (مقامِ مومن تو ایک طرف) مقامِ آدمیت تک بھی نہیں پہنچ سکتیں، اس لئے کہ آدم وہ ہے جس کے سامنے طائفہ سجدہ ریز ہوں۔

اور جو آدم و حٰی خداوندی کا اتباع نہیں کرتا، وہ یُفْسِدُ فِیْہَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ کا منظر رہتا ہے۔ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْہُمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُونَ کا مورد نہیں بنتا۔ (۲/۳۸)

مومن وہ ہے جو فطرت کی قوتوں کو مستخر کر کے انہیں وحیِ خداوندی کی روشنی میں، النوعِ انسان کی منفعتِ عامہ کے لئے استعمال کرے۔ اس کا نتیجہ وہ جنتِ ارضی ہے، جس کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آتا۔
كَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔ (۴/۱۳ - ۶۱/۱۲)

انسان اور خارجی کائنات

۲۱ اگست ۱۹۵۹ء کی شام محترم پروفیسر صاحب نے لاء کالج ہال کراچی میں، عنوان بالا پر ایک جامع تقریر فرمائی۔ سامعین میں زیادہ تعداد طالب علموں اور اساتذہ حضرات کی تھی۔ دیگر اہل علم طبقہ بھی کثیر تعداد میں شریک اجتماع تھا۔ تقریر کا ماحصل درج ذیل کیا جاتا ہے۔
(طوبیہ اسلام)

افراد ہوں یا اقوام (اقوام بالخصوص) ان کی موت و حیات کے فیصلے کے لئے ایک اہم عنصر یہ بھی ہے کہ خارجی کائنات کے متعلق ان کا زاویہ نگاہ یا رد عمل کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے، جس نے انسان کو ہمیشہ وقف اضطراب رکھا ہے۔ قرآن نے اُسے بڑی اہمیت دی ہے اور اس کا صحیح جواب اہمیت واضح اور بین الفاظ میں پیش کیا ہے۔ جب انسانی شعور نے پہلے پہل آنکھ کھولی، تو اس نے اپنے آپ کو عجیب دنیا میں پایا۔ سر پر مسلسل آتش باری کرنے والا عظیم اور مہیب گولا، چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑ، ادھر ادھر ساحل، آتشنا سمندر اور اس کی خوفناک ملاء طم انگیزیاں، یہاں وہاں کف بردہاں اور سیلاب در آغوش دریاؤں کی وحشت سامانیاں، میلوں تک ڈراؤنے جنگل اور ان میں بڑے بڑے خطرناک درندے اور اژدھے، کبھی بادل کی لرزہ انگیز گرج، کبھی بجلی کی جگر پاش کڑک، کبھی وحشت انگیز آندھی، کبھی بلا خیز جھکڑ، کبھی کوہ آتش فشاں کی مرگ سیال کی یلغار، کبھی زلزلوں کی تباہ کاریوں کا ہجوم، شش جہات میں اس قسم کی خوفناک بلاؤں کا اژدھام اور ان کے اندر گھرا ہوا بے یار و مددگار اور بے سرو سامان، ہنسا بن آدم۔ آپ سوچئے کہ ان حالات میں خارجی کائنات کے متعلق اس کا رد عمل اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ جو بلا

انسان کا پہلا ردِ عمل

سامنے آئے، یہ گڑا گڑا شمع کر دے۔ جہاں کوئی خطرہ آنکھ دکھائے، یہ زمین پر سر رکھ دے۔ اس طرح فطرت کی ہر قوت اس کا "اللہ" اور یہ ان قوتوں کا پرستار بن گیا۔ چاند، سورج، ستارے، گرج، کڑک، بارش، آندھی، آگ، دریا، سانپ، شیر حتیٰ کہ وبائی امراض سب دیوی اور دیوتا تصور کرنے لگے اور ان کی بارگاہ میں نذر و نیاز، منت و سماجیت اور مدح و ستائش سے انھیں خوش کرنے اور راضی رکھنے کی تدابیر اختیار کی جانے لگیں۔ یہ تھا (اُس ماحول میں) انسان کا اولین ردِ عمل خارجی کائنات کے متعلق۔ رفتہ رفتہ اس ردِ عمل نے مذہب کی شکل اختیار کر لی۔ اور یہ آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی عقیدہ یا تصور مذہب کی شکل اختیار کر لے تو حالات کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں، اس میں تبدیلی نہیں آیا کرتی۔ چنانچہ دنیا کے بیشتر مذاہب کائنات کے متعلق انسان کے اسی ادلیں ردِ عمل کے مظاہر ہیں۔

یہ تو ہم پرستی کی دنیا تھی۔ دوسری طرف جہاں علم و بصیرت کی طرف آئے تو وہاں (بد قسمتی سے) انسانیت ایک ایسے حادثے سے دوچار ہوئی جس نے اسے تو ہم پرستی کی جہالت سے بھی زیادہ نقصان پہنچایا۔ جہاں تک تاریخی نوشتہ ہماری راہ نمائی کرتے ہیں، علم و حکمت کا اولین گہوارہ خطہ یونان تصور کیا جاتا ہے اور سقراط کو وہاں کے حکماء کا ابو الالباء قرار دیا جاتا ہے۔ سقراط کا نظریہ تھا کہ مطالعہ کے قابل صرف انسان کی ذات ہے، خارجی کائنات نہیں۔ افلاطون، جو سقراط کا شاگرد لیکن خود ایک الگ مکتب فکر کا امام ہے، اس

افلاطونی نظریہ

سے بھی دو قدم آگے بڑھا۔ اس نے کہا کہ یہ دنیائے محسوسات (خارجی کائنات) درحقیقت اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی حقیقی دنیا عالم امثال (WORLD OF IDEAS) کی ہے جو کہیں آنسوئے افلاک واقع ہے اور یہ مرنی کائنات اس دنیا کا عکس ہے۔ اس نظریہ سے جو منطقی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا، وہ ظاہر ہے۔ یعنی جب یہ عالم محسوسات درحقیقت اپنا وجود نہیں رکھتا بلکہ محض فریب اور سراب ہے (بلکہ عالم خواب) تو اس کے متعلق جو علم انسانی حواس (SENSES) کے ذریعہ حاصل ہوگا، وہ بھی اپنی کچھ حقیقت نہیں رکھے گا۔ حقیقی علم وہی ہوگا جو انسان کو یہ چشم بند گوش بند و لب ہر بند کے بعد — اپنی دنیا میں جذب ہو جانے سے حاصل ہو۔ یہی علم قابلِ اعتماد اور یقینی ہوگا۔ محسوسات کا علم (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) قطعاً قابلِ اعتماد نہیں ہوگا۔

ص مذہب سے مراد انسانوں کا خود ساختہ توہم پرستانہ مسلک ہے۔ خدا کی طرف سے بوساطت انبیاء کرام دین ملت رہا ہے۔ اسلام بھی دین ہے، مذہب نہیں۔

یہ تھا کائنات اور علم محسوسات کے متعلق افلاطون کا وہ نظریہ جس پر یونانی تصوف کی عمارت استوار ہوئی۔ یہ تصوف وہاں سے نکل کر ساری دنیا کو متاثر کر گیا۔ اس نے ہندوستان میں پہنچ کر ویدانت کی شکل اختیار کی۔ چنانچہ اس (ہندو) فلسفہ کی رو سے ہر اکتی (مادی دنیا) مایا (فریب) ہے۔ کائنات برہما (خدا) کا خواب ہے۔ جس دن اس کی آنکھ کھل گئی، یہ خواب معدوم ہو جائے گا۔

یہ تصوف تو کا نظریہ ہے

یہ عظیم کارگہ کائنات، ایشور کی پِلا (نامک کا کھیل) ہے، جس میں کوئی شے اپنے حقیقی رنگ میں سامنے نہیں آتی، بلکہ حقیقت کی تمثیل ہوتی ہے۔ یہی وہ فلسفہ ہے جو ایرانی مغفجوں کے ہاتھوں "شراب معرفت" بن کر چھٹکا اور عیسائیت کی خانقاہوں تک کو کیف آلود کر گیا۔ اسی فلسفہ کا نتیجہ تھا کہ کائنات کو باطل قرار دے دیا گیا اور دنیا ایک قابلِ نفرت شے تصور کر لی گئی، جس سے دور بھاگنے میں ہی انسانی نجات کا راز پوشیدہ سمجھا گیا۔

یہ تھا کائنات کے متعلق ذہن انسانی کا رد عمل اس زمانے میں جب قرآن نازل ہوا۔ یعنی دنیائے مذہب، کائناتی قوتوں کو معبود بنا کر ان کے سامنے سجدہ ریز بھی اور عام تصوف کائنات کو باطل قرار دے کر اس سے نفرت میں "روحانی ترقی" کا راز پارہا تھا (اس میں شبہ نہیں کہ قرآن سے پہلے بعض قرآن ایسے ملتے ہیں، جن میں کائنات کی صحیح پوزیشن بھی سامنے آجاتی ہے۔ یہ وحی پر مبنی تعلیم کا اثر تھا جو مختلف انبیائے کرام کی وساطت سے وقتاً فوقتاً آتی رہی۔ لیکن چونکہ نزول قرآن کے وقت وحی کی تعلیم اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں کہیں بھی موجود نہ تھی، اس لئے فکر انسانی کی عمومی حالت وہی تھی، جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔)

قرآن آیا اور اس نے سب سے پہلے مذہب کی دنیا کو لٹکا را۔ اس نے پہلے ہی پارہ کی ابتدا میں انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کو قصہ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا۔ واضح رہے کہ قصہ آدم کسی فرد (بابا آدم) کی داستان نہیں۔ آدم خود آدمی ہے اور اس کا قصہ آدمی کی اپنی کہانی ہے۔ اس نے کہا کہ آدمی کا مقام یہ ہے کہ فطرت کی تمام قوتیں (جنہیں قرآن لائیک کہہ کر بکارتا ہے) اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ خَلَسَا

قرآن کا تصور

لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدْ لِذِکْرِهِ فَسَجَدُوا (۲/۳۴) اس ایک (انقلاب انگیز) اعلان سے، قرآن نے مسجد کو ساجد اور ساجد کو مسجد بنا دیا۔ اس نے انسان سے کہا کہ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ذَاتَ بَیِّنَاتٍ (۱۴/۳۳) خدا نے چاند اور سورج کو تیرے لئے تابعِ تسخیر کر دیا ہے کہ وہ تیری خدمت

میں مصروفِ خرام رہیں۔ وَ سَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ (۱۴/۳۳) اس نے دن اور رات کو بھی تیرے لئے تابع فرمان بنا دیا ہے۔ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْآلَانَهَارَ (۱۴/۳۲) اس نے دریاؤں (اور سمندروں) کو بھی تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ المختصر یہ کہ وَ سَخَّرَ لَكُمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (۲۵/۱۲) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے تمہارے لئے تابعِ تسخیر کر دیا ہے۔ یہ سب خدا کے مقرر کردہ قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم ان قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرو اور ان کے ذریعہ ان تمام قوتوں کو اپنے کام میں لاؤ۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن نے کس طرح مقامِ آدم کو بے نقاب کر کے کائنات اور خود انسانی دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ اس کی اس حقیقت کُشا تعلیم سے ذہنِ انسانی کے تراشیدہ دیوئی دیوتا، جن 'عبوت پریت' سب اس کے حضور دست بستہ خدمت کے لئے حاضر ہو گئے اور پتھروں کے سامنے ماتھا رکھنے والا انسان کس طرح آسمان کی بجلیوں تک کا مخدوم و مسجود بن گیا۔

دوسری طرف قرآن نے دنیا نے تصوف کو پکارا اور ایک غلفہ انگیز نعرہ سے طلسمِ فلاطون کی دھجیاں فضا نے بسیط میں بکھر کر رکھ دیں۔ اس نے کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَبَيْنَهُمَا بَاطِلًا۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو اور جو کچھ

طلسمِ فلاطون کی شکست

ان کے درمیان ہے، ہم نے باطل پیدا نہیں کیا۔ ذَٰلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا۔ یہ ان لوگوں کا وہم و قیاس ہے جو حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔ قَوْلُ الَّذِينَ كَفَرُوا ذَٰلِكَ الْمَثَرُ۔ (۳۸/۲۴) اور جو حقیقتِ ثابتہ کا انکار کر کے، کائنات کو باطل بتاتے ہیں، ان کی سعی و عمل راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے اور آخر الامر ان کے حقیقے میں ندامت و پشیمانی اور تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کائنات کے متعلق غلط زاویہ نگاہ کو کفر (اور اس کے برعکس صحیح زاویہ نگاہ کو ایمان) قرار دے کر اس سوال کو کتنی اہمیت دی ہے؟ جو شخص کائنات کو باطل قرار دے، وہ قرآن کی رو سے مومن نہیں، کافر ہے۔ خدا نے کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا۔ خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ۔ اس نے کائنات کو باطنی پیدا کیا ہے۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ (۲۹/۴۴) اس میں ایمان والوں کے لئے (بہت بڑی) نشانی ہے۔

یہ کھیل تماشا نہیں | کائنات کو ایشور کی پیلا قرار دینے والوں سے اس نے کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لِعِبَادِنَا۔ ہم نے کائنات

کی پستیوں اور بلندیوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، یوں ہی کھلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔ وَمَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَئِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَذَالِمُونَ — (۴۲/۳۹) ہم نے انہیں بالحق پیدا کیا ہے۔ یہ خیال کہ کائنات یوں ہی بطور کھیل تماشہ کے پیدا کر دی گئی ہے، ان لوگوں کا وہم ہے جو علم و حقیقت سے بے خبر ہیں۔

کائنات کے متعلق زاویہ نگاہ میں اس قدر تحیر انگیز انقلاب پیدا کرنے کے بعد ضروری تھا کہ علم بالحواس (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) کے متعلق بھی انسانی نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے کہا کہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (۱۷/۳۶) جس بات کا تمہیں علم نہ ہو، اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو! إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُودًا (۱۷/۳۶)

علم کی تعریف | تمہارے سمع اور بصر اور فؤاد سب سے یہ پوچھا جائے گا کیا تم نے اس بات کے صحیح ہونے کی شہادت دی تھی جسے صحیح سمجھا گیا تھا؟ یہ آیت بڑی غور طلب

ہے۔ اس میں علم اسے کہا گیا ہے، جس کی شہادت سمع و بصر و فؤاد دیں۔ "سمع و بصر" انسانی حواس SENSES ہیں، جن کا کام یہ ہے کہ وہ خارجی کائنات کے متعلق معلومات فراہم کر کے فؤاد (MIND) تک پہنچادیں اور پھر فؤاد (MIND) ان سے استنباط نتائج کرے۔ علم کی اس تعریف (DEFINITION) میں علم بالحواس (PERCEPTUAL)

(KNOWLEDGE) اور فکری و تصوراتی علم (CONCEPTUAL KNOWLEDGE) دونوں آجاتے ہیں۔ قرآن کے نزدیک "سمع و بصر و قلب" کی اہمیت کس قدر ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے صاف

سمع و بصر کا کام نہ لینے والے جہنمی ہیں | الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ ان سے کام نہیں لیتے وہ انسانی سطح پر نہیں، حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے

ہیں اور جہنمی ہیں۔ سورۃ اعراف میں ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِبِّ ذَاكُلَ الَّذِينَ

شہری اور صحرائی آبادیوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں جو انہیں سیدھی جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔ یعنی

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ أذانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا۔

ان کی حالت یہ ہے کہ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں

رکھتے ہیں لیکن اس سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن اس سے سننے کا کام نہیں لیتے۔
 اُولَٰئِكَ كَانُوا لَآ نِعَامَ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ یہ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ اُولَٰئِكَ
 هُمْ اَنفَاكُونَ (۴۹/۱) اس لئے کہ یہ لوگ حقائق کائنات سے بے خبر رہتے ہیں۔

ان کے برعکس، وہ ایک اور گروہ کا ذکر کرتا ہے، جن کے متعلق کہتا ہے کہ
 اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَآیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔

(۳/۱۸۹)
 یقیناً کائنات کی بنیادوں اور پستیوں کی تخلیق اور رات دن کی گردش میں صاحبان عقل و شعور کے
 لئے (بڑی بڑی) نشانیاں ہیں۔

ان ارباب دانش و بینش کے لئے جن کی حالت یہ ہے

کائنات میں غور و فکر کرنے والے

وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ (۳/۱۹۰) جواٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے ہر وقت قانون خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ و
 يَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اور تخلیق ارض و سماء میں انتہائی غور و فکر کرتے ہیں اور اپنے
 مسلسل تجربات اور پیہم مشاہدات سے علی وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۹۰)
 اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس عظیم سلسلہ کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا۔ سُبْحٰنَكَ یہ تجھ
 سے بہت بعید تھا کہ تیرا تخلیقی پروگرام بلا مقصد ہوتا، تیرے متعلق ایسا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ محض ہماری کوتاہ علمی اور
 ریسرچ (تحقیق) کی کمی ہے جو ہم کائنات کی بہت سی چیزوں کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتے ہیں اور اس لئے
 ان کی زہر پاشیوں سے بھلتے اور ٹپتے رہتے ہیں۔ ہماری آرزو یہ ہے کہ تو ہمیں ایسی توفیق عطا فرما کہ ہم عدم علم
 کی بناء پر اشیائے کائنات کے تخریبی پہلو سے محفوظ رہیں۔ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳/۱۹۰) اس لئے کہ جو
 قومیں اشیائے فطرت کے متعلق تحقیقات نہیں کرتیں اور اس لئے ان کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتی ہیں، وہ
 دنیا میں ذلت اور رسوائی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ مَا بَنَا آتَاكَ مِنْ مَّدْخِلٍ اِلَّا تَارَةً فَكَدَّ اخْزَيْتَهُ
 (۳/۱۹۱) اور ایسی قوموں کا دنیا میں کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔ وَمَا لِلظَّالِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۳/۱۹۱)

یہی مومن و متقی ہیں

اس مقام پر ان لوگوں کو جو اشیائے کائنات کے متعلق تحقیق و تدقیق کے
 بعد رموز فطرت کی عقدہ کشائی کرتے ہیں، قرآن نے "صاحبان عقل و بصیرت"

کہا ہے۔ دوسرے مقام پر انہیں ”مومنین“ سے تعبیر کیا ہے، جہاں کہا ہے کہ **إِنَّ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّمُؤْمِنِينَ** (۴۵/۳) یقیناً کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں مومنین کے لئے نشانیاں ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا اور اس کے قوانین کے متعلق حتمی یقین رکھتے ہیں۔ **وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُذُّ مِنْ دَابَّةٍ آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يُؤْتُونَ** (۴۵/۴) اور تمہاری پیدائش میں اور دیگر جانداروں کی افزائش نسل میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو (کائنات کے باطن ہونے پر) یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ صاحبانِ عقل و بصیرت ہیں۔ **وَالْخِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ ثَمَرٍ ثَمَرٍ فَاخِيَابِ بِمِ الْأَرْضِ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ تَصْرِيفِ الرِّيحِ آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ** (۴۵/۵) اور دن رات کی گردش میں اور بارش میں جسے خدا بادلوں سے برساتا ہے اور اس سے زمینِ مردہ کو حیات تارہ عطا کرتا ہے اور ہواؤں کے رخ کی تبدیلی میں اربابِ عقل و فکر کے لئے نشانیاں ہیں۔

کائنات پر غور و فکر کی اس قدر تاکید کے بعد کہا گیا کہ **تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ يَشْرُوهَا عَلَيْكَ بِالصِّقْرِ**۔ یہ وہ اللہ کی آیتیں ہیں، جنہیں خدا حق کے ساتھ تیرے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ لوگ جو اس کے بعد بھی حق پر ایمان نہیں لاتے، ان سے پوچھو کہ **فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ اللَّهِ وَآيَاتِهِ يُؤْمِنُونَ** (۴۵/۶) یہ لوگ اللہ اور اس کی اس قسم کی آیات کے بعد اور کس چیز پر ایمان لائیں گے؟

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے اس مقام پر کتنی عظیم حقیقت **انہی سے ایمان حاصل ہوتا ہے** بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے دو

گوشے ہیں۔ ایک اشیائے فطرت پر غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنا کہ کائنات کے نظام کو ایک حکیم و خبیر ہستی اپنے ”محکم“ اہل اور تعمیری قوانین کی رُو سے چلا رہی ہے۔ دوسرے قرآنی تعلیم میں تدبیر و تفکر سے جس نے اُس زمانے میں انسان کے لئے تسخیر کائنات کا اعلان کیا، جب ساری دنیا یا تو کائناتی قوتوں کو معبود بناتے ہوئے تھی اور یا اسے فریبِ نظر اور قابلِ نفرت سمجھ کر اس سے دُور بھاگتی تھی، ایسے ماحول میں اس قسم کی انقلاب آفریں آواز بلند کرنا کسی انسانی ذہن کا کام نہیں تھا۔ اس آواز کا سرچشمہ یقیناً وہی خدا نے عظیم و بصیر ہو سکتا تھا جو انسان اور کائنات دونوں کے صحیح مقامات سے باخبر ہو۔ لہذا اگر کوئی شخص مطالعہ فطرت اور قرآن میں غور و تدبیر کے بعد بھی خدا پر ایمان نہیں لاتا تو پھر کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہتی جس سے وہ خدا پر ایمان لاسکے۔

ایمان وہ تصدیقِ حیات ہے جو انسانی زندگی کا نصب العین قرار پاتا ہے۔ اس کے بعد تقویٰ آتا ہے۔ تقویٰ کے

معنی یوں سمجھئے کہ یہ وہ مسلک اور منہاج ہے، جس کے مطابق مومن اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ مومنین کے لئے خارجی کائنات کے شواہد و مظاہر پر غور و فکر کس قدر ضروری ہے، اس کے متعلق ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ دوسری جگہ قرآن کہتا ہے کہ یہ غور و فکر متقیوں کے لئے بھی ویسا ہی ضروری ہے۔ سورہ یونس میں ہے۔

إِنِّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ - (۱۰/۶)

یعنی اختلافِ بیل و نہار اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمینوں میں پیدا کیا ہے، ان میں تقویٰ شعا قوم کے لئے نشانیاں ہیں۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ قرآن نے ”سموات والارض“ پر غور و فکر کرنے کی تاکید کی ہے۔ سموات (اجرامِ فلکی) پر غور و فکر کا ایک شعبہ تو وہ ہے جسے علم الافلاک (ASTRONOMY) کہتے ہیں لیکن قرآن اس سے بھی آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ زمین میں ہی نہیں بلکہ اجرامِ فلکی میں بھی ذی حیات مخلوق ہے اور اس کے متعلق غور و فکر کرنا بھی ضروری ہے۔ سورہ شوریٰ میں ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا مِنْ دَآبَّةٍ - (۳۲/۲۹)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض و سموات کو پیدا کیا اور ان دونوں میں ذی حیات مخلوق کو پھیلایا۔

غور فرمائیے کہ آسمانی کڑوں میں زندہ مخلوق کی نشاندہی بھی سب سے پہلے قرآن ہی نے کی ہے۔

قرآن کی رو سے علم کی تعریف کیا ہے، یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ یعنی علم وہ ہے، جس کی شہادت انسان کے حواس و دماغ کی تائید اس کا قلب (MIND) کرے اب یہ دیکھئے کہ قرآن کے نزدیک عالم کون ہے؟ قرآن میں علماء کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ ایک سورہ شعراء میں (۲۶/۱۹۷) اَوَلَمْ يَكُنْ لَهُ آيَةٌ اَنْ يَعْلَمَهُ عُلَمَآؤُا بَنِي إِسْرَآئِيلَ۔

عالم کی تعریف یہاں علمائے بنی اسرائیل کا ذکر ہے اور دوسری جگہ سورہ فاطر میں جہاں خدا کے بندوں میں سے علماء کا ذکر ہے، اس تذکرہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَخُذْ حِجَابًا مِّنْهُ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا (۲۵/۲۷) کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ کا قانون

کس طرح بادلوں سے میٹھ برساتا ہے اور اس سے انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔

وَمِنْ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَدَارِقُ بَيْضٌ سَوْدٌ (۲۵/۲۷)

اور پہاڑوں میں کس کس انداز کے سُرخ و سفید طبقات ہیں، جن کے رنگ اور اقسام مختلف ہیں اور ان میں بعض گہرے سیاہ رنگ کے ہیں۔

وَمِنْ النَّاسِ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ ط

اور اس طرح انسانوں اور دیگر جانداروں اور مویشیوں کے بھی مختلف اقسام ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ ان آیات میں کون کون سے امور کا ذکر ہو رہا ہے؟ کائنات کے مختلف گوشوں کا، بساطِ فطر کے متنوع شعبوں کا، سائنس کے مختلف علوم کا، جن میں طبیعیات (PHYSICS) نباتات (BOTANY) حیوانات (ZOOLOGY) طبقات الارض (GEOLOGY) فضائیات (METEOROLOGY) اور عالمِ انسانیت کے تمام شعبے آجاتے ہیں۔ ان علوم و فنون کے تذکرہ کے بعد فرمایا: اِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کے بندوں میں سے "علماء" ہی وہ ہیں، جن کے دل پر اس کی عظمت و ہیبت چھپ جاتی ہے۔ اِنَّ الدِّينَ عَزِيزٌ لِّغَفُورٍ رَّحِيمٍ (۲۵/۲۸) کیونکہ وہ علی وجہ البصیرت اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے اور کس طرح اس عظیم کارگاہ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر، اس کی منزلِ مقصود کی طرف لئے جا رہا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے علماء کا لفظ کن لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے۔ ان کے لئے جنہیں دورِ حاضر کی اصطلاح میں سائنسٹ اور کائناتی مفکر کہا جاتا ہے۔ قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ جس طرح خدا کی عظمت و ہیبت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کائناتی مظاہر پر غور کریں، اسی طرح خود قرآن کے حقیقتِ ثابتہ ہونے کا یقین بھی وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خارجی کائنات اور دنیائے انسانیت میں غور و فکر کریں۔ اس کا ارشاد ہے: سَنُرِيهِمْ

اٰیَاتِنَا فِي الْاَفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَّبِعُوْنَ اٰیَاتِنَا اِنَّهٗ الْحَقُّ۔ (۲۱/۵۳) ہم انہیں اپنی نشانیاں عالمِ آفاق

اور عالمِ انفس میں دکھائیں گے۔ تا آنکہ یہ بات ابھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن فی الواقعہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے، یعنی جوں جوں کا کل زمانہ کے پیچ و خم میں پلٹے ہوئے حقائق، مشاطگی علم و تحقیق سے کھلتے جائیں گے، قرآن کے دعاوی کے ثبوت ایک ایک کر کے سامنے آتے جائیں گے۔ یہ اس لئے کہ اَوَّلَ مَا يَكْفُرُ بِرَبِّكَ اِنَّهٗ

عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ۔ (۴۱/۵۲) قرآن اس خدا کی کتاب ہے، جس کی نگاہوں سے کوئی راز مستور نہیں۔ اس کے سامنے کائنات کی ہر شے بے نقاب رکھی ہے اور یہ چیز اس امر کی کافی دلیل ہے کہ حقائق کائنات کے متعلق جو کچھ خدا کہے گا، وہ یقینی طور پر درست ہوگا۔ اَنزَلْنَاهُ الَّذِي يَخْلُقُ السَّحَابَ فِي السَّلَاطِ وَالْأَمْصِ۔

(۲۵/۶۱) قرآن کو اس خدا نے نازل کیا ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے اسرار و رموز سے واقف ہے۔ لہذا جو لوگ الفس و آفاق کی ان نشانیوں پر غور و فکر کریں گے، انہیں ان میں تجلیات خداوندی بے نقاب نظر آجائیں گے۔ جو قومیں ان آیات اللہ سے آنکھیں بند کر کے گزر جاتی ہیں، یوں سمجھو کہ انہیں خدا کو اس طرح اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لینے پر یقین نہیں ہوتا۔ اَلَا اِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاءِ رَبِّهِمْ۔ (۴۱/۵۴) حالانکہ انہیں اس کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ جس شے کی بھی ریسرچ شروع کر دیں، اس میں خدا کا قانون ربوبیت جھل جھل کر نظر آئے گا۔ اس لئے کہ اِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ۔ (۴۱/۵۴) خدا کا قانون ربوبیت ہر شے کو محیط ہے۔ وہ کسی ایک شے کے ساتھ مختص نہیں۔

لقاء رب

ہم نے شروع میں دیکھا ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ کائنات میں مومنین اور متقین کے لئے ہر جگہ آیات اللہ ہیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ایمان اور تقویٰ کے معنی اشیائے کائنات پر غور و فکر اور تحقیق و تدقیق ہے اور جو قومیں تسخیر فطرت کرتی ہیں، وہ مومن اور متقی ہوتی ہیں۔ مومن و متقی وہ ہیں جو تسخیر فطرت کے بعد فطرت کی قوتوں کو قوانین خداوندی کے مطابق (نوع انسانی کی ربوبیت عامہ) کے لئے صرف کرتے ہیں اور اس طرح اپنی ذات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ مومن ہونے کے لئے یہ دونوں شرطیں ضروری ہیں، یعنی تسخیر فطرت اور اتباع قوانین خداوندی۔

سُورَةُ التَّوْحِيدِ

مومن ہونے کی شرائط

جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ اگر کسی قوم میں ان دو شرطوں میں سے کسی ایک شرط کی بھی کمی ہے تو وہ مومن و متقی نہیں کہلا سکتی۔ وَمَنْ لَّهُمْ

يَخْلُقُ بِمَا آتٰنَا اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ۔ (۵/۴۴) جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ جو قومیں تسخیر فطرت تو کر لیتی ہیں لیکن امور زندگی کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نہیں کرتیں، وہ بھی ان قوموں کی طرح تباہ و برباد ہو جاتی ہیں جو سرے سے تسخیر فطرت نہیں کرتیں۔ یہی وہ قومیں ہیں، جن کے متعلق قرآن

نے کہا ہے کہ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ (۴۶/۲۶) ان کے سمع و بصر و فواد ان کے کسی کام نہ آتے کیونکہ وہ قوانین خداوندی سے انکار کرتے تھے۔ وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ لہذا قرآن کی رو سے صورت حال یوں ہوئی کہ

(۱) جو قومیں سمع و بصر و فواد سے کام لے کر تسخیرِ فطرت کرتی ہیں اور پھر فطرت حاصلِ مبحث کی قوتوں کو قوانین خداوندی (قرآن) کے مطابق صرف کرتی ہیں، وہ مومن و متقی ہیں۔ ان کی اس دنیا کی زندگی بھی درخشندہ اور تابناک ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی خوشگوار و شاداب۔

(۲) جو قومیں تسخیرِ فطرت تو کرتی ہیں لیکن قرآن کی مستقل اقدار کا اتباع نہیں کرتیں، وہ صرف مقامِ آدمیت تک پہنچتی ہیں، مومن و متقی کے مقام تک نہیں پہنچتیں۔ وہ اس دنیا کی زندگی میں قوت و شوکت حاصل کر لیتی ہیں لیکن مستقبل ان کا تاریک ہوتا ہے۔

(۳) اور جو قومیں سرے سے تسخیرِ فطرت کرتی ہی نہیں، وہ مومن و متقی ہونا تو کجا، مقامِ آدمیت تک بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ اُولَٰئِكَ مَا دَأَّهُمُ النَّاسُ (۱۰/۸) ان کے لئے اس دنیا میں ذلت و خواری ہے اور آخرت میں بھی تباہی و بربادی۔ اس لئے کہ مَن كَانَ فِي هَذِهِ اَعْمٰی فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی (۱۷/۲۱) جو یہاں کا اندھا ہے، وہ وہاں کا بھی اندھا ہے۔

وہ کل کے غم و عیش پر کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز ہو سگ سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامہ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟

(تفسیر)

اپریل ۱۹۶۱ء

برادران عزیز!

ایک اہم سوال جو اکثر ذہنوں میں ابھرتا اور دلوں کو پریشان کرتا ہے، یہ ہے کہ عام اخلاقی اقدار تمام مذاہب (بالخصوص بڑے بڑے مذاہب) میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ سب مذاہب ہی کہتے ہیں کہ جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، دیانت دار بنو، کسی پر ظلم نہ کرو وغیرہ وغیرہ اور اسلام بھی یہی کہتا ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی خصوصیت ہے، جس کی بناء پر ہم یہ کہتے ہیں کہ دین برحق صرف اسلام ہے۔ اس کے سوا خدا کے ہاں کوئی اور دین قابل قبول نہیں۔ نوع انسان کی بھلائی و سعادت اسی سے وابستہ ہے۔ اس لئے تمام اہل مذاہب کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام قبول کریں۔

اگر وہ خصوصیت جس کی بناء پر اسلام کو یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے، یہی اخلاقی اقدار ہیں، تو پھر یہ حق ہر ایک مذہب کو پہنچنا چاہیے۔ یہ تو کوئی معقول بات نہ ہوتی کہ جن خصوصیات کی بناء پر ہم اسلام کو دین الحق قرار دیں، انہی کے مطابق جب دوسرے مذاہب اپنے متعلق اس قسم کا دعویٰ کریں تو ہم ان کے دعویٰ کو باطل قرار دے دیں اور ان سے اسلام قبول کرنے کا مطالبہ کریں۔

یہ سوال واقعی اہم ہے اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، یہ اکثر ذہنوں میں پیدا ہوتا اور قلوب کو پریشان کرتا ہے۔ یہی وہ سوال ہے جو اس سے پہلے علمی دنیا میں اس وقت سامنے آیا، جب مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر سورۃ فاتحہ میں لکھا کہ ”عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں“ اس لئے کسی مذہب

برہم سماجی مذہب | کو دوسرے مذاہب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ یہ اعلان درحقیقت صدائے بازگشت تھی برہم سماجی تحریک کی جو اس سے پہلے بنگال میں اٹھی تھی۔ انہوں

نے تمام بڑے بڑے مذاہب کی (میتند) آسمانی کتابوں سے (برہم خویش) اچھی اچھی باتوں کو یکجا کر کے ایک مجموعہ تعلیم مرتب کیا اور اسے دنیا کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا کہ اس تعلیم میں تمام مذاہب کی مشترکہ سچائیاں موجود ہیں۔ اس لئے مذہبی اختلافات مٹانے اور سچائی پر عمل پیرا ہونے کا یہی طریق ہے کہ تمام اہل مذاہب اس تعلیم پر ایمان لے آئیں اور اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں۔ یہ مشترکہ تعلیم انہی اخلاقی اقدار پر مشتمل تھی۔ برہم سماجی تحریک سے بہت پہلے اکبر کے ”دین الہی“ کی بنیاد بھی اسی تصور پر تھی۔ اسی کا مبلغ دارا شکوہ تھا، جس کے تصوف کی رو سے ”رام اور رحیم“ میں کوئی فرق نہیں اور حقیقت کا جلوہ دیر و صرم میں یکساں موجود ہے۔ اسی کی صدا سے بازگشت بھگت گیر اور سورداس کے بھجنوں اور شاہ فرید اور سلطان باہو کی کافیوں میں ہر گلی کوپے میں سنائی دیتی ہے۔

اس سے ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ اگر صداقت انہی اخلاقی اقدار کا نام ہے اور انہی پر عمل پیرا ہونا انسانی زندگی کا منہا ہے تو اس کے لئے مذہب کی بھی کیا ضرورت ہے۔ وہ لوگ جو کسی مذہب کے پیرو نہیں، جو خدا کی مستی

تک کے بھی منکر ہیں، وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ جھوٹ بولنا بہت بُرا ہے۔ سچ بولنا چاہیے۔ دیانت دار بن کر جینا چاہیے۔ کسی پر ظلم نہیں کرنا چاہیے۔ اس لئے مذہب کو سچ میں لانے کی ضرورت کیا ہے؟ یہی وہ تصور تھا جس کی بنیادوں پر یورپ میں (HUMANISM) کی تحریک اٹھی اور اس نے (RELIGION WITHOUT REVELATION) ”مذہب بلا وحی“ کے دعوے کے ساتھ اپنے آپ کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اگر مذہب کا مقصد و منہا ہی اخلاقی اقدار ہیں اور انسانی زندگی ان اقدار کو مان لینے سے اپنی منزل تک پہنچ سکتی ہے تو پھر (HUMANISM) کے دعویٰ کو کس طرح ٹھکرایا جاسکتا ہے؟

آپ نے غور فرمایا کہ یہ سوال کس قدر اہم ہے اور اس کے اطمینان بخش جواب کا سامنے آنا کس قدر ضروری ہے۔ اس اہمیت اور ضرورت کا تقاضا ہے کہ اس کے متعلق سنجیدگی سے (SERIOUSLY) سوچا جائے اور اسے انتہائی غور و فکر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ ۔

اس باب میں بنیادی غلط فہمی یہ ہے کہ دین کو صرف ایک اخلاقی ضابطہ (ETHICAL CODE) سمجھ لیا جاتا ہے اور بس۔ دین چند اخلاقی اقدار کے مجموعہ کا نام نہیں۔ یہ ایک ہمہ گیر نظام زندگی (SYSTEM OF LIFE) ہے جو حیات انسانی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ اخلاقی اقدار اس نظام کے اندر

دین کیا ہے؟ بروئے کار آتی ہیں۔ یا یوں کہیے کہ یہ نظام، انسان کو وہ بنیادیں عطا کرتا ہے، جن پر اخلاقی اقدار کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ساری دنیا یہ کہتی ہے کہ جھوٹ بولنا بُرا ہے، بددیانتی سخت معیوب ہے، فریب دہی بڑی مذموم حرکت ہے لیکن اس کے باوجود ساری دنیا جھوٹ بولتی ہے۔ بددیانتی عام ہو رہی ہے۔ فریب دہی کی گرم بازاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ انسان ان تمام باتوں کو بُرا کہنے کے باوجود، انہیں کیوں نہیں چھوڑتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ان اخلاقی اقدار کا محض رسماً اور تقلیداً اقرار کرتے ہیں اور یا ان کی بنیاد محض جذبات پر ہوتی ہے۔ انہیں اس کا کچھ علم نہیں کہ ان اقدار کو کیوں اختیار کیا جائے اور ان کی خلاف ورزی کیوں نہ کی جائے۔ آپ کسی شخص سے کہیے کہ وہ آپ کو مطمئن کرے کہ آپ جھوٹ کیوں نہ بولیں۔ سلی گفتگو سے ذرا نیچے اترنے کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس کے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں ہوگا۔ وہ دلیل و برہان سے آپ کی ”کیوں“ کا کچھ جواب نہیں دے سکے گا۔ وہ آپ کو علی وجہ البصیرت (RATIONALLY) نہیں سمجھا سکے گا کہ جھوٹ بولنے سے آپ کا کیا نقصان ہوگا اور سچ بولنے سے آپ کا کیا فائدہ ہوگا اور چوں کہ انسان اسی بات کو اختیار کرتا ہے، جس میں اس کا فائدہ ہو اور اسی چیز کو چھوڑتا ہے، جس میں اس کا نقصان ہو، اس لئے اس کا یہ اقرار یا تو محض رسمی اور تقلیدی ہوتا ہے اور یا جذباتی عواطف کا پیدا کردہ وہ نہ ان اقدار کو علی وجہ البصیرت سمجھتا ہے اور اس لئے نہ انہیں اپنی زندگی کا مسلک بناتا ہے۔

دین وہ بنیادی تصورات عطا کرتا ہے، جن کی رو سے انسانی زندگی کا مقصد اور منتہی نمایاں طور پر اس کے سامنے آجاتا ہے۔ مقصد زندگی، دنیا کی برائے کی صحیح قدر (VALUE) متعین کرتا ہے اور جب اقدار متعین ہو جائیں تو پھر یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ کس بات میں میرا نفع ہے اور کس میں نقصان۔ کون سی قدر زیادہ قیمتی ہے اور کون سی کم۔

ان بنیادی تصورات کے ساتھ، دین وہ عملی نظام عطا کرتا ہے جس میں یہ نظری اقدار حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہیں اور ان کے محسوس نتائج سے انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے کہ ان پر عمل پیرا ہونے سے کس قدر فائدہ ہوتا ہے اور ان کی خلاف ورزی سے کس قدر نقصان۔ اس سے اس کے جذبات و احساسات متاثر ہو کر اپنی کار فرمائی کے لئے صحیح

راستہ (CHANNEL) اختیار کر لیتے ہیں اور چونکہ عمل کے لئے قوت متحرکہ انسانی جذبات ہیں اس لئے اس کی زندگی ان بلند اقدار سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ اسی کا نام کیریکٹر کی بلندی اور سیرت کی پاکیزگی ہے۔ یاد رکھئے! انسانی سعی و عمل تین مراحل میں سے گزرتی ہے۔ آپ کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوتی ہے۔ یہ خواہش (DESIRE) غیر شعوری طور پر دل میں بیدار ہوتی

خواہش سے عمل تک

ہے۔ اس کے لئے آپ کے پاس کوئی دلیل یا برہان یا وجہ جواز نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق خالص جذبات سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپ اسے عقل کے سامنے لاتے ہیں۔ اگر آپ کے جذبات شدید ہیں، تو آپ کی عقل اس خواہش کے بروئے کار لانے کے سامان سوچتی ہے اور اس کے جواز میں دلائل بہم پہنچاتی ہے۔ انھیں (JUSTIFICATORY REASONS) کہتے ہیں لیکن اگر آپ کی عقل جذبات پر غالب ہوتی ہے تو وہ پھر نفع اور نقصان کا موازنہ کرتی ہے اور اگر دیکھتی ہے کہ نفع کا پہلو زیادہ وزنی ہے تو اس خواہش کو پورا کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اب آپ کی خواہش (DESIRE) آپ کی مرضی (WISH) میں بدل جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ کی قوت ارادی آگے بڑھتی ہے اور اس خواہش کے پورا کرنے کے لئے عملی قدم اٹھاتی ہے۔ اس مرحلہ میں آپ کی (DESIRE) ارادہ (WILL) کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

لیکن عقل انسانی اگر وہ جذبات کے تابع نہ بھی ہو، تو بھی زیادہ سے زیادہ اس شخص کے ذاتی نفع یا نقصان کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اس خواہش کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ بالفاظ دیگر انسانی عقل فرد متعلقہ کو یہ بتا سکتی ہے کہ کون سی بات میں اس کا فائدہ ہے اور کون سی بات میں نقصان۔ وہ حق اور باطل (GOOD AND EVIL) میں تمیز نہیں کر سکتی۔ یہ تمیز صرف اقدار کے سامنے ہونے سے ہو سکتی ہے اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اقدار کا تعین تصور حیات کی رُو سے ہوتا ہے۔

تصور حیات (صحیح یا غلط) کس طرح انسانی نگاہ کا زاویہ بدل دیتا ہے اور اس کی سعی و عمل (ACTIVITIES)

کا رخ متعین کر دیتا ہے، اسے سمجھنے کے لئے ہمیں کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ آج ہر شخص کو شکایت ہے کہ دنیا میں جھوٹ، فریب، مکاری، دغا بازی

بددیانتی، رشوت ستانی، بے انصافی، ظلم و استبداد، سلب و ہب (EXPLOITATION) عام ہو رہے ہیں۔ ایسا نظر آتا ہے گویا ان خرابیوں کے جراثیم دہائی اسراض کی طرح ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں، جن سے نہ کوئی خطہ زمین محفوظ رہا ہے اور نہ اس خطہ میں بسنے والا کوئی فرد ان سے مامون۔ آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ اس کی بالآخر وجہ کیا ہے؟ برائیاں تو دنیا میں پہلے بھی تھیں لیکن وہ اس طرح عام اور ہمہ گیر نہیں تھیں۔ ہادئی تعق یہ حقیقت

سامنے آجائیگی کہ اس کی وجہ وہ تصور حیات (CONCEPT OF LIFE) ہے جو انیسویں صدی میں سرزمین مغرب میں نمودار ہوا اور وسائل رسل و رسائل کے عام اور عالمگیر ہونے کی وجہ سے ساری دنیا میں پھیل گیا۔ یہ تمام خرابیاں اس ایک تصور حیات کے برگ و بار ہیں۔ یہ تصور حیات یہ تھا کہ انسانی زندگی صرف اس کی طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے اور اس کی زندگی پر انہی قوانین و ضوابط کا اطلاق ہوتا ہے، جن کے مطابق باقی حیوانات جیتنے اور مرتے ہیں۔ بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) فطرت کا اٹل قانون ہے۔ اس قانون کی رُ سے زندہ رہنے کا اسی کو حق ہے جو زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کرے۔ یہ قوت کس طریق سے فراہم کی جائے، اس کا کوئی سوال ہی نہیں۔ ضعیف اور کمزور صرف طاقتوروں کی خوراک بننے کے لئے زندہ رکھے جاسکتے ہیں۔ ہر بڑی مچلی چھوٹی مچلی کو نگل لیتی ہے۔ کپڑے مکڑے اسی لئے پیدا ہوتے ہیں کہ وہ چڑیوں کی غذا کا کام دیں اور چڑیاں اس لئے جیتی ہیں کہ وہ عقاب کا شکار بنیں یہی قانون فطرت ہے، یہی آئین حیات ہے۔ اسی سے افراد اور اقوام کی موت اور حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جس کی لامبھی، اس کی بھینس، تقاضائے عدل ہے۔ جنگل کا بادشاہ شیر ہے، بکری نہیں۔ اگر شیر بکری کو کھا جاتا ہے تو اس سے بکری یہ شکایت نہیں کر سکتی کہ اس پر ظلم ہو رہا ہے۔

حیوانات کی زندگی اجنبی تقاضوں (INSTINCTS) کے زور پر بسر ہوتی ہے۔ یوں تو یہ نقلے بہت سے ہیں، لیکن اصولی طور پر انہیں تین شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جذبہ تحفظ خویش (SELF PRESERVATION) جذبہ تغلب (SELF ASSERTION) اور جذبہ افزائش نسل (SELF REPRODUCTION) جب انسانی زندگی کو حیوانی زندگی سے زیادہ کچھ نہ سمجھا جائے تو ظاہر ہے کہ ہر فرد انہی جذبات کے تابع مصروف عمل رہے گا۔ اس میں اخلاقی اقدار کی گنجائش ہی نہیں ہوگی۔

اس تصور کی بنیادوں پر اٹھی ہوئی تہذیب کی رُ د سے بلند ترین کیریکر انیشنل کیریکر قرار پائے گا۔ غور سے دیکھئے تو انیشنل کیریکر بھی حیوانی جذبہ (ANIMAL INSTINCT) ہی کا پیدا کردہ ہے (HERD

نیشنلزم

(INSTINCT) حیوانات کی جبلت میں ہے۔ ہر حیوان اپنی حفاظت اسی میں دیکھتا ہے کہ وہ لگہ کے ساتھ رہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس سے آجکل نیشن وجود میں آتی ہے اور قائم رہتی ہے۔ اپنی قوم کی بہبودی اور خوش حالی، افراد کے نزدیک بلند ترین قدر قرار پاتی ہے۔ سب سے بڑا محبت وطن وہ ہے جو دوسری اقوام کے خون کا آخری قطرہ تک پھوڑ کر اس کی رنگینی سے اپنی قوم کے قصر بلند کی تزیین و آرائش کا سامان بہم پہنچائے۔ اس کے لئے دیانت اور ہدیانتی، جھوٹ اور سچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو شخص ان اقدار کا خیال کرنے بیٹھ جائے، وہ امور مملکت

کو سرانجام ہی نہیں دے سکتا۔ (WALPOLE) کے الفاظ میں۔

نیک آدمی کسی بڑی سلطنت کو بچا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک بعض اوقات جانا ضروری ہو جاتا ہے، نیک آدمی وہاں تک نہیں جاسکتے۔

اس ضمن میں ان مجاہدِ وطن (PATRIOTS) کو کیا کچھ کرنا پڑتا ہے، اس کے متعلق اٹلی کے مشہور مدبر (CAVOUR) کے یہ چند الفاظ دہرا دینے کافی ہیں، جس میں اس نے کہا ہے کہ:-

اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں، جو کچھ ہم مملکت کے لئے کرتے ہیں تو کتنے بڑے شیطین کہلائیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ ایک تصویرِ حیات کے بدل جانے سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کس طرح بدل جاتی ہے اور اس تصویرِ حیات کا اثر کس طرح اس کی زندگی کے ہر شعبے اور ہر گوشے کو متاثر کر دیتا ہے۔ یہ جو ابھی تک اخلاقی اقدار کی زبانی تعریف ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے تحت الشعور کو اتنی جلدی ماضی کے اثرات سے آزاد نہیں کر سکتا۔ اگر یہ تصویرِ حیات دو چار نسلوں تک اور آگے بڑھا تو اس کے ذہن سے ان اقدار کا تصور تک مٹ جائے گا اور پھر ان کا زبانی اعتراف بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس کے آثار ابھی سے نمایاں ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ہماری اُبھرنے والی نسل ان اقدار کو دقیقاً لزیت قرار دے کر ان کا مذاق اڑاتی ہے۔

اسلام وہ تصورات دیتا ہے، جن پر انسانی زندگی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے اور اس کا ہر گوشہ بلند انسانی اقدار کا مظہر بن جاتا ہے۔ یہ تصورات، لامذہبیت میں تو ایک طرف، دنیا کے کسی مذہب میں بھی نہیں ملتے۔ یہی اسلام کی وہ خصوصیات ہیں، جن کی بناء پر وہی اور صرف وہی دین الحق قرار پانا اور انسانی فوز و خلاح کا ضامن بنتا ہے۔ اصولی طور پر یہ تصورات، حسب ذیل عنوانات سے متعلق ہیں۔

(۱) خدا کا تصور۔

(۲) خدا اور انسان کا تعلق۔

(۳) انسان اور کائنات کا تعلق۔

(۴) انسان اور انسان کا باہمی تعلق۔

(۵) اعمال اور ان کے نتائج کا تعلق۔

(۶) زندگی کے منہتی و مقصود کا تصور۔

آئندہ صفحات میں اپنی تصورات کے متعلق مختصر الفاظ میں بحث کی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ دیگر بڑے بڑے مذاہب (ہندومت، یہودیت، عیسائیت) میں یہ تصورات کس کس قسم میں اور قرآن کس کس قسم تصورات پیش کرتا ہے اور ان تصورات کی رو سے انسانی زندگی کا نقشہ کس قسم کا مرتب ہوتا ہے۔ واضح ہے کہ اس وقت میرے پیش نظر مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ (COMPARATIVE STUDY OF RELIGIONS) نہیں۔ ان مذاہب میں ان تصورات کے متعلق جو بنیادی عقائد ملتے ہیں، میں صرف اپنی پراکتفا کروں گا۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہمارا ایمان ہے کہ حضرات انبیاء کرام کو خدا کی طرف سے اپنے اپنے وقت میں صحیح اور سچی تعلیم ملتی رہی تھی لیکن اہل مذاہب کی مروجہ آسمانی کتابیں میں وہ تعلیم اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی۔ اس لئے ان تصورات کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا، وہ ان مذاہب کی موجودہ تعلیم پر مبنی ہو گا۔ ان کی اس اصلی اور حقیقی تعلیم پر نہیں جو اس وقت ان میں سے کسی کے پاس بھی موجود نہیں۔ تفصیل اس اجمال کی میری کتاب ”مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں“ میں ملے گی جس میں خود ان مذاہب کے متبعین کی تحقیقات کے مطابق بتایا گیا ہے کہ ان مذاہب کی اصلی تعلیم ان کے ہاں کہیں باقی نہیں رہی لیکن چونکہ یہ حضرات اپنی موجودہ تعلیم کو اپنے مذہب کی بنیاد قرار دیتے ہیں، اس لئے ان تصورات کے متعلق ان کی اسی تعلیم کو سامنے لایا جائے گا۔ اس کے سوا کوئی دوسری شکل ہو بھی نہیں سکتی۔

(۱) خدا کا تصور | ان ہر مذہب (ہندومت، یہودیت، اور عیسائیت) میں ہندو دھرم کا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کا قدیم ترین مذہب ہے۔ اس کی قدامت کا ثبوت ان کی مروجہ مذہبی

کتابیں بہم پہنچا رہی ہیں، جن کا ایک ایک ورق اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ یہ اس زمانے کی تصنیف ہیں، جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا: بچپن کا ذہن، کسی مجرد حقیقت (ABSTRACT REALITY) کا تصور، محسوس پیکروں سے الگ ہٹ کر کر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے اس زمانے کا انسانی ذہن، خدا کی ذات کے متعلق منترہ تصور کیسے قائم کر سکتا تھا۔ اس نے خدا کو اپنی شکل پر ڈھالا اس فرق کے ساتھ کہ انسان کے (مثلاً) دو ہاتھ ہیں تو خدا کے آٹھ ہاتھ سمجھ لئے۔ انسان کا ایک سر ہے، خدا کے دس سر تصور کر لئے۔ انسان پیالہ بھر پانی پی سکتا ہے، خدا پورا سمندر

ہندومت میں خدا کا تصور | اپنے اندر اندل سکتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں تین بنیادی خدا مانے جاتے ہیں، برہما، شیو جی، اور وشنو۔ ان کی بیویاں بھی ہیں اور بچے

بھی۔ شیو جی کی بیوی پاربتی اور ان کا بیٹا گنیش، جس کا جسم انسان کا اور سر باغلی کا ہے۔ برہما کی بیٹی سرسوتی۔ پہلے ان لئے اب الگ کتاب ہے۔ ”مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں“

تین خداؤں کی پرستش ہوتی تھی لیکن اب برہما کی پرستش نہیں ہوتی۔ پرانوں میں ہے کہ ایک دفعہ شیوجی نے دیکھا کہ برہما اپنی لڑکی سرسوتی سے فعلِ شینع کا مرتکب ہونا چاہتا ہے۔ اس لئے اس نے اس کی پرستش بند کر دی۔
(ہندو ازم صفحہ ۱۸۴، مصنفہ گووند داس)

تخلیق کائنات کے متعلق، شوپران میں حسب ذیل بیان ملتا ہے۔
"شیوجی نے سوچا کہ میں دنیا کو پیدا کروں۔ اس نے برہما کو پیدا کیا۔ برہما نے ایک جتو پانی کٹھا کر پانی میں پھینک دیا۔ اس سے ایک بلبکا اٹھا۔ بلبکے میں سے ایک آدمی پیدا ہوا۔ اس نے برہما سے کہا کہ "اے بیٹے دنیا کو بنا"۔ برہما نے کہا میں تیرا بیٹا نہیں، تو میرا بیٹا ہے۔ دونوں میں جھگڑا برپا ہوا۔ ہمدیو (شیوجی) نے سوچا کہ جن کو میں نے دنیا بنانے کے لئے بھیجا تھا، وہ دونوں آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ تب ان دونوں کے پنج میں سے ایک نورانی لنگ پیدا ہوا۔ وہ فوراً آسمان میں چلا گیا۔ اس کو دیکھ کر دونوں حیران ہو گئے۔
اس کے بعد سیٹے کیا ہوا؟

"دونوں سوچنے لگے کہ اس لنگ کا شروع اور آخر معلوم کرنا چاہیے۔ جو پہلے آئے وہ باپ ہو چکے آئے، وہ بیٹا کہلائے۔ دشمنو کچھوے کی شکل بنا کر لنگ کا پتہ لگانے کے لئے نیچے کو چلا۔ برہما ہنس کا جسم بنا کر اوپر کو اُڑا۔ دو ہزار برس دونوں من کی سی تیز رفتار سے چلتے رہے مگر لنگ کی حد نہ ملی۔ برہما نے سوچا، اگر دشمنو پتہ لے آیا ہوگا، تو مجھے اس کا بیٹا بننا پڑے گا۔ وہ ایسا سوچ ہی رہا تھا کہ اس وقت ایک گائے اور کشتیکی کا درخت اوپر سے اُترا۔ برہما نے ان سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم ہزاروں برس سے اس لنگ کے سہارے چلتے آئے ہیں۔ برہما نے پوچھا کہ اس لنگ کی کوئی حد ہے یا نہیں۔ انہوں نے کہا نہیں۔"

"برہما نے کہا، میرے ساتھ چل کر اس کی گواہی دو کہ گائے اس لنگ کے سر پر دودھ کی دھواں بہاتی تھی اور درخت کہے کہ میں پھول برساتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہم جھوٹی گواہی نہیں دیں گے۔ تب برہما خفا ہو کر بولا کہ گواہی نہیں دو گے تو میں تمہیں ابھی خاکستر کر دوں گا۔ تب دونوں نے ڈر کر کہا کہ جیسے تم کہو ویسی ہی گواہی دے دیں گے۔ تب تینوں نیچے کی طرف چلے۔
"برہما نے دشمنو سے پوچھا کہ تم نے اس لنگ کی حد معلوم کی یا نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ

نہیں۔ برہانے کہا کہ میں پتہ لے آیا ہوں۔ دشمنوں نے کہا کہ گواہی دو۔ تب گائے اور درخت نے جھوٹی گواہی دی۔ اس پر لنگ نے کیشکی کو بددعا دی کہ تو نے جھوٹ بولا ہے۔ تیرا پھول مجھ پر کبھی دیوتا پر کبھی نہیں چڑھے گا۔ جو کوئی چڑھاوے گا، اس کا ستیاناس ہو جائے گا۔ گائے کو بددعا دی کہ جس منہ سے تو نے جھوٹ بولا ہے، اس منہ سے تو پاخانہ کھایا کرے گی۔ تیرے منہ کی پرستش کوئی نہیں کرے گا لیکن دم کی کریں گے۔ برہا کو بددعا دی کہ تو نے جھوٹ بولا ہے اس لئے تیری پرستش دنیا میں کبھی نہیں ہوگی۔ دشمن کو بددعا دی کہ تو نے سچ بولا ہے، اس لئے تیری پرستش سب جگہ ہوگی۔ پھر دونوں نے لنگ کی حمد و ثنا کی۔

”اس حمد و ثنا کو سن کر لنگ میں سے ایک جٹا جوٹ صورت نکل آئی اور کہنے لگی کہ میں نے تم کو خلقت پیدا کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ تم جھگڑے میں کیوں پڑ گئے۔ تب مہا دیو نے بالوں میں سے راکھ کا ایک گولہ نکالا اور کہا، جا کر اس سے خلقت پیدا کر دو۔“

(بحوالہ ستیارتھ پرکاش، سوامی دیانند، صفحہ ۲۴۳-۲۴۲۔)

خدا کا تصور وہ بلند ترین آئیڈیل ہوتا ہے جسے کوئی قوم اپنے سامنے رکھتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس قوم کے سامنے خدا کا یہ تصور ہو، اس کے اعمال و حیات کس قسّم ہو سکتے ہیں! نہ اس قوم کا ذہن تو ہم پرستی سے نجات حاصل کر سکتا ہے، نہ ان کے اعمال کا مدار علم و بصیرت قرار پاسکتا ہے۔ وہ جس خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں وہ بھی انسانی پیکر سے بلند نہیں ہوتا۔ چنانچہ اتھروید میں ہے کہ خدا کی پوجا پاٹ کے وقت یہ کہنا چاہیے کہ ”اے جیتوں کے سوامی پرانما! تیرے مکھ (منہ) کو منسکار (سجدہ) ہے۔ تیری آنکھوں کو منسکار ہے۔ تیری چمڑی کو منسکار ہے۔ تیرے انگوں (اعضائے) کو منسکار ہے۔ تیرے پیٹ کو منسکار ہے۔ تیری جلیبھ (زبان) کو منسکار ہے۔ تیرے مکھ (چہرے) کو منسکار ہے۔ تیرے دانتوں کو منسکار ہے۔ تیرے دانتوں کی گندھ (بو) کو منسکار ہے۔“

طا کہہ دیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر میں بھی بہت سی توہم پرستانہ خرافات مل سکتی ہیں لیکن سوال عام مذہبی لٹریچر کا نہیں بلکہ ان کتابوں کا ہے جنہیں اہل مذاہب بطور سند پیش کریں۔ ہمارے ہاں دین میں نہ صرف قرآن کریم ہے جو ان چیزوں سے بہت بلند اور منزّہ ہے۔

یہودیوں کے ہاں خدا کا تصور

ہندومت کے بعد، اب یہودیت کی طرف آیتے اور دیکھتے کہ وہاں خدا کا تصور کس قسم کا ملتا ہے؛ غالباً لاک (LOCKE) نے

کہا تھا کہ تم مجھے بتا دو کہ فلاں قوم نے اپنی پرستش کے لئے کس قسم کا خدا تجویز کیا تھا اور میں یہ بتا دوں گا کہ اس قوم کی تہذیب اور اس کا تمدن کس قسم کا تھا۔ مروجہ تورات کے مطالعہ سے خدا کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے، اس کے متعلق ایک مغربی محقق کا پیش کردہ جائزہ سامنے لے آنا کافی ہوگا۔ (JOSEPH WHEBS) اپنی کتاب (IS IT GOD'S WORDS) میں لکھتا ہے۔

”تورات کا خدا بے شمار قاتلوں کے بہائے ہوئے خون سے ہولی کھیلتا نظر آتا ہے۔ وہ خود بھی قاتل اور مفسد ہے۔ چور، غدار، انتقام کے جذبے میں ایک خونخوار عنقریب، گنہگار اور بے گناہ، دلوں کو بے رحمی سے سزا دینے والا، نہایت ہیبر اور خوفناک، ظلم اور تعصب کا مجسمہ، متکبر، شیخی باز، وعدہ خلاف، غلط بیان اور ڈھٹائی سے جھوٹ بولنے والا۔“

(بحوالہ مذہب عالم کی آسمانی کتابیں، ص ۳۱) (ایڈیشن ۱۹۷۷ء)

تورات میں ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا کیا۔ اب ظاہر ہے کہ جس خدا کی اس قسم کی شکل ہو، اس کی پیدا کردہ قوم کی شکل بھی ایسی ہی ہوگی۔ یہ خدا کی شکل نہیں بلکہ اس قوم کی اپنی سیرت کا بیان ہے۔ خدا کے اس قسم کا تصور کے بعد، اخلاقی اقدار کا جو حشر ہو سکتا ہے، اس کے لئے کسی مراحات اور وضاحت کی ضرورت نہیں۔

عیسائیت میں خدا کا تصور

یہودیت سے آگے بڑھ کر عیسائیت کی طرف آیتے تو وہاں خدا کا تصور کی چیتاں سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ کونسل آف ٹرنٹ نے عیسائیت کے بنیادی عقیدہ کے لئے جو نظریہ تجویز کیا تھا اور جس کے اقرار سے ایک شخص عیسائی بنتا ہے، حسب ذیل ہے:

ہم ایمان لائے۔ (۱) خدا، قدرت والے باپ پر جو ظاہر اور پوشیدہ چیزوں کا خالق ہے اور ہم ایمان لائے (۲) رب یسوع ابن اللہ پر جو باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جو باپ یعنی خدا کے ہاں جملہ کائنات سے پہلے پیدا ہوا۔ عین ذات ہے۔ عین خدا ہے۔ باپ اور اس کا جوہر ایک ہے۔ اس کی وساطت سے تخلیق اشیاء ظہور میں آئی۔ ہم انسانوں کی نجات کے واسطے اس کا نزول و حلول ہوا۔ وہ انسان بن کر آیا۔ مبتلائے مصیبت ہوا اور تیسرے دن اٹھ کھڑا ہوا اور آسمان پر چڑھا

اور اب زندوں اور مردوں کا انصاف کرنے کے لئے پھر دنیا میں آئے گا۔
یہ تو رہا حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا عقیدہ۔ ان کی والدہ ماجدہ، حضرت مریمؑ کے متعلق مقدس کلیسا کا عقیدہ یہ ہے کہ

وہ خدا کے نزدیک بڑی قوتوں کی مالک ہے۔ وہ جو کچھ مانگتی ہے، اسے دیا جاتا ہے۔ وہ ہمارے لئے سرچشمہ خیر ہے کیونکہ وہ ہمارے خدا سے مانگتی ہے۔ چونکہ وہ خدا کی ماں ہے، اس لئے وہ اس کی درخواست کو مسترد نہیں کر سکتا اور چونکہ وہ ہماری بھی ماں ہے، اس لئے وہ ہماری سفارش سے انکار نہیں کر سکتی..... ہم اپنی نجات کے لئے جو دعائیں اس سے کرتے ہیں، وہ مستجاب ہوتی ہیں۔

(CATHOLIC SCHOOL BOOK, P-158)

(بحوالہ شعلہ مستور صفحہ ۱۳۸)

چنانچہ اب حال ہی میں، پوپ کی مجلس نے فیصلہ کیا ہے کہ باپ، بیٹا اور روح القدس کے ساتھ حضرت مریمؑ کی بھی پرستش کی جایا کرے گی۔

قرآن کا دیا ہوا تصور | خدا کے ان تصورات کے بعد اب قرآن کریم کی طرف آئیے۔ اس نے سب سے پہلے ان تمام تصورات کی یہ کہہ کر تردید کر دی کہ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُصِفُونَ (۱۱۲/۱)

لوگ خدا کے متعلق جو تصورات اپنے ذہن سے پیش کرتے ہیں، وہ ان سے بلند اور پاک ہنے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے، تم اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ تم اپنی چیزوں کا ادراک کر سکتے ہو، جو محسوسات کے دائرہ میں آسکیں اور خدا کی ذات اس سے ماوراء ہے۔ لہذا لَا تُدْرِكُهُ الْبَصَارُ دَهْوَ يُدْرِكُهُ الْإِبْصَارُ دَهْوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (۶/۱۰۴) ”انسانی نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ وہ بہت لطیف و خیر ہے۔“ اس کی ذات کو کسی مثال سے بھی نہیں سمجھایا جاسکتا۔ اس لئے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (۲۲/۱۱) اس کی مثل کوئی شے نہیں۔ تَمَّيْلُكَ ذَكَرْتُكَ (۱۱۲/۲) نہ وہ خود کسی کا بیٹا نہ کوئی اس کا بیٹا۔ ذَكَرْتُكَ لَمْ يَكُنْ لَكَ كُفُوًا أَحَدٌ (۱۱۲/۴) نہ کوئی اس کا ہمسر، وہ بیکھر یگانہ اور بے مثل و بے نظیر ہے۔

اس کی ذات کے متعلق تو تم کچھ نہیں جان سکتے۔ البتہ اس نے جو اپنی صفات بیان کی ہیں، ان سے خدا کا جو تصور سامنے آتا ہے، اس سے بلند، پاکیزہ، با عظمت اور حسین تصور ہو ہی نہیں سکتا۔

۲۔ خدا اور انسان کا تعلق

سوال یہ ہے کہ خدا کی ان صفات پر ایمان لانے سے فائدہ کیا ہے۔ ایک شخص تسلیم کرتا ہے کہ خدا کی یہ صفات ہیں۔ دوسرا اس سے انکار کرتا ہے اُس اقرار اور اس انکار سے اس کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے؟ قرآن اس کا جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر انسانی بیکر ”روح خداوندی“ کا حامل ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات میں اس کا امکان رکھ دیا گیا ہے کہ وہ (علیٰ حد بشریت) ان خدائی صفات کو اپنے اندر جا کر کرتی جائے۔ یہی وہ خدا کا رنگ ہے، جس سے حسین تر رنگ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ (صِبْغَةَ اللَّهِ ذَمِّنْ أَحْسَنُ مِنْ اللَّهِ صِبْغَةً) (۱۲۸) اس اعتبار سے خدا کی یہ صفات، انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ایک خارجی معیار (OBJECTIVE STANDARD) کی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔ یہ وہ (IDEAL) ہے جس کے مطابق انسان اپنے آپ کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ وہ معیار ہے جس پر وہ پورا اترنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس خارجی معیار پر برآں اپنے آپ کو پاتا جاتا ہے اور اس طرح علیٰ وجہ البصرت پر کھتا جاتا ہے کہ اس کی ذات کی کس حد تک نشوونما (DEVELOPMENT) ہوئی ہے اور اس میں ہنوز کیا کمی ہے۔

اس کے ساتھ ہی قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ کس موقع پر خدا کی کون سی صفت کا ظہور ہوتا ہے تاکہ ایسے موقع پر انسان کی طرف سے بھی اسی قسم کی صفت کا ظہور ہو۔ اس سے یہ شیعین ہوتا ہے کہ خارجی واقعات و حوادث پر انسان کا ردِ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ یاد رکھئے! جس طرح انسان کے لئے صفاتِ حسنہ کا حامل ہونا ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ کسی واقعہ پر انسان کی طرف سے اسی صفت کا ظہور ہو، جو اس کے لئے مناسب اور موزوں (APPROPRIATE) ہو۔ شقی القلب ظالم پر، جس کے دل میں نہ احساسِ ندامت ہو نہ آرزوئے اصلاح، ترس کھا کر اسے کھل چھوڑ دینا، مظلوم انسانوں پر بے انتہا ظلم ہے لیکن جہاں عفو اور درگذری سے خوشگوار نتائج متوقع ہوں، وہاں بدلہ لینا ظلم کے مترادف ہو جاتا ہے۔ عضلات (MUSCLES) کی چوٹ آہستہ آہستہ مالش سے ٹھیک ہو جاتی ہے لیکن ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو سخت سکڑی کی تختیوں (SPLINTS) سے کس کر باندھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے جبریت کہتے ہیں۔ (جراح کی ان سکڑیوں کو جبار کہتے ہیں) قرآن کریم ان صفاتِ خداوندی اور ان کے مواقعِ ظہور و اطلاق کو بڑی شرح و بسط سے بیان کرتا ہے تاکہ وہ جہاں ایک فرد کی ذات کی نشوونما کا معیار بنیں، وہاں یہ بھی بتائیں کہ انسان کی طرف سے کس موقع پر کس قسم کا ردِ عمل ہونا چاہیئے۔

اسی سے ایک اور اہم حقیقت سامنے آتی ہے۔ مذہب میں خدا کا تصور ایک مستبد بادشاہ (AUTOCRAT KING)

اور مطلق العنان آمر (DICTATOR) کا ہوتا ہے، جس کے تمام فیصلے اس کی مرضی پر منحصر ہوتے ہیں اور ان

میں کسی قاعدے اور قانون کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ خوش ہو گیا تو مجرم کو خلعت بخش دی۔
قانون کا خدا ناراض ہو گیا تو بے گناہ کو حوالہ دار و رسن کر دیا۔ انسان کی خیریت اسی میں ہے کہ جس طرح

ہو سکے، اس "خدا" کو خوش رکھے۔ وہ اس کی خوشنودی مزاج حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتا ہے۔ اس کے حضور نذرانے گزارتا ہے۔ اس کے مقربین کے وسیلے حاصل کرتا ہے۔ اس تک سفارشیں پہنچاتا ہے۔ اس کی ناراضگی سے ہر وقت ڈرتا ہے اور اس ڈر سے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ ان احکام کی فرمانبرداری سے انسان کا اپنا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس سے مقصود صرف "خدا" کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ دوسری طرف، عیسائی ریستے جہاں خدا کا تصور ایک رفیق القلب باپ کا ہے۔ وہاں بھی قاعدے اور قانون کا کوئی واسطہ نہیں۔ وہاں نجات کا مدار خدا کے رحم پر ہے یا مسیح کے کفارہ کے ایمان پر۔

قرآن نے اگر اس تصور کی بھی تردید کی اور کہا کہ خدا نے اپنی لامحدود قوتوں اور بے انتہا اختیارات کے باوجود ہر کام کے لئے قاعدے اور قوانین مقرر کر رکھے ہیں اور وہ سب کچھ ان قوانین کے مطابق کرتا ہے۔ یہ قوانین اس تذاتل میں کہ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ فَالَّذِينَ تَبْتَغُونَ مِنْ رَبِّهِمْ يُلَاقُوا رَبَّهُمْ كَاشِفٍ غُطَّتْ أَعْيُنُهُمْ فَوَافِقًا يُبْصِرُونَ۔ خَلَقَ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا وَلَا كُنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَغْيِيلًا (۲۴/۴۱) قانون کے معنی یہ ہیں کہ یہاں ہر بات (CAUSE AND EFFECT) علت اور معلول کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے یعنی اگر فلاں کام کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ اگر اس کی خلاف ورزی کرو گے تو اس کا انجام یہ ہوگا۔ اس نے انسان کو یہ تمام قوانین بتا دیئے، اچھی طرح سمجھا دیئے۔ اس پر واضح کر دیا کہ اس قانون پر عمل کرنے سے اس کا یہ فائدہ ہوگا اور اس کی خلاف ورزی سے اس کا یہ نقصان ہوگا۔ یہ سب کچھ بتا دینے کے بعد اس سے کہہ دیا کہ اب تمہارا جی چاہے تو یہ راستہ اختیار کر لو اور جی چاہے تو اس کے خلاف چلے جاؤ۔ اِنَّا هَدَيْنَاكَ سَبِيلًا السَّبِيلَ اِمَّا شَاكِرًا وَاِمَّا كَافِرًا (۲۴/۴۲) ہم نے اسے راستہ دکھا دیا۔ اب وہ چاہے اسے اختیار کرے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔ وہ صحیح راستہ اختیار کر لے گا تو اس سے اسی کا فائدہ ہوگا، ہمارا کچھ نہیں سنوے گا۔ غلط راستے پر چلے گا تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، ہمارا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶) یہی وجہ ہے کہ خدا کسی بات کو حکماً اور جبراً نہیں منواتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے، مشورۃ کہتا ہے۔ اس نے قرآن نازل کرنے کے بعد کہہ دیا کہ

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمَرْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (۱۸/۲۹)

ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف آگیا۔ اب جس کا جی چاہے اسے مان لے جس کا جی چاہے اسے انکار کر دے۔

ظاہر ہے کہ جس بات کے ماننے، نہ ماننے کا فیصلہ انسان پر چھوڑ دیا گیا ہو، اگر وہ صاحب عقل و ہوش ہے تو وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے گا۔ لہذا قرآن کی رو سے ایمان، اندھے یقین (BLIND FAITH) کا نام نہیں۔ یہ اس ذہنی اور قلبی اطمینان (CONVICTION) کا نام ہے جو انسان کو علی وجہ البصیرت حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس لے مومنین کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ

الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخْفَوْا أَعْلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا (۲۵/۳)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب (اور تو اور) خود ان کے رب کی آیات بھی ان کے سامنے لائی جاتی ہیں، تو وہ ان پر ہرے گونگے بن کر نہیں گر پڑتے، انہیں عقل و بصیرت سے قبول کرتے ہیں۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب اعمال کے نتائج، قاعدے اور قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہوں، تو اس میں کسی کے فیدہ دے کر چھوٹ جانے یا سفارش سے رہا ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آپ اپنی انگلی آگ میں ڈال دیں اور اس کے بعد ہزار روپیہ دے کر بھی چاہیں کہ جلنے کا درد آپ کی جگہ کسی اور کو ہو جائے تو یہ ناممکن ہو گا۔ اگر آپ سنکھیا کھالیں، تو چاہے آپ گورنر جنرل کی سفارش بھی کیوں نہ لے آئیں، آپ اس کے مضر اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ آپ خدا کے اس قانون کی طرف رجوع کریں جس کے مطابق، جلنے کے درد کو آرام اور سنکھیا کے ہلکے اثرات سے حفاظت مل سکتی ہے۔ انسان کو تکلیف اور راحت، اس کے اعمال کے نتائج میں خدا کے قانون کے مطابق ملتی ہے۔ رِيْضَ لِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيُخَيَّلِيْ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲)

ما کہ جو ہلاک ہوتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہتا ہے، وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے زندہ رہے۔ نہ کوئی بے گناہ، مستبد حاکم کے غصے اور جذبہ انتقام سے سزا پاتا ہے اور نہ ہی مجرم، فدیہ، کفر یا سفارش سے چھوٹ سکتا ہے۔ اسی لئے انسانوں سے کہہ دیا گیا ہے کہ

وَتَقُوْا يَوْمًا لَا تَجْعَلُ فِيْ نَفْسٍ مِّنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّ لَا يَقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةً وَّ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا هُمْ يُنصَرُونَ (۲/۴۸)

ظہور نتائج کے وقت کوئی شخص کسی دوسرے کے کام نہیں آسکے گا۔ نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی جائے گی۔ نہ ہی کوئی معاوضہ دے کر چھوٹ سکے گا نہ ہی مجرمین کی کوئی مدد کر سکے گا۔

آپ نے غور کیا کہ "قانونِ واسطے خدا" کا تصور دے کر قرآنِ کریم نے کس طرح مذہب کو سائنس بنا دیا۔ سائنس کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس میں

(۱) ہر سبب (CAUSE) اپنا ایک مقررہ نتیجہ (EFFECT) پیدا کرتا ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔ اور

(۲) سائنس، انکشافِ حقیقت اس طرح کرتی ہے کہ اس پر کسی شخص کی خواہش، آرزو، مقصد، مفاد، جذبات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ ان باتوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتی۔

خدا کا جو تصور قرآن پیش کرتا ہے، اس کی رو سے اعمال اپنے نتائج بھی اسی طریق سے مرتب کرتے ہیں اور حقائق کا اظہار بھی اسی طرح کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ ہمارا یہ پیغام "شاعری" نہیں۔ کالزج (COLERIDGE) نے ایک جگہ کہا ہے کہ شاعری کی ضد، نثر نہیں، سائنس ہے (THE ANTI-THESIS OF REALITY IS NOT PROSE BUT SCIENCE) قرآن شاعری نہیں، سائنس ہے۔

خدا اور انسان کے تعلق کے سلسلے میں، قرآنِ کریم ایک اور عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کرتا ہے۔ خارجی کائنات میں خدا کے قوانین از خود جاری و ساری ہیں۔ ان کے مطابق، ہر شے اپنے اپنے فریضہ کی تکمیل میں سرگرم عمل رہتی ہے۔ اور کائنات اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ انسانی دنیا میں بھی خدا کے قوانین اسی طرح نافذ و عمل ہیں لیکن ان کی کائناتی رفتار بڑی سست ہے اور انسانی عمر کا تقاضا ہے کہ اعمال کے نتائج جلد سامنے آجائیں۔ اگر انسانی دست و بازو قوانینِ خداوندی کو سہارا دیں اور ان کے بڑے کار آئے میں مدد کا موجب بنیں، تو ان کے نتائج انسانی حساب و شمار کے مطابق مرتب ہو سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے انسان، مشیت کے پروگرام کی تکمیل میں، خدا کا رفیق بن جاتا ہے۔ خدا اور انسان کا یہ تعلق ہے، جس کے متعلق "مذہب کی دنیا" میں کہیں اشارہ تک نہیں ملتا۔ (چونکہ اس نکتہ کے متعلق، میں اس سے بہت پہلے لکھ چکا ہوں، اس لئے اس مقام پر اس کی تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔)

۳۔ انسان اور کائنات کا تعلق

خدا اور انسان کے تعلق کے بعد، انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کا سوال سامنے آتا ہے۔ جب ذہن انسانی اپنے

ہمدِ طفولیت میں تھا تو فطرت کی قوتوں کا راز اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔ وہ ان سے ڈرتا تھا اور ان کے غضب سے بچنے کا ایک ہی طریقہ اس کے ذہن میں آ سکتا تھا۔ یعنی ان کے سامنے گڑا گیا جائے اور ان سے رحم کی درخواست کی جائے۔ چنانچہ اس دور کے انسان کی حالت یہ تھی کہ بادل گر جا اور اس نے ہاتھ جوڑ دیتے۔ بجلی کڑکی اور یہ سجدے میں گر گیا۔ سورج چمکا اور اس نے نمسکار کر دیا۔ زلزلہ آیا اور یہ ڈنڈوت بجالایا۔ پھر ہوا دریا سامنے آیا اور اس نے اسے ماتا کہہ دیا۔ شیر دھاڑا اور اس نے اسے دیوتا بنالیا۔ ہندو مت انہی دیوی دیوتاؤں کا مجموعہ ہے اور انہی کی پرستش سکھاتا ہے۔ بجز قید میں ہے۔

زمین میں رہنے والے سانپوں کو سجدہ قبول ہو۔ جو سانپ ہو ایسے یا آسمان پر ہیں ان کو ہمارا سجدہ ہو۔ جو سانپ دھانوں کے تیروں کے ساتھ آتے

ہندو دھرم میں

ہیں انہیں بھی سجدہ ہو۔ جو سانپ ابھی اپنے بلوں میں ہیں، انہیں بھی ہمارا سجدہ قبول ہو۔ یہ تو پھر بھی زندہ قوتیں تھیں، وہ ان غیر ذی حیات کو بھی سجدے کرتے تھے جن سے انہیں کسی نقصان کا اندیشہ ہوتا۔ چنانچہ بجز قید ہی میں دوسری جگہ ہے کہ حجامت بنواتے وقت یہ اشلوک پڑھنا چاہیئے۔
ہے اُسترے تو کلیان کاری ہے اور اچھے لوہے کا بنا ہوا ہے۔ تجھے ہمارا سجدہ قبول ہو تو اس بالک کو تکلیف نہ پہنچائیو۔

اتھر قید میں ہے۔

سردی والے بخار کو ہمارا سجدہ ہو۔ گرمی والے بخار کو بھی میں سجدہ کرتا ہوں، روزانہ 'دوسرے اور تیسرے دن آنے والے بخار کو میرا سجدہ قبول ہو۔

ظاہر ہے کہ جس مذہب میں انسان اپنا مقام یہ سمجھے 'اس میں شرفِ انسانیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں اس نے اگر 'جھوٹ نہ لو، سچ لو، کہہ بھی دیا تو کیا اس سے کائنات کی گتھیاں سلجھ جائیں گی اور انسانی معاملہ (HUMAN PROBLEMS) کا حل مل جائے گا؟

یہاں سے اتر کر دوسری طرف آئیے تو وہاں مادی کائنات اور اس کی آرائش و آسائش کی چیزوں کو یکسر قابلِ نفرت قرار دیا جاتا ہے اور انسانی بخت کا راز ترکِ دنیا، ترکِ آرزو اور ترکِ لذات میں بتایا جاتا ہے۔ جتنا کوئی دنیا سے دُور بھاگے، اتنا ہی وہ خدا کا مقرب ہو جاتا ہے۔ رہبانیت اور خالقِ ہیت کی تعلیم، عیسائیت کی اصل و بنیاد ہے۔ (SAINT BENDICT) نے اسے ایک منظم ادارہ کی شکل دے کر تارک الدنیا راہبوں (MONKS) اور راہبات

(NUNS) کے غول کے غول پیدا کر دیتے۔ چنانچہ (BUCKS) (THEOLOGICAL)

عیسائیت میں

DICTIONARY میں مصر میں تحریکِ خانقاہیت کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ

تھوڑے ہی عرصہ میں تمام مشرقِ سہل انگار انسانوں کی جماعتوں سے بھر گیا، جنہوں نے تمام دیہاتی علاقے سے قطع تعلق کر کے کرب و اذیت اور مصائب و نواب کی زندگی اختیار کر لی تاکہ اس کے ذریعہ خدا اور عالم ملکوت سے قرب حاصل کیا جاسکے۔

اس قسم کی زندگی کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا، وہی ہوا۔ چنانچہ (BUCKS) اس سلسلے میں لکھتا ہے۔

لیکن کچھ عرصہ بعد ان لوگوں کی شہوت پرستی ضربِ امثل ہو گئی۔ نیز انہوں نے مختلف مقامات پر لوگوں کو مشتعل کر کے ہنگامے اور شورشیں برپا کرنا شروع کر دیں۔

ان تارک الدنیا زاہدوں سے ایک دنیا تنگ آرہی تھی۔

پلٹ پلٹ کر مانگنے والے بھکاری، راہبوں کے لباس میں ہر گلی کوچے میں آوارہ پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ہر قسم کی بد معاشی اور فریب دہی ان کا شعار تھا۔۔۔ یہ لوگ مذہبی جوش و عقیدت کے نقاب میں بدترین لوٹ کھسوٹ کی وارداتوں کے مرتکب ہوتے تھے۔

(PROCESS OF RELIGIOUS IDEAS VOL 3, P-240)

جو لوگ اس قسم کی مذموم حرکات کے مرتکب نہیں ہوتے تھے، ان کی زندگی بھی عجیب و غریب انداز کی ہوتی تھی عیسائیوں کے ہاں جو بڑے بڑے اولیاء (SAINTS) کا نام ملتا ہے، ان کی کیفیت یہ تھی کہ کوئی قسم کھا لیتا کہ میں عمر بھر غسل نہیں کروں۔ کوئی اپنے آپ کو عمر بھر دلدل میں ڈالے رکھتا۔ کوئی غلاظت کے حصار میں بیٹھے رہنے میں روحانی ترقی کا راز سمجھتا۔ کوئی ساری عمر اندھیری کوٹھڑی میں بٹا رہتا۔ یہ تھا عیسائیت کی ترک دنیا کی تعلیم کا نتیجہ۔

قرآن آیا اور اس نے انسان سے کہا کہ تیرا مقام فطرت کی قوتوں سے بہت بلند ہے۔ ان سب کو ہم نے قانون کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے تاکہ تو ان سے اپنے فائدے کے کام لے۔ (اللہ اَلَّذِیْ) سَخَّرَ لَکُمْ مِّنْ

ط کہا جاسکتا ہے کہ خود مسلمانوں کی خانقاہوں اور تہجد گاہوں کے حالات بھی ایسے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے لیکن فرق یہ ہے کہ عیسائیت یا ہندوؤں اور بدھوں وغیرہ میں ترک دنیا کی تعلیم ان کا عین مذہب ہے اور مسلمانوں میں یہ کچھ قرآن کی کھلی ہوئی تعلیم کے خلاف ہوتا ہے۔ ہم اس وقت ان مذاہب کی تعلیم کے نتائج کے متعلق بات کر رہے ہیں۔

قرآن کریم کی رو سے

فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳) اللہ وہ ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب تمہارے لئے تابعِ تسخیر کر دیا ہے۔ اس نے کہا کہ مقامِ آدم یہ ہے کہ تمام ملائکہ (فطرت کی قوتیں) اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ اور مقامِ مومن یہ ہے کہ وہ ان قوتوں کو مستخر کر کے انھیں نوری انسان کی نفع رسانیوں کے لئے صرف کرے۔ محسوس کائنات میں انسان سے اوپر صرف مقامِ خداوندی ہے، جس کے قانون کے مطابق اسے زندگی بسر کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ انسان سے برتر کوئی شے نہیں۔ دنیا کی زیبائش و آرائش کی چیزیں انسان کے لئے بنائی گئی ہیں۔ انہیں کوئی قابلِ نفرت اور حرام قرار نہیں دے سکتا۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الْمَرْثَقِ (۷/۳۲)

ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو ان زینت کی چیزوں کو جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا، اور خوشگوار رزق کو حرام قرار دے سکتا ہے؟

آدمی کا یہ مقام اور انسان اور کائنات کا یہ تعلق ”دنیا تے مذاہب“ میں آپ کو کہیں اور نہیں ملے گا۔ وہاں یا تو مظاہرِ فطرت کے سامنے جھک جانا ہوگا یا ان سے دُور بھاگ جانا۔ انھیں مستخر کر کے تعمیرِ انسانیت کے کاموں میں صرف کرنا، صرف قرآن میں ملے گا۔

یاد رکھئے کہ قرآن کریم جب قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا حکم دیتا ہے تو ان میں فطرت کے طبیعی قوانین بھی شامل ہوتے ہیں اور اخلاقی قوانین بھی۔ طبیعی قوانین کی اطاعت سے ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ فطرت کی قوتوں کو مستخر کر لیں۔

(WE OBEY NATURE TO COMMAND IT)

اور اخلاقی قوانین کی اطاعت سے ہماری ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں قوانین کی اطاعت، ہماری قوتوں میں اضافہ کا موجب بنتی ہے۔

می شود از جبر پیدا اختیار

۴۔ انسان اور انسان کا باہمی تعلق

انسان اور کائنات کے تعلق کے بعد ہمارے سامنے انسان اور انسان کے باہمی تعلق کا سوال آتا ہے۔ ہندو مت

نے اس کے متعلق فیصلہ کر دیا کہ برہمن، برہما کے سر سے پیدا ہوتے ہیں، کھشتری اس کے بازوؤں سے، دیش اس کی ٹانگوں سے اور شودر اس کے پاؤں سے۔ یہ وہ ازلی تقسیم ہے، جسے نہ دنیا کا کوئی نظام الٹ سکتا ہے اور نہ ہی انسانوں کی ذاتی کوششیں اس میں تغیر و تبدل کر سکتی ہیں۔ شودر کو ساری عمر چھوت رہنا ہوگا۔ اس کا فریضہ، اوپخی ذات کے ہندوؤں کی خدمت گزاری ہے۔ برہمن کے گھر پیدا ہونے والا بچہ، پیدائش کے دن سے مرتے وقت تک، بلند ترین مدارج اور حقوق کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے حقوق کی کیفیت یہ ہے کہ (رگ وید اور اتھروید کے حکم کے مطابق)

اگر کسی عورت کے پہلے دس غیر براہمن خاوند موجود ہوں لیکن اگر براہمن اس کا ہاتھ پکڑ لے تو وہی اکیلا اس کا خاوند سمجھا جاتے کیونکہ براہمن ہی عورتوں کا مالک اور خاوند ہے نہ کہ کھشتری یا دیش۔

(مذہب عالم کی آسمانی کتابیں ص ۱۹۰) (ایڈیشن ۱۹۷۷ء)

یہ تقسیم تھی بھارت کے اندر بسنے والے انسانوں کی۔ باقی رہے اس کے باہر کے انسان، سو وہ انسان نہیں ملیکھ جاسکتے تھے۔ آپ سوچتے کہ جس مذہب میں، خود اپنے اہل مذہب کو اس طرح ورنوں کی نہ لٹھنے والی زنجیروں میں جکڑ دیا جاتے اور اس سے باہر کے انسانوں کو اس درجہ قابل نفرت و حقارت سمجھا جاتے، اس میں جھوٹ نہ بولوا اور چوری نہ کر دکا پر چار کیا اخلاقی اصلاح پیدا کر سکتا ہے؟

یہودیّت میں | یہودیوں کے ہاں مذہب بنی اسرائیل کی نسل کے اندر محدود تھا۔ کوئی شخص جو بنی اسرائیل کے ہاں پیدا نہ ہو، دین خداوندی کے اندر داخل کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ جنت صرف بنی اسرائیل کے لئے مخصوص تھی۔ غیر بنی اسرائیل سب جہنم کا ایندھن تھے۔ اپنی نسل سے باہر کے انسانوں کے خلاف ان کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات بھڑکتے رہتے تھے اور یہ سب (مروجہ) تورات کی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ ان کے ہاں یہودیوں کے لئے قانون اور عہد اور غیر بنی اسرائیل کے لئے اور۔

عیسائیت میں | عیسائیت کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ تمام انسانوں کے لئے عالمگیر مذہب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا لیکن یہ چیز، عیسائیت کی تعلیم نہیں بلکہ بعد میں سیاسی مصلحتوں کا پیدا کردہ تصور ہے۔ چنانچہ موجودہ انجیل میں (جو اگرچہ وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہے) ابھی تک یہ لکھا ملتا ہے کہ جب حضرت یسوعؑ نے اپنے حواریوں کو تبلیغ کے لئے بھیجا تو انھیں حکم دیا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بیڑوں کے

(مثنیٰ، باب صفحہ ۱۰، آیات ۵-۶)

کے پاس جانا۔

یہاں تک کہہ دیا کہ

پاک چیز کثرتوں کو نہ دو اور اپنے موتی سُرودوں کے آگے نہ ڈالو۔ (مثنیٰ، باب ۵، آیت ۶)

یہ جو آپ یورپ میں نیشنلزم کی لعنت کو اس درجہ شدید دیکھتے ہیں، یہ غیر شعوری طور پر اسی تعلیم کا نتیجہ ہے، مذہب کو تو انھوں نے گرجا کی چار دیواری کے اندر محبوس کر دیا۔ لیکن اس کی نسل پرستی کی تعلیم کے اثرات ان کے تحت الشعور میں اسی طرح موجود ہیں۔ ان کے سامنے عالمگیر انسانیت کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں اپنی قوم کے لئے اخلاقی اصول اور ہیں اور دوسری قوموں کے لئے اور۔ جس طرح رومنز کے ہاں یہ قانون تھا کہ کسی رومی کے ہاں چوری کرنا جرم ہے اور غیر رومی کے ہاں چوری کرنا کوئی جرم نہیں۔

قرآن نے آکر انسانوں کی ان خود ساختہ زنجیروں کو توڑا اور اعلان کر دیا کہ تمام دنیا کے انسان ایک ہی اصل کی شاخیں

اور ایک ہی درخت کے برگ و بار ہیں۔ انسان اور انسان میں پیدائش کے اعتبار سے

قرآن کی رُوسے | کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا۔ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (۴/۱) خدا نے تم سب کو ایک جڑوئمہ حیات (LIFE CELL) سے پیدا کیا ہے۔ اس لئے تمام نوح انسان ایک عالمگیر برادری ہے۔ وَمَا خَلَقَ النَّاسَ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً (۱۰/۱۹) پوری کی پوری انسانیت (MANKIND) ایک قوم ہے اور ہر انسان پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۷/۷۰)

ہم نے تمام انسانوں کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔

کالے کو گورے پر، گورے کو کالے پر، عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت نہیں۔ یہاں نہ کوئی براہمن ہے نہ خود رتنہ کوئی جاتی اتر ہے نہ پنج۔ سب انسان یکساں ہیں۔ باقی رہے معاشرہ میں ان کے مدارج، سو اس کا معیار ان کے جوہر ذاتی اور سیرت و کردار پر ہے۔ وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِمَّا عَمِلُوا (۲۶/۱۹) ہر ایک کے درجات ان کے اعمال کی رُو سے متعین ہوں گے اور ان میں سب سے زیادہ واجب العزت وہ ہوگا، جس کی سیرت سب سے پاکیزہ اور کردار سب سے بلند ہوگا۔ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُ (۲۹/۱۳) قرآن کا خدا، تمام ذریعہ انسان کا یکساں رب، مالک اور الہ ہے۔

(قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ، إِلَهِ النَّاسِ) (۱۱۳/۱-۳)

اس خدا کی کتاب بَصَائِرُ لِلنَّاسِ (۴۵/۲۰) تمام نوع انسان کے لئے مجموعہ بصائر و حکم۔ اس کا رسول، تمام نوع انسان کے لئے یکساں رسول۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا۔ (۴/۱۵۸)

ان سے کہہ دو کہ اے تمام دنیا کے انسانو! تم سب کی طرف میں خدا کا رسول ہوں۔

اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ کہ دنیا میں ثبات و دوام صرف اسی نظریہ یا عمل کو حاصل ہو سکتا ہے جو بلا تفریق رنگ، نسل، زبان، وطن، مذہب، قومیت، تمام نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہے۔

وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ سَ فِيمَا كُنْتُ فِي الْأَنْبِيَاءِ (۱۳/۱۷)

زمین میں باقی وہی رہتا ہے جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، مغربی تصورات حیات نے بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کا اصول دیا، یعنی باقی وہی رہ سکتا ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہو۔ قرآن نے اس کی بجائے ”بقائے النفع“ کا اصول دیا، یعنی باقی وہی رہ سکتا ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہو۔ آپ نے غور کیا کہ اس ایک تصور حیات کے بدل جانے سے انسانی زندگی کے تمام گوشے کس طرح بدل جاتے ہیں اور اس سے دنیائے انسانیت میں کس قدر حیات افزا و رحمن افزا تبدیلی آجاتی ہے؟ یہی وہ تصور حیات ہے جس سے انسان کی سمجھ میں یہ بات آ سکتی ہے کہ میں دوسروں کی بہتری کے لئے کیوں کوشش کروں؟ حیات دوام حاصل کرنا ہر انسان کی دلی خواہش ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی انسان مرنا نہیں چاہتا۔ وہ ہمیشہ زمرہ رہنا چاہتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایسے کام کرو جو عالم انسانیت کے لئے زیادہ سے زیادہ منفعت بخش ہوں۔ دوسرے کی ضرورت شدید ہو تو اسے اپنے آپ پر ترجیح دو۔

(يُوعِظُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَتُذَكَّرُ أَنْ يَكُونَ لَهُمْ خَصَامَةٌ) (۵۹/۹) (مومن وہ ہیں جو

خود تنگی میں رہتے ہیں اور دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں)

اور یہ سب کچھ بغیر ذاتی غرض کے کرو۔ وہ کہتا ہے کہ مومن جب دوسروں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں تو ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیتے ہیں کہ لَا تُزِيدُوا مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا تُكْفُرُوا (۴۲/۹) ہم تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ تم سے شکریہ تک بھی نہیں چاہتے۔

سوچئے کہ اس تصور حیات کی رو سے اخلاقی اقدار کس طرح زندگی کا معمول بن جاتی ہیں۔

انسانی مساوات کے تصور کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ جاتا ہے، جس میں کسی انسان کا کسی دوسرے انسان کا غلام ہونا تو ایک طرف، کوئی کسی کا محکوم نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی کا محتاج۔ اس سے ایک ایسا نظام قائم ہوتا ہے، جس میں تمام افراد، قوانین خداوندی کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زندگی کے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرتے ہیں۔ (وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ) (۲۲/۳۸) یہ نظام ہر فرد کو اس کی ضمانت (گارنٹی) دیتا ہے کہ **نَحْنُ نَزَّلْنَا قُكُكُ قَايَا هُمْ** (۶/۱۵۲) کہ ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔ کہتے ہیں: اس نظام میں کسی کو جھوٹ بولنے یا چوری اور بددیوانی کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے؟ اس میں

قرآنی نظام

اخلاقی اقدار خود بخود بروئے کار آتی چلی جاتی ہیں۔ اس نظام میں نہ کسی کو خدائی اختیارات (DIVINE RIGHTS) حاصل ہوتے ہیں، نہ مذہبی پیشواؤں کا وجود باقی رہتا ہے۔ نہ ملوکیت نظر آ سکتی ہے نہ سرمایہ داری۔ ”دنیا تے مذاہب“ میں اس قسم کا نظام تو ایک طرف، سرے سے نظام کا تصور ہی نہیں ملتا۔

نظام کے تصور سے، قرآن کریم نے ایک اور عظیم حقیقت کا اعلان کیا ہے جو ”دنیا تے مذاہب“ میں بہت بڑا انقلاب ہے۔ اس نے کہا ہے کہ نوع انسانی کی راہ نمائی کے لئے جن غیر متبدل اصولوں کی ضرورت تھی، وہ قرآن میں دے دیئے گئے۔ اور ان کی حفاظت کا بھی انتظام کر دیا گیا۔ ان اصولوں کی روشنی میں، بہر آنے والی نسل، اپنے معاملات، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود حل کرے گی۔

اس لئے اب کسی نبی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لہذا باب نبوت کو بند کر دیا جاتا ہے۔ **ختم نبوت** آپ نے غور کیا کہ ختم نبوت، دنیا تے مذاہب میں کتنے عظیم انقلاب کا اعلان ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اس حقیقت کا بھی اعلان ہے کہ اب ذہن انسانی، اپنے عہد طفولیت سے نکل کر سن شعور میں پہنچ گیا ہے۔ انسان اب بچہ نہیں رہا، بالغ ہو گیا ہے۔ اس لئے اب اسے کسی اکراٹھانے والے کی احتیاج نہیں رہی۔ اسے اب خود اٹھنا اور آگے چلنا ہو گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس سے انسان میں کس قدر خود اعتمادی (SELF CONFIDENCE) پیدا ہوتی ہے اور وہ کس طرح دنیا میں گرون اٹھا کر چلنے کے قابل ہو جاتا ہے!

دنیا کا ہر مذہب، کسی آنے والے کا انتظار کر رہا ہے جو آکر اس مذہب کو دوسرے مذاہب پر غلبہ عطا کرے گا۔ قرآن نے اس تصور کی تردید کر کے کہہ دیا کہ ہم نے جو نظام زندگی تمہیں دیا ہے، اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ یہ دنیا کے تمام نظام ہمارے زندگی پر غالب آجائے۔

هُوَ الَّذِي آمَرَ سَلَّمَ بِالسُّؤْلِ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ
وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (۹/۳۳)

تم اس نظام کو عملاً متشکل کرو۔ یہ انسانوں کے تمام خود ساختہ نظامہائے حیات پر غالب آجائے گا۔ اس کے سامنے کوئی دوسرا نظام ٹھہرا نہیں سکے گا۔

قرآن، اخلاقی اقدار پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اس نظام زندگی کی اقامت کی تاکید کرتا ہے، جس میں اخلاقی اقدار خود بخود غالب آجاتی ہیں۔

۵۔ انسانی زندگی کا منتہی (نجات)

اس کے بعد، آپ اس سوال کی طرف آتے ہیں جو اس بحث میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے، یعنی انسانی زندگی کی تمام تک و تاز کا مقصود و منتہی کیا ہے؟ یہ بڑا اہم اور بنیادی سوال ہے اور اس سے بہت سے متعلقہ گوشے خود بخود واضح ہو جائیں گے۔

دنیا کے تمام مذاہب میں انسانی زندگی کی تمام سعی و کوشش کے منتہی کو ایک لفظ میں بیان کیا جاتا ہے اور وہ لفظ ہے "نجات" — منگتی (SALVATION)۔ نجات سے مفہوم کیا ہے؟ یہ بات اچھی طرح سمجھنے کی ہے۔ یہ واضح ہے کہ جب کوئی شخص کسی مصیبت میں مبتلا ہو اور اسے اس مصیبت سے چھٹکارا مل جائے تو اسے نجات کہتے ہیں، یعنی نجات کے لئے ضروری کہ وہ شخص پہلے کسی مصیبت میں مبتلا ہو۔ مذہب کی دنیا میں انسان کے متعلق

ایسی بنیادی تصور ہے۔ ہندو مت (دھرم، یعنی شریعت) میں عقیدہ یہ ہے کہ ہر

ہندو دھرم میں

ذی حیات (جاندار خواہ وہ کیڑے مکوڑے ہوں یا حیوانات اور انسان) اپنے

سابقہ جنم کے کرموں (اعمال) کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں آتا ہے۔ مثلاً ایک شخص موجودہ جنم میں انسان ہے۔ اس نے بُرے کام کئے تو وہ اگلے جنم میں چوہا بن جائے گا۔ چوہے کو قطعاً معلوم نہیں کہ وہ کس جرم کی پاداش میں چوہا بنا دیا گیا ہے۔ اب اگر وہ چوہا نیک کام کرے گا۔ چوہا نیک کام کرے گا؟ گویا جاؤر بھی نیک کام اور بُرے کام

کرتے ہیں!! — تو وہ آئندہ جنم میں (شاید) پھر انسان بن جائے۔ ہر انسان اس آواگون (TRANSMIGRATION) کے چکر میں پھنسا ہوا ہے۔ اس چکر سے چھٹکارا مل جانے کا نام نجات ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ عقیدہ یا تو ہم پرستی

کی پیداوار ہے اور ان لوگوں کے ذہن رسا کی تخلیق جنہوں نے کسی نہ کسی طرح معاشرہ میں اقتدار حاصل کر لیا اور اس کے بعد چاہا کہ وہ اقتدار انہی کے گھرانوں میں مخصوص رہے۔ دوسرے لوگ اس اقتدار کے حصول کا خیال تک دل میں نہ لائیں۔ براہمن اور کھتری حکمران طبقے تھے اور ویش اور شودر ان کے خدمت گزار۔ ہو سکتا تھا کہ کبھی ویش یا شودروں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتے کہ براہمنوں اور کھتریوں کے بچوں کو کون سے سرخاب کے پرنگے ہیں کہ یہ پیدائش کے ساتھ ہی حکمران بن جائیں اور ہم ان کی غلامی کرتے رہیں۔ اس لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ براہمن کے گھر میں پیدا ہی وہ ہوتا ہے، جس نے پچھلے جنم میں اچھے کام کئے ہوں اور ویش اور شودر کے ہاں وہی پیدا ہوتا ہے، جس نے سابقہ جنم میں بُرے کام کئے ہوں۔ لہذا یہ تقسیم اعمال کے نتائج کے اعتبار سے عمل میں آتی ہے۔ یوں ہی دھاندلی سے پیدا نہیں کر دی گئی۔ انہیں اس زندگی میں بہر حال ویش اور شودر رہنا ہو گا۔ البتہ اگر وہ اچھے کام کریں گے (یعنی اُتم جاتی کے لوگوں کی خدمت کرتے رہیں گے) تو اگلے جنم میں براہمن اور کھتری بن جائیں گے۔ اس عقیدے کی رُو سے محکوم طبقات کو مطمئن کر دیا گیا کہ یہ سب ان کے اپنے کئے کا پھل ہے۔ ان پر ظلم نہیں ہو رہا، نہ ہی وہ اس جنم میں اس تقسیم کو بدل سکتے ہیں۔

اس عقیدے کا جذبہ محرکہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اس کا نتیجہ جس قدر انسانیت سوز ہے، وہ ظاہر ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اس سے انسان مجبور محض ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ جو کچھ جی میں آئے کر لے، اپنی موجودہ پوزیشن میں تبدیلی کر ہی نہیں سکتا اور معاشرہ ایسے مستقل طبقات میں تقسیم ہو جاتا ہے، جنہیں سٹایا ہی نہیں جاسکتا۔ پھر یہ کہ اس تمام تگ و تاز سے بالآخر مقصد کیا ہے؟ یہ کہ انسان آواگون کے اس چکر سے نجات حاصل کر لے۔ انسانی تخلیق اور نظام کائنات کا یہ مقصد کس قدر بے معنی ہے؟

ویدانت کی رُو سے

ہندو ویدانت (طریقہ یا تصوف) کی رُو سے، انسان کی روح (آتما) خدا (پرماتما) کی رُو کا حصہ ہے جو اپنی اصل سے جدا ہو کر، مادی دلدل میں

پھنس چکی ہے اور یہاں سے نکلنے کے لئے مصروفِ آہ و فغاں ہے۔ مولانا روم کے الفاظ میں، جو اسی ویدانتی عقیدہ کی صدائے بازگشت ہے۔

بشنواز نے چو حکایت ی کند

از جدائی و شکایت می کند

انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ یہ روح، مادی دلدل سے نجات حاصل کر کے، اپنی اصل سے جا ملے یعنی غالب

کے الفاظ میں — عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — ترکِ دنیا، دنیا، سیاست اس کا طریقہ ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس عقیدہ کی رُو سے، انسانی تنگ و تاز کا حاصل کیا ہے؟ فنا، مکمل فنا (COMPLETE ANNIHILATION) یعنی خدا نے انسانی روح کو اپنے سے الگ کر کے، اسے مادی دلدل میں پھنسا دیا اور اس سے کہہ دیا کہ اب تم شقیں اٹھاؤ اور مصیبتیں جھیلو تاکہ تم اس دلدل سے نجات حاصل کر سکو۔ آپ سوچئے کہ اس عقیدہ کی رُو سے خود خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے اور اخلاقی اقدار کی پابندی کے لئے جذبہ محرکہ کیا بنتا ہے؟

یہودیت میں | یہودیت میں بھی انسانی زندگی کا منتہی "نجات" ہے لیکن وہاں نجات کا تصور کچھ مختلف ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہودیوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل خدا کی چھٹی اولاد ہیں، اس لئے وہی جنت کے واحد وارث ہیں جو انسان بنی اسرائیل کے گھر میں پیدا نہیں ہوا، وہ جنت میں نہیں جاسکتا۔ اس زمانے میں بنی اسرائیل ہی میں نفع کا رواج تھا۔ اس لئے ان کا عقیدہ تھا کہ مختون سب جنت میں جائیں گے اور غیر مختون جہنم میں۔ چنانچہ تلمود میں ہے،

آخرت میں حضرت ابراہیمؑ جہنم کے دروازے پر بیٹھے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اب رہے ایسے اسرائیلی جنہوں نے سخت گناہ کے کام کئے تھے، سوان کے لئے وہ ایک کام کریں گے۔ وہ ان بچوں کی فتنہ کی کھاں اُتار کر جو فتنہ سے پہلے وفات پا چکے تھے، اس قسم اسرائیلیوں کے فتنے کے مقام پر چپکا دیں گے اور اس طرح انہیں نامختون بنا کر چند دنوں کے لئے جہنم میں بھیج دیں گے۔

(تلمود ص ۲۴، بحوالہ برقی طور صفحہ ۱۵۰) ایڈیشن ۱۸۵۷ء

لیکن ان کا جہنم میں داخلہ محض رسم (FORMALITY) پوری کرنے کے لئے ہوگا۔ جہنم کی آگ ان پر کچھ اثر نہیں کرے گی۔ (ایضاً ص ۲۴) اس کی وجہ جیوتش انسائیکلو پیڈیا میں یہ لکھی ہے کہ اسرائیلی گناہگاروں کو جہنم کی آگ چھو نہیں سکے گی۔ اس لئے کہ وہ جہنم کے دروازے پر گناہوں کا اقرار کر لیں گے اور اس طرح خدا کی طرف لوٹ آئیں گے۔ (جلد پنجم صفحہ ۵۸۳)

آخری نجات ہی نہیں بلکہ اس دنیا میں عزت و سرفرازی کے لئے بھی یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ بعض کو عزت ان کے آباؤ اجداد کے اعمالِ حسنہ کی بدولت ملتی ہے اور بعض کو ان کی آنے والی نسلوں کے اعمال کے مستحق ہیں۔ (جیوتش انسائیکلو پیڈیا، جلد ششم، صفحہ ۶۰)

انسائیکلو پیڈیا بڑا نیکام میں ہے کہ

یہودیوں کی امیدوں کا مرکز ان کے آبا و اجداد کے اعمال ہوتے تھے۔ بالخصوص یہ عقیدہ کہ (حضرت) ابراہیمؑ ہمارے جدِ امجد ہیں۔

اسی طرح انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایٹھکس میں مذکور ہے کہ

یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق ان کے تمام بزرگوں کے اعمال ایک جگہ اکٹھے کر لئے جائیں گے اور انہیں پھر تمام بنی اسرائیل پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے حصے میں نجات و سعادت آجائے گی۔ (جلد ۱۱۔ صفحہ ۱۱۴۴)

آپ نے غور فرمایا کہ ان عقائد کی موجودگی میں اخلاقی اقدار کی پابندی کا کوئی سوال بھی پیدا ہوتا ہے؟

عیسائیوں میں عیسائیت میں عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اقلین ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہوں کا بوجھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ انسان سے ان گناہوں کی آلائش کا دور ہو جانا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کے لئے خدا نے انسانوں پر رحم کھایا اور اپنے اکلوتے بیٹے (یسوع مسیحؑ) کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ صلیب پر جان دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دے۔ جو لوگ حضرت مسیحؑ کے اس کفارہ پر ایمان لائیں گے ان کی نجات ہو جائے گی۔ جو ایمان نہیں لائیں گے، وہ جہنم میں جائیں گے۔ نجات کے لئے اعمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ سینٹ پال، افسیوں کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے۔

تم کو ایمان کے وسیلے ہی سے نجات ملی ہے اور یہ تمہاری طرف سے نہیں، خدا کی بخشش ہے اور نہ اعمال کے سبب ہے۔ (افسیوں ۲/۸-۹)

اور رومیوں کے نام خط میں ہے۔

چنانچہ ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان شریعت کے اعمال کے بغیر ایمان کے سبب سے راستاً ٹھہرتا ہے۔ (۳/۲۸)

گلیتوں کے نام ایک خط میں اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی گئی ہے کہ

جتنے لوگ شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں، وہ سب لعنت کے ماتحت ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جو کوئی ان سب باتوں کے کرنے پر قائم نہیں رہتا جو شریعت کی کتاب میں لکھی ہیں، وہ لعنتی ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راست باز نہیں ٹھہرتا

کیونکہ لکھا ہے کہ راست باز ایمان سے جیتا رہے گا اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا (معاذ اللہ) اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑا دیا۔

(گلکیتون ۱۲-۱۰/۳)

آپ سوچئے کہ اس عقیدہ کے بعد اخلاقی اعمال کی کہیں گنجائش بھی رہتی ہے بلکہ اس کی رو سے جو شخص اعمال پر بھروسہ کرتا ہے، وہ لعنتی قرار پاتا ہے۔ عیسائیت کے اس عقیدہ کی رو سے 'انسان جس مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے، وہ اس کے اپنے کسی جرم کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کے اولین ماں باپ کے گناہوں کی پاداش ہے، جس میں یہ بے چارہ مفت میں مانخو کر دیا گیا ہے اور پھر اس مصیبت سے چھٹکارا، کسی حُر عمل کے نتیجہ میں نہیں ملتا بلکہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان سے ملتا ہے۔ باقی رہا "ازلی گناہ" کے عقیدہ کا باطل ہونا، سو اس کے متعلق اب خود عیسائی دنیا کے ارباب فکر و تحقیق، اعلان پر اعلان کر رہے ہیں کہ یہ عقیدہ باطل ہے۔ مثلاً (R.F. JOHNSON) اپنی کتاب (CONUCIANISM AND MODERN CHINA) میں لکھتا ہے کہ

ازلی گناہ کا عقیدہ درحقیقت "ازلی خرابی" ہے، جس کی وجہ سے ہم ہر قسم خیر سے بیزار اور ہر قسم شر کی طرف مائل رہتے ہیں۔

مسٹر (A.E. TAYLOR) لکھتا ہے۔

یہ عقیدہ ایک بطلان ہے۔ میں کسی ایسے سائنٹفک اور خدا کی طرف دعوت دینے والے مذہب کا استقبال کروں گا جو ہمیں فطرت انسانی پر ایسی مضحکہ انگیز تہمت پر ایمان رکھنے کی ضرورت سے بچالے۔

(MIND - JULY 1912)

یہ سائنٹفک اور خدا کی طرف دعوت دینے والا مذہب "اسلام" ہے، جس نے قرآن کی رو سے اعلان کر دیا کہ کوئی انسان نہ اپنے سابقہ جنم کے گناہوں کا بوجھ لادے دنیا میں آتا

ہے اور اپنے اولین ماں باپ کی لغزشوں کی آلاتش سے مٹوٹ ہوتا ہے۔ دنیا میں ہر انسانی بچہ "سادہ لوح" (CLEAN SLATE) لے کر آتا ہے اور جب انکسیرم پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اندر حیوانی سطح کی طبعی زندگی سے بلند و بالا زندگی بسر

کرنے کی صلاحیتیں بطور امکانات (REALISABLE POSSIBILITIES) رکھ دی گئی ہیں۔ ان صلاحیتوں

(POTENTIALITIES) کی نشوونما (DEVELOPMENT) انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ اگر انسان صرف اپنی

طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کی صلاحیتوں کو نشوونما دیتا ہے تو اسے طبعی دنیا میں آسائشیں اور قوتیں

حاصل ہو جاتی ہیں لیکن اسے انسانی سطح کی وہ بلند زندگی نصیب نہیں ہوتی، جسے قرآن جنتی زندگی سے تعبیر کرتا ہے۔
 مَنْ كَانَ يُؤِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ. ثُمَّ جَعَلْنَا
 لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَذْحُومًا (۱۷/۸۱) جو صرف دنیاوی زندگی کا مفادِ عاجلہ چاہتا ہے
 اسے ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق 'جسے ہم نے اپنے ارادے سے بنایا ہے' بہ عجلت دے دیتے ہیں۔
 لیکن اس کی (انسانی) زندگی جہنم کی زندگی ہوتی ہے، جسے وہ ذلت و خواری میں بسر کرتا ہے لیکن جو شخص طبعی زندگی
 کے ساتھ اپنی انسانی زندگی کی بھی نشوونما کرتا ہے، اسے طبعی مفاد بھی حاصل ہوتے ہیں اور اس کی ذات میں بھی
 بالیدگی اور ارتقاء ہوتا چلا جاتا ہے۔

وَمَنْ أَسْرَدَ الْآخِرَةَ دَسَعَىٰ لَهَا سَعِيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ
 تَمَشُّكًا وَخُلًّا (۱۷/۱۹) اور جو مستقبل کی خوشگواریاں چاہتا ہے اور اس کے لئے ایسی کوشش کرتا ہے
 جیسی کرنی چاہیے اور وہ خدا کی متعین کردہ بلنداقدار کی صداقتوں پر ایمان رکھتا ہے، تو اس کی کوششیں بھرپور نتائج
 کی حامل ہو جاتی ہیں۔

كُلًّا نُّنَمِّدُهُمْ هَؤُلَاءِ وَهُؤُلَاءِ مِنْ عَطَايِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاؤُ رَبِّكَ
 مَحْظُورًا (۱۷/۲۰) ہم اس گروہ کو بھی اپنے قانونِ مشیت کے مطابق بڑھاتے رہتے ہیں اور اس گروہ
 کو بھی اور ان کی سعی و عمل کے حساب سے انہیں اپنی بخشائشوں سے نوازتے ہیں۔ یاد رکھو! ہم نے اپنی ان نعمتوں
 پر بند نہیں لگا رکھے کہ کسی قوم کو اس سے آگے نہ بڑھنے دیں اور کسی سے رعایت برت کر اس کے لئے یوں ہی دروازہ
 کھول دیں!

ہرمت ایں میکہ و دعوتِ عام است ایجا
 قسمتِ بادہ باندازہ جام است ایجا

قرآنِ کریم میں اس مضمون کی بے شمار آیات ہیں کہ ایمان و اعمالِ صالح کا فطری نتیجہ، اس دنیا کی خوشگواریاں اور
 سرفرازیاں اور حیاتِ آخرت کی سربلندیاں اور شادابیاں ہیں۔ جو لوگ زندگی کو اسی دنیا تک محدود سمجھتے ہیں،
 انہیں اس دنیا میں آسائشیں حاصل ہو سکتی ہیں لیکن آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ یہ آیات میری کتاب "نظام
 ربوبیت" میں بہ تفصیل ملیں گی۔ اس مقام پر انہیں درج نہیں کیا جاتا۔

انسانی ذات کی یہ نشوونما اس نظام کے اندر ہو سکتی ہے جو مستقل اقدار کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ یہ نشوونما، اعمال کے فطری نتائج کا نام ہے۔ نیک اعمال وہ جس سے انسانی ذات کو استحکام و بالیدگی ملتی ہے، بُرے وہ جن سے اسے ضعف پہنچتا ہے۔ ہر عمل کا نتیجہ، ساتھ کے ساتھ انسانی ذات پر مرتب ہوتا رہتا ہے۔ یہی اس کا اعمال نامہ ہے جو قرآن کے الفاظ میں اس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے اور جو ظہور نتائج کے وقت کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ جو انسانی ذات ایک خاص معیار کے مطابق نشوونما پالے گی، وہ زندگی کے اگلے ارتقائی مرحلے طے کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ اسے جنتِ اخروی کی زندگی کہتے ہیں جو اس معیار پر پوری نہیں اترے گی، اس کی نشوونما رک جائے گی۔ یہ جہنم کی زندگی ہے۔ اسی کو قرآن نے پلڑے کے بھاری اور ہلکا ہونے سے تعبیر کیا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاٰ ضِيَاةً - وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُمَّةٌ هَاؤُمِةٌ - (۹۰/۶-۱۰۱)

سو جس کا پلڑا بھاری ہوگا وہ مستروں کا جھولا جھولے گا اور جس کا پلڑا ہلکا ہوگا، وہ تباہی کے گڑھے میں جا گرے گا۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کی رو سے مقصدِ زندگی کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں بلکہ اپنی مضمحل حیثیتوں کی مناسب نشوونما سے، ایک بلند مقام حاصل کرنا اور موجودہ زندگی سے اعلیٰ و ارفع سطحِ زندگی پر پہنچ جانا ہے۔ آگے قرآن نے فوز اور فلاح کی اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے، یعنی (ACHIEVEMENT) اور (SUCCESS) نہ کہ نجات (SALVATION) اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ اس تصور کے ماتحت اس سوال کا جواب کس حسن و خوبی سے مل جاتا ہے کہ میں اخلاقی اقدار کی پابندی کیوں کروں۔ اس سے میرا کیا فائدہ اور ایسا نہ کرنے سے کیا نقصان۔ یہی وہ طریق ہے، جس سے انسان ان اقدار کی پابندی علی وجہ البصیرت (RATIONALLY) کرتا اور قلب و دماغ کے پورے اطمینان سے ان پر کاربند رہتا ہے۔

تصویرِ نجات بالاسے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآنِ کریم چند اخلاقی اقدار ہی نہیں دیتا بلکہ زندگی کا ایک ہمہ گیر نظام عطا کرتا ہے جو خدا، انسان، کائنات، قانونِ مکافات اور مقصدِ مآلِ زندگی کے بنیادی تصورات پر استوار ہوتا ہے۔ اس پورے نظام کا نام الدین ہے اور اس کی عملی شکل کو الاسلام

کہا گیا ہے۔ اخلاقی اقدار اسی نظام کے اندر نتیجہ خیز ہوتی ہیں اور علی وجہ البصیرت ممکن العمل بھی۔ اس نظام کے سوا کوئی دوسرا نظام ایسا نہیں، جس میں یہ مقاصد حاصل ہو سکیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (۳/۸۱)

یہ حقیقت ہے کہ الدین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

اس لئے

مَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۳/۸۴)

جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور نظام زندگی اختیار کرنا چاہے گا تو اس سے اس نظام کو قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ دیکھ لے گا کہ آخر الامر وہ کس قدر نقصان میں رہتا ہے۔

نظام کے تصور سے یہ حقیقت بھی سامنے آ جاتی ہے کہ اس سے بالکلیہ اختیار کیا جائے گا۔

ہیں، جب اس نظام کو بالکلیہ اختیار کیا جائے۔ نظام کی مثال، طبیب کے نسخے کی سی ہوتی ہے۔ نسخے کا فائدہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جب آپ اسے پورے کئے پورا، متعلقہ ہدایات کے مطابق استعمال کریں۔ اگر آپ اس نسخہ میں سے ایک دو دو ایسا لے کر انہیں استعمال کرنا شروع کر دیں تو وہ آپ کو کچھ فائدہ نہیں دیں گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ نقصان ہی دے دیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ

أَفَتَوْفُّونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۖ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ
ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَكَوْنٌ آخِرٌ ۚ
إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵)

”کیا تم اس ضابطہ قوانین کے ایک حصہ کو ماننا چاہتے ہو اور ایک حصے سے انکار کرنا چاہتے ہو۔ جو شخص تم میں سے ایسا کرے گا، اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ اس کے لئے اس دنیا کی زندگی میں ذلت و رسوائی ہو اور وہ قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں۔“

اس نسخہ کے اجزائے ترکیبی، وہ تمام صفات خداوندی ہیں، جنہیں قرآن الاسماء الحسنیٰ کہہ کر پکارتا ہے۔ ان میں سے بعض اجزاء کو لے لینا اور دوسرے اجزاء کو چھوڑ دینا کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھیے حقیقت (REALITY)

ایک ناقابل تقسیم وحدت (INVISIBLE WHOLE) ہے، جس کے حصے بخرے نہیں کئے جاسکتے۔ جبکہ اسامع الحسنی حقیقتِ مطلق کے مختلف پہلو (FACETS) ہیں۔ حقیقت ان تمام کے مجموعے کا نام ہے۔ ان میں سے بعض کو الگ کر لیا جائے تو وہ اس حقیقت کے اجزاء نہیں قرار پاسکتے۔ مثلاً اگر حقیقت کے سو گوشے ہیں اور ان سے آپ دس گوشے الگ کر لیتے ہیں تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے حقیقت کے ۱۰/۱۰۰ حصہ کو اختیار کر لیا ہے۔ اس لئے آپ کو اسی تناسب سے وہ فائدہ ہو جائے گا جو پوری حقیقت کے اختیار کرنے سے ہوتا۔ آپ نسخے کی دس دوائیوں میں سے ایک دوائی کھا کر دسواں حصہ شفا حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ

وَاللّٰهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْهُ بِهَا۔ وَذُرِّدُوا الَّذِیْنَ یُلٰجِدُوْنَ فِیْ اَسْمَائِہِ (۱۸)

”اور اللہ کے لئے الہ اسماء الحسنیٰ ہیں“ (وہ اس حقیقت کئی کے مختلف گوشے ہیں) سوائے ان تمام گوشوں کے ساتھ پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ان اسماء (صفات) میں سے (بعض کو لے کر) ایک طرف نکل جاتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ جو لوگ اسلامی نظامِ زندگی سے الگ رہتے ہیں، ان کے ہاں جن اخلاقی اقدار پر عام طور پر زور دیا جاتا ہے، وہ وہی ہوتی ہیں، جن کا تعلق انسان کے نرم و نازک جذبات سے ہوتا ہے۔ ہمدردی، رحم، عفو، درگزر، منکسر المزاجی، نرم خوئی، کوئی دس گالیاں بھی دے جائے تو خاموش رہو۔ جو ایک گال پر ٹھانچہ مارے، اس کے سامنے دوسرا گال بھی کر دو۔ جو تمہارا کوٹ اٹار لے، اسے صدری اٹار کر خود دے دو۔ دشمن سے بھی پیار کرو۔ یا ذرا آگے بڑھو تو چڑیوں، کوؤں کو دانہ ڈالو۔ مویشیوں کے لئے پیاد بنا دو وغیرہ وغیرہ۔ عدل، ظلم کی روک تھام، سلب و ذہب (EXPLOITATION) کا انسداد، عالمگیر انسانیت کے حقوق کا تحفظ، ایسا سیاسی نظام جس میں کوئی کسی کا محکوم نہ ہو، ایسا معاشرتی نظم و نسق جس کی بنیاد احترامِ آدمیت پر ہو، ایسا معاشی دستور جس میں کوئی کسی کا محتاج نہ ہو اور ہر ایک کی ضروریات زندگی بلا مشقت و ذلت پوری ہوتی رہیں۔ ایسا عمرانی آئین جس کی رو سے ہر عمل اپنا صحیح صحیح نتیجہ پیدا کرتا چلا جاتے، ان باتوں کی ان کے ہاں کوئی اخلاقی اہمیت نہیں ہوگی۔

عیسائیت کی تعلیم کا نتیجہ | عیسائیت جو مذکورہ بالا قسم کی اخلاقی اقدار کی سب سے بڑی علمبردار ہے، اس کے متعلق جہپانیہ کے نامور پروفیسر (DR. FALTA DECRACIA)

کے الفاظ میں سنتے، جنہیں برفو (BRIFAULT) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) میں نقل کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے، جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے

تصورِ اخلاق سے یکسر باہر کی شے ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت و ہمدردی کا اظہار کیا ہے جن پر ظلم و ستم ہوں لیکن خود ظلم و ستم سے ہمیشہ تسامح کرتا ہے۔ اس نے ان لوگوں کو جو ظلم و استبداد کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہوں، جنہیں مصائب و شدائد کے ہجوم نے گھیر رکھا ہو، دعوت دی ہے اور انہیں آئینِ محبت کی تعلیم دی ہے۔ انہیں رحم و عفو کا سبق سکھایا ہے۔ انہیں خدا کی ربوبیت کی یاد دلاتی ہے لیکن مذہب و اخلاق کے اس طوفان میں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اخلاقی ضوابط کی معراجِ کبریٰ ہے، عام انصاف اور عام دیانت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ مسیح مقدس جو رواستبداد کے ستارے ہوئے مظلوم انسانوں کے درمیان آسمان سے اترتا ہوا فرشتہ دکھائی دیتا ہے جو ان کی طرف فارقلیط کا پیغامِ رحمت و شفقت پہنچاتا ہے لیکن اس جو رواستبداد کی غلت معلوم کرنا اس کے دائرہ شعور سے باہر ہے۔ خیر و شر کا صحیح تصور اس کے حیطہ نگاہ سے خارج ہے۔ یہ ظلم و ستم اس کے نزدیک خدا کی طرف سے گناہگاروں کے لئے ابتلاء و آزمائش ہے، نظامِ عالم کا خاصہ ہے، اس حکومت کا فیصلہ ہے جو دنیا میں خدائی حقوق کی بناء پر قائم ہے۔ سینٹ و سنٹ فرانس کے اس قید خانہ کا معائنہ کرتا ہے جو دنیا میں جیتا جاگتا جہنم ہے۔ وہ وہاں محبت کا پیام عام کرتا ہے اور گناہ گاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے لیکن وہ ظلم و استبداد جس پر اس جہنم کا قیام ہے، اس کا اسے احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ ظالموں کے پیچھے ظلم و استبداد میں جھکوی ہوئی انسانیت کی چیخیں نکلتی رہیں۔ انسانوں کی زندگیوں اور قلوب و اذہان غلامی کی زنجیروں میں بندھے رہیں۔ ان کی ہڈیاں چٹختی رہیں، وہ مٹ جائیں، فنا ہو جائیں، عیسائیت کی روح انہیں جا کر تسلی دے گی لیکن یہ اس کے حیطہ تصور میں بھی نہیں آئے گا کہ اس ظلم و ستم کو کس طرح مٹایا جائے جس کی وجہ سے انسانیت ان مصائب کا شکار ہو رہی ہے۔ ان چیزوں کا اسے احساس ہی نہ ہوگا۔ ان مظالم کے استیصال اور ان سے انسانوں کی نجات کی ذمہ داری کی طرف سے یہ بالکل آنکھ بند کتے رہے گی۔ عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح یکسر بے حس ہے۔ یہ تصور اس کے نزدیک ایسا ہی اجلی ہے، عیسائیت کا تصور۔ وہ ہمیشہ عفو، برداشت، رحم دلی کا سبق پڑھاتی رہی لیکن عدل و انصاف کی اسے کبھی یاد تک نہ آئی۔ زندگی اور اس کی تمام خود داریوں کا ترک — مدیہ آزد و عدم مدافعت

خاموش اطاعت، ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا سامنے کر دینا، غرضیکہ اس قسم متشدد (غیر فطری) مضابطہ اخلاق کا طوفان، عیسائیت کے شعور کو مشتعل کر سکتا تھا لیکن ظلم و استبداد اور جوڑ

ستم کے کسی منظر سے وہ متاثر نہیں ہو سکتی تھی۔ (THE MAKING OF HUMANITY) (P.P 332-333)

لامذہبوں کی حالت | یہ تو رہی مذہب پرست طبقہ کی اخلاقی اقدار کی کیفیت۔ اب ان لوگوں کو لیجئے جو خدا کو مانتے ہیں، نہ انسانی دات کی بقا کو۔ نہ وحی کے قائل

ہیں نہ حیاتِ آخرت کے اور اس کے باوجود اخلاقی اقدار کی تلقین کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی سے پوچھئے کہ آپ جو کہتے ہیں کہ (مثلاً) غریب کی مدد کرنی چاہیے تو مجھے سمجھائیے کہ میں غریب کی مدد کیوں کروں؟ آپ دیکھیں گے کہ ان کی طرف سے اس کے عجیب و غریب قسم جوابات ملیں گے۔ کوئی کہے گا کہ یہ انسانی فریضہ ہے کہ ہم غریب کی مدد کریں۔ ان سے پوچھئے کہ صاحب! انسانی فریضہ کا مطلب کیا ہے؟ اور وہ کون ہے جس نے مجھ پر یہ فریضہ عائد کر رکھا ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ اس کا ان کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہوگا۔ کوئی کہے گا کہ ہمیں غریب کی مدد اس لئے کرنی چاہیے کہ اگر ہم کل کو غریب ہو گئے، تو دوسرا ہماری بھی مدد کرے۔ اول تو یہ معاوضہ (RECIPROCITY)

کا جذبہ اس قدر پست ہے کہ اسے آپ کبھی بھی بلندی کردار سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ پھر اسے بھی ذہن میں رکھتے کہ جو لوگ اس کا انتظام کر لیں کہ انھیں کسی کی مدد کی کبھی ضرورت نہ پڑے، انھیں آپ غریبوں کی مدد کے لئے کس طرح آمادہ کر سکیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی اپیل یکسر جذبات سے ہوگی۔ دلیل و برہان کی رو سے وہ کوئی معقول جواب نہیں دے سکیں گے اور یا ذرا گہرائی میں جا کر دیکھتے تو ان کے تحت الشعور میں یہ جذبات کروٹیں لے رہے ہوں گے کہ ان باتوں کو معاشرہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس لئے معاشرہ میں عزت حاصل کرنے کے لئے یہ کچھ کرنا چاہتے اور یا اس کے پیچھے سیاسی محرکات کار فرما ہوں گے جیسے مشنریوں کے ہسپتال، اسکول اور کالج، یا مہاتما گاندھی (ابنہائی) کی اہمسا، یا یہ نتیجہ ہوگا روایتی اور درانتی عقائد کا اور یا انسان کے کمزور اعصاب کا جن کا نام نیک جذبات رکھ لیا جاتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی انسانی کردار کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ باقی رہا نیشنل کیریئر، سوا اس کے متعلق شروع میں عرض کیا جا چکا ہے۔ جذبات کے زور پر آپ کسی سے ہنگامی طور پر تو کوئی اچھا کام کر سکتے ہیں لیکن اس اچھے کام کو اس کی زندگی کا معمول نہیں بنا سکتے۔ اس میں ثبات و دوام نہیں پیدا کر سکتے اور کیریئر کہتے ہی اس ہنج زندگی اور اسلوبِ حیات کو ہیں، جس میں ثبات و دوام ہو۔ اس ثبات و دوام کا ضامن، صحیح تصدیق حیات پر ایمان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن ان لوگوں کو بھی جو کسی نہ کسی مذہب کے پیرو میں اور انھیں بھی جو کسی مذہب کو

نہیں مانتے، زندگی کے ان تصورات پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے جو اس نظام کی اصل و بنیاد میں۔ وہ ان کے متعلق کہتا ہے کہ

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا وَابْتَغُوا فَايَافَهُمْ فِي

مِثْقَاقِ (۲/۱۳۷)

اگر یہ لوگ ان تصورات پر اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لاتے ہو تو پھر یہ زندگی کی صحیح شاہراہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ ایسا نہ کریں تو پھر سمجھ لو کہ یہ صداقت و حقیقت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس شاہ راہ پر چل نہیں رہے۔

یہ میں برادرانِ عزیز اسلام کی وہ خصوصیات جو نہ عالم مذاہب میں کہیں مل سکتی ہیں اور نہ ہی دنیائے فکر میں۔ اس لئے دین الحق اس کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

مسلمانوں کو انتباہ | اس مقام پر میں ایک انتباہ ضروری سمجھتا ہوں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم یہ کہہ کر کہ ہمارا دین تمام مذاہب سے افضل ہے، خوش ہو کر بیٹھ جلتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے ہم بھی دنیا میں سب سے افضل قرار پاتے ہیں اور اگر دنیا میں ہماری حالت اچھی نہیں تو اس کی چنداں پروا نہیں اس لئے کہ دنیا چند روزہ ہے اسکے بعد آخرت میں جنت کے وارث ہیں ہونگے باقی سب جہنم میں جائیں گے۔

یہ بہت بڑی خود فریبی ہے جس میں ہم مبتلا ہیں۔ (قرآن میں بتا رہا ہے کہ یہی کچھ یہودی بھی کہا کرتے تھے۔ اس سے ان کی جو حالت ہوئی، وہ دنیا پر روشن ہے) اسلام کا افضل ہونا ہمیں اس صورت میں فائدہ دے سکتا ہے کہ ہم اس کے مطابق عمل کر کے خود افضل بن کر دکھائیں۔ خود ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنا اور اسلام کی افضلیت پر ناز کرتے رہنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص دنیا بھر میں ڈھول پیٹتا پھرے کہ ہمارے ہاں ایک خاندانی نسخہ ہے جو اکیس حیات ہے اور تمام بیماریوں کا مجرب علاج، اور خود اپنے سر درد کے لئے بھی دوسرے سے دوائی مانگتا پھرے۔ کہتے کہ ایسے شخص کو وہ نسخہ کیاف ہڈ

عمل سے زندگی بنتی ہے | دے سکتا ہے اور اس کا اس پر فخر کرنا اس کے کس کام آ سکتا ہے؟

اس سے تو اس کی الٹی جگ ہنسائی ہوگی اور کوئی شخص اس کے دعوے کو صحیح تسلیم نہیں کرے گا۔ نسخے کے مجرب ہونے کا اولیں اور بنیادی ثبوت خود اس خاندان کی اپنی صحت ہوگی۔ اسلام نے اپنی صداقت اور فوقیت کا یہی ثبوت

پیش کیا تھا جب نبی اکرمؐ نے اس دین کے مخالفین سے کہا تھا کہ
 يَقُومِ اَعْلَوْ اَعْلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ
 لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِیْ۔ اِنَّهُ لَا یُفْلِحُ الظَّالِمُوْنَ۔ (۶/۱۳۶)

تم اپنے نظام کے مطابق کام کرتے جاؤ، میں اپنے نظام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ اس گھر کی کامیابی آخر اللہ کس کے حصہ میں آتی ہے۔ اس طرح میرا یہ دعویٰ سچ بن کر سامنے آجائے گا کہ ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی اور ایسا کہنے والے نے سب سے پہلے خود اپنے آپ کو اپنے دعوے کی صداقت میں بطور شہادت پیش کر دیا۔ جب حضورؐ کے مخالفین نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں، تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ

فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا قَبْلَیْهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (۱۰/۱۶)
 میں نے اس سے پہلے تمہارے اندر اپنی عمر بسر کر لی ہے۔ کیا تم اس سے نہیں سمجھ سکتے کہ ایسی زندگی سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی؟

یاد رکھتے! عزیزانِ سن! دنیا میں اسلام کو بطور ایک سچے دین کے وہی شخص پیش کر سکتا ہے جو دوستوں کی محفل میں ہمیں بلکہ دشمنوں کے بھرے مجمع میں اپنی زندگی کو اپنی صداقت کی شہادت میں پیش کر سکے اور پھر اس کے خلاف کسی کو انگلی اٹھانے کی جرأت نہ ہو۔ یہی اسلام کی تبلیغ کا صحیح طریقہ ہے۔

اب آخر میں، میں دو ایک ایسے شکوک کا ازالہ ضروری
مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ سمجھتا ہوں جو اس ضمن میں اکثر دلوں میں پیدا ہوتے

ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ قرآن کریم دیگر اہل مذاہب سے کہتا ہے کہ میں مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ہوں یعنی جو تعلیم تمہارے پاس ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ سو جب قرآن کریم خود ان مذاہب کی تعلیم کو سچا تسلیم کرتا ہے تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ خدا کی طرف سے سچی تعلیم صرف قرآن کریم کے اندر ہے، دیگر اہل مذاہب کے پاس نہیں۔

اعتراض واقعی فزنی ہے اور اس کا جواب نہایت ضروری۔ سب سے پہلے آپ یہ دیکھ لیجئے کہ کیا یہ مطالبہ کہ دیگر اہل مذاہب اس پر ایمان لائیں، قرآن کریم کا مطالبہ ہے یا یہ مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے؟ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ۔ والے ٹکڑے کی پوری آیت یوں ہے۔ یہود سے کہا جاتا تھا کہ

وَاٰمَنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ

كَافِرِيْهِ (۲/۲۱)

تم اس کتاب پر ایمان لاؤ جو میں نے (اب) نازل کی ہے (یعنی قرآن پر) جو مصدق ہے اس کا جو تمہارے پاس ہے اور سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بنو۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن خود اہل مذاہب سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں۔

دوسرے یہ کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ تصریح موجود ہے کہ ان اہل مذاہب نے اپنی اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کر دی تھی۔ لفظی تحریف بھی (۴/۴۶) اور معنوی بھی (۲/۷۵)۔ اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کر دیتے تھے (۲/۷۹) اور حق کو باطل کے ساتھ مخلوط بھی کر دیتا تھا (۳/۷۰) اس طرح ان کتابوں میں بے شمار اختلافات پیدا ہو چکے تھے (۱۱/۱۱۰) قرآن کے ان دعاوی کی شہادت خود یہ اہل مذاہب دیتے ہیں۔ چنانچہ کوئی غیر مسلم بھی آج اس کا بہ دلائل دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جس کتاب کو وہ اپنی آسمانی کتاب کہہ کر پیش کرتے ہیں، وہ اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں وہی ہے جو ان کے پیغمبر پر نازل ہوئی تھی۔ اس اجمال کی تفصیل آپ کو میری کتاب ”مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں“ میں ملے گی، جس میں تمام مذاہب عالم کی بیہینہ آسمانی کتابوں کی تاریخ خود ان مذاہب کے متبعین کی تحقیق کے مطابق بیان کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جن کتابوں کو خود ان کے متبعین بھی حقیقی اور غیر تحریف نہیں کہتے، قرآن کریم ان کی صداقت کی شہادت کس طرح دے سکتا ہے۔

ان کتابوں میں اس قدر تحریف و الحاق کے باوجود کچھ اخلاقی اقدار موجود ہیں۔ قرآن کریم اپنی اقدار کی تصدیق کرتا ہے، نہ کہ پوری کی پوری کتابوں کی۔ اصل یہ ہے کہ یہاں مصدق کے معنی تصدیق کرنے والا ہیں۔ اس کے معنی میں سچ کر دکھانے والا۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہارے پاس جو اخلاقی اقدار ہیں، وہ محض نظری حیثیت سے ہیں۔ میں وہ نظام دیتا ہوں جس میں یہ اقدار سچی حقیقتیں بن کر سامنے آجائیں اور یہی میری خصوصیت ہے۔ مثلاً تم بھی یہ کہتے ہو کہ بھوکے کو روٹی کھلانی چاہیے اور میں بھی یہی کہتا ہوں۔ تم اسے محض وعظ و نصیحت کے طور پر کہتے ہو اور لوگوں کو خیرات دینے کی تلقین کرتے ہو۔ اس سے جس طرح لوگوں کی بھوک کا علاج ہوتا ہے، اسے ہر شخص جانتا ہے؛ میں ایک ایسا عملی نظام معیشت عطا کرتا ہوں، جس میں کوئی فرد بھوکا نہیں رہ سکتا۔ اس طرح میں اس اخلاقی قدر کو سچ کر کے دکھا دیتا ہوں۔

اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے عملی نظام کی رو سے، یہ تمام اخلاقی قدریں سچ بن کر سامنے آجاتی ہیں۔

یہ چیز دین میں ممکن ہے، مذہب میں نہیں۔ اس لئے اسلام کو الدین کہا گیا ہے، مذہب نہیں کہا گیا۔ اس کا مقابلہ بھی دنیا کے دوسرے نظام ہائے زندگی سے کرنا چاہیئے، مذہب سے نہیں۔

دوسرا شبہ | دوسرا سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ یہ شمار لوگ ایسے ہیں، جن تک اسلام پہنچا ہی نہیں یا (مثلاً) ایک شخص ہندوؤں کے گھر پیدا ہوتا ہے اور نہایت دیانت داری سے اپنے دھرم کو سچا سمجھ کر اس پر کاربند رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کا کیا قصور ہے کہ ان پر فلاح و فوز کے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ یہ سوال بھی بہت سے قلوب کو طلسم پیچ و تاب بناتے رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا اچھی طرح سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔

اگر نجات و سعادت یا جزا و سزا کا معاملہ محض جذباتی ہوتا تو واقعی یہ بات قابل تسلیم ہوتی کہ جن لوگوں کا کچھ قصور نہیں، انہیں سزا کیوں دی جائے لیکن جب جزا و سزا کا تعلق قانون سے ہو اور فوز و فلاح اعمال کے فطری نتائج کا نام تو اس میں جذبات کا دخل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جس گاؤں میں مدرسہ نہیں، اس کے بچے ان پڑھ رہ جاتیں گے اور جو فوائد پڑھے لکھے لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں، وہ ان سب سے محروم رہیں گے۔ یہ بہت بڑی سزا ہے جو ان بچوں کو مل رہی ہے، حالانکہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ آپ ان سے کتنی ہمدردی کیوں نہ کریں، علم سے بے بہرہ رہنے سے جو کمی ان میں آگئی ہے، آپ کی ہمدردیاں اور رقیق جذبات اس کمی کو دُور نہیں کر سکتے۔ یہاں یہ سوال ہی نہیں کہ اس میں قصور کس کا ہے؟ جو بچہ بیماری کی وجہ سے سال بھر سکول نہ جاسکے، آپ اسے اس بناء پر اگلی جماعت میں نہیں چڑھا دیتے کہ اس میں اس کا کیا قصور ہے! اگلی جماعت میں اسے ہی چڑھایا جائے گا، جس میں اس جماعت میں چلنے کی استعداد پیدا ہو چکی ہوگی۔ قرآن کی رو سے زندگی کے اگلے مراحل میں وہی پہنچ سکے گا، جس میں ان مراحل کے طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہوگی۔

اسی اصول کا ان لوگوں پر بھی اطلاق ہو گا جو نہایت نیک نیتی سے غلط کو صحیح سمجھ کر اس پر کاربند رہتے ہیں۔ جو شخص نہایت نیک نیتی سے سنکھیا کو دوائی سمجھ کر کھالیتا ہے، سنکھیا یہ کہہ کر اپنا مضر اثر نہیں روک لے گا کہ کھانے والے نے اسے نہایت نیک نیتی سے دوائی سمجھ کر کھایا تھا۔ سنکھیا اپنا اثر یکساں کرے گا، خواہ کسی نے اسے دیدہ دانستہ کھایا ہو یا غلطی سے۔ جو قوم آگ اور پانی (اگنی اور اندرا) کو دیوتا سمجھ کر ان کی پرستش کرتی رہے، وہ بھاپ کو اپنے کنٹرول میں لا کر انجن نہیں چلا سکتی۔ ظاہر ہے کہ ایسی قوم ان تمام فوائد سے محروم رہے گی جو بھاپ (STEAM) کی قوت (POWER) سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی یہ محرومی کسی کی طرف سے ملی ہوئی انتقامی سزا نہیں، ان

کی چہالت کا فطری نتیجہ ہے جسے ہمدردی کے کوئی جذبات دُور نہیں کر سکتے۔ یہ اسی صورت میں دُور ہو سکتی ہے کہ وہ قوم قوانینِ خداوندی کی طرف رجوع کرے اور فطرت کی ان قوتوں کو مسخر کر کے ان سے اپنے فائدے کے کام لے۔ قرآن کی رُوسے فلاح و فوز کے لئے یہی قانون مقرر ہے۔ اس میں نہ کسی کی آرزوؤں کا دخل ہے نہ جذبات کا تعلق۔ اس کا واضح اعلان ہے کہ

لَيْسَ بِأَمَانَتِكُمْ وَلَا أَمَانَتِي أَهْلُ الْكِتَابِ - مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزِبْهُ (۱۳۳/۲)

فیصلہ نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہو گا اور نہ ہی اہل کتاب کی آرزوؤں کے مطابق (فیصلہ ہمارے

قانون کے مطابق ہو گا اور وہ قانون یہ ہے کہ) جو بھی غلط کام کرے گا، وہ اس کا نتیجہ بھگتے گا۔

اور قانون کو ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے۔ اگر قانون لوگوں کے جذبات کے تابع چلنے لگے تو سلسلہ کائنات دہم برہم ہو جاتے۔

لَوْ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ (۱۳۴/۱)

اگر حق لوگوں کے خواہشات کے تابع چلنے لگے تو ارض و سموات اور جو کچھ ان کے اندر ہے، سب تہس نہس ہو جائے۔ خدا ہو ہی وہ سکتا ہے جو جذبات سے بلند ہو۔ اسی لئے جو قومیں اپنے جرائم کے نتیجہ میں تباہ و برباد ہوتی ہیں ان کے متعلق وہ کہتا ہے کہ قَدْ مَدَّ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ يَدَیْهِمْ فَسَوَّاهَا - وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا (۱۵-۱۴/۹۱) ان کے رب نے ان پر (قانونِ مکافات کا) (ROAD ROLLER) بھیج دیا، جس نے انہیں زمین کے ساتھ ہموار کر دیا اور ان کے انجام کے خیال سے خدا کے دل میں کوئی خوف اور ڈر پیدا نہ ہوا۔ وہ اس پر قطعاً لرزاں و ترساں نہ ہوا۔ حتیٰ کہ خَسَابَكَّتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ (۲۹/۳۴) نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین۔

لیکن یہ نہ سمجھئے کہ اس کے قانون میں توبہ اور باز آفرینی کی گنجائش ہی نہیں۔ جس سے کوئی ایک جرم سرزد ہو گیا، وہ ہمیشہ کے لئے راندہ درگاہ ہو گیا۔ نہیں۔ اس کے ہاں احساسِ مدامت کے بعد، اصلاح کا ہر وقت موقع ہوتا ہے

قُلْ يُحِبُّ اِيَّي الَّذِيْنَ اَسْرَوْهُمْ اَعْلٰی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ - اِنَّ

اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا - (۵۳/۳۹)

ان سے کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے، تم اللہ کی رحمتوں سے مایوس نہ ہو۔ وہ تمہاری لغزشوں کے مُہتر اثرات سے تمہاری حفاظت کر دے گا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ایسے اچھے کام کرو جن

سے اس نقصان کی تلافی ہو جائے جو غلط روی سے تمہیں پہنچا ہے۔ اس لئے کہ **إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ الْمَئِیَّاتِ** (۱۱/۱۱۴) ناہمواریوں کے مضر اثرات کو حسن کا رانہ زندگی کے اعمال ہی مٹا سکتے ہیں۔

اب رہی آخری بات کہ جن لوگوں تک اسلام کا پیغام نہیں پہنچ سکا تو اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ظاہر ہے

کہ اس کی ذمہ داری ہم پر ہے جو اس کتاب کی دراشت کے مدعی ہیں۔ ہم اگر **ہماری ذمہ داری** اپنے اس فریضہ کی سر انجام دہی میں قاصر رہتے ہیں تو ان لوگوں کی غلط روی کا بار جن تک ہم نے اسلام نہیں پہنچایا، ہماری گردن پر ہے۔ اسی کے لئے تو قرآن نے کہا ہے کہ

لَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَ أَنْقَالَهُمْ مَعَ أَثْقَالِهِمْ (۲۹/۱۳)

وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور ان کے ساتھ دوسرے بوجھ بھی۔

اس وقت اقوامِ عالم، حق و صداقت کا نظام سامنے نہ ہونے کی وجہ سے، جس قدر انسانیت سوز جرائم کی تکب ہو رہی ہیں، ان کے عذاب کا حصہ خود ہماری گردن پر ہے اور یہ چیز ہماری حالت سے عیاں ہے۔ خدا نے ہمیں ”**شهداء علی الناس**“ بنایا تھا۔ یعنی تمام اقوامِ عالم کی نگرانی کا فریضہ ہمیں سونپا تھا۔ ہم دوسروں کی نگرانی تو کجا، خود اپنی نگرانی کے بھی قابل نہ رہے۔ سو اس کا خمیازہ اٹھا رہے ہیں۔ جب کہیں چوری ہو تو سوجانے والا چوکیدار سب سے پہلے دھریا جاتا ہے۔ سو ہم اس غفلت کی سزا بھگت رہے ہیں اور ہمارا یہ دعویٰ کہ اسلام تمام ادیان پر فوقیت رکھتا ہے، ہمیں اس عذاب سے قطعاً نہیں بچا رہا، نہ ہی بچائے گا جب تک ہم اس پر عمل کر کے خود اپنے آپ کو اس فوقیت کا مستحق نہ بنالیں۔

آخر میں، میں اس امر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے جو کچھ اس تقریر میں کہا ہے، اس سے نہ کسی اہل مذہب کی دل آزاری مقصود ہے اور نہ ہی ان کے بانیان مذہب میں سے کسی کی (معاذ اللہ) تحقیر مطلوب جہاں تک غیر مذہب کے بانیوں کا متعلق ہے، قرآن کی رو سے ہمارا ایمان ہے کہ خدا نے دنیا کی تمام اقوام کی طرف اپنے رسول بھیجے تھے۔ ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی کی صراحت قرآن نے کر دی ہے اور باقیوں کا نام لے کر ان کا ذکر نہیں کیا لیکن کسی کا نام قرآن میں آیا ہے یا نہیں، ہم ان تمام فرستادگانِ خداوندی کا دلی ادب و احترام کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی رسالت کا اقرار، ہمارا جزو ایمان ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان حضرات کی طرف سے تو خدا کی سچی تعلیم پیش ہوئی تھی لیکن بعد میں اس تعلیم میں کمی بیشی ہو گئی اور اب وہ اصلی اور حقیقی تعلیم قرآن کریم کے اندر

جب ہم اس حقیقت کو پیش کریں گے کہ اب اسلام ہی خدا کا سچا دین ہے، تو اس کی تعلیم کے سامنے لامحالہ دوسرے مذاہب کی وہ تعلیم لانی پڑے گی جو قرآن کے خلاف ہے اور اس لئے ہمارے نزدیک سچی نہیں ہو سکتی۔

میں نے غیر مذاہب کی تعلیم کے متعلق جو کچھ کہا ہے، وہ صرف اس مقصد کے پیش نظر کہا ہے۔ اس حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیئے کہ اسلام کسی کو بُرا کہہ کر اپنے آپ کو اچھا ثابت نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اپنی اچھائی کو علیٰ وجہ البصیرہ پیش کرتا اور دلائل و براہین سے منواتا ہے۔ قرآن کا حکم تو یہ ہے کہ تم مشرکین کے بتوں کو بھی گالی نہ دو۔^(۹/۱۰۹) وہ تمام دنیا کی واجب الاحترام ہستیوں کا احترام سکھاتا ہے۔ البتہ ان کی، یا ان کی طرف منسوب کردہ غلط تعلیم کو غلط قرار دیتا ہے۔ یہی شعار ہمارا بھی ہونا چاہیئے۔

وَالسَّلَامُ

انسان

نومبر ۱۹۶۱ء

زمین خاکِ درِ مے خانہ ما فلک یک گردشِ پیمانہ ما
حدیثِ سوز و سازِ مادرِ از است جہاں دیبِ پتہ افسانہ ما

خدا کی تمام مخلوق میں جس کا علم اس وقت تک انسان کو ہو سکا ہے، انسان کی تخلیق، ایک بنیادی لحاظ سے، دوسروں سے بالکل مختلف ہے۔ حیاتیاتی طور پر (BIOLOGICALLY) دیکھتے تو انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح ایک حیوان ہے لیکن جہاں باقی حیوانات کی یہ کیفیت ہے کہ ان کی زندگی شروع سے آخر تک ایک ہی سطح پر رہتی ہے، انسانی زندگی کی دو الگ الگ سطحیں ہیں۔ مثلاً گھوڑے کا بچہ جن خصوصیات کو لے کر پیدا ہوگا، اس کی زندگی میں ان خصوصیات کی نشو و نما ہوتی جائے گی لیکن رہے گا وہ شروع سے آخر تک گھوڑا ہی، یعنی اس کی زندگی ایک ہی سطح پر رہے گی۔ اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوگی لیکن انسان کی کیفیت یہ نہیں۔ اس کی ایک سطح حیوانی زندگی کی ہے اور دوسری سطح اس سے یکسر مختلف ہے۔

جہاں تک اس کی حیوانی سطح کی زندگی کا تعلق ہے، انسانی بچہ کی پیدائش بھی دیگر حیوانات کی طرح ہوتی ہے۔ اور یہ بھی انہی مراحل میں سے گزرتا ہے، جن میں سے دیگر حیوانات گزرتے ہیں۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ ابتداء صغیر ارض پر غیر ذی حیات مادہ (INORGANIC MATTER) تھا، پھر اس میں خدا نے زندگی کی نمود کی۔ وہ انسانی تخلیق کی داستان کی ابتداء اس مقام سے کرتا ہے جہاں کہتا ہے کہ

وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِن طِينٍ (۳۲/۷)
انسانی تخلیق کی ابتداء مٹی سے ہوئی۔

زندگی کا سرچشمہ پانی ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۳۱/۳۰)
اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا۔

اس لئے انسانی تخلیق کا اگلا مرحلہ طینِ لازب (چپ چپی مٹی) تھا، یعنی غیر ذی حیات مادہ (مٹی) اور سرچشمہ زندگی (پانی) کے امتزاج سے زندگی (LIFE) کی ابتداء ہوئی۔

إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ (۳۷/۱۱)
یقیناً ہم نے انھیں چپ چپی مٹی سے پیدا کیا۔

اس سے زندگی کا جرثومہ اولیں (FIRST LIFE CELL) وجود میں آیا جسے قرآن نے نفس واحدہ کہہ کر پکارا ہے (۷/۱۸۹) یعنی وہ غلیہ (CELL) جس کے اندر نر اور مادہ، دونوں کے امکانی اجزاء موجود ہوتے ہیں۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا ذَوْجَهَا. (۷/۱۸۹)
وہی ہے جس نے تمہیں نفس واحدہ سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔

یہاں سے کاروانِ حیات مختلف مراحل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا تا آنکہ وہ اس منزل میں جا پہنچا، جہاں پیدائش بذریعہ تولید و تناسل ہوتی ہے، یعنی نر کے مادہ تولید کا، مادہ کے رحم میں استقراء۔

وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ مِّن سُرَابٍ ثُمَّ مِّن نُّطْفَةٍ (۳۵/۱۱)
اور اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے۔

اس منزل میں ہر قسم کے حیوانات شامل ہیں۔

وَاللَّهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِّن مَّاءٍ فَمِنْهُمْ مَّن يَّمْشِي عَلَى بَطْنِهِ ۖ
وَمِنْهُمْ مَّن يَّمْشِي عَلَى رِجْلَيْنِ ۖ وَمِنْهُمْ مَّن يَّمْشِي عَلَى أَرْبَعِ ط
يَخْلُقُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ط إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (۲۳/۲۵)

اور اللہ نے ہر ایک ذی حیات کو پانی سے پیدا کیا۔ پھر ان میں وہ ہیں جو اپنے پیٹ کے بل ریگتے ہیں اور وہ ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں اور وہ بھی جو چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ یہ سب

خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق پیدا ہوتے ہیں۔ اس نے ہر شے کے لئے قوانین مقرر کر رکھے ہیں، جن پر اس کا پورا پورا کنٹرول ہے۔

اس منزل میں رحم مادر میں انسانی بچہ بھی انہی مراحل میں سے گزرتا ہے، جن میں سے دیگر حیوانات کے بچے گزرتے ہیں۔ سورۃ المؤمن میں ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ۔ پھر ہم نے اُسے ایک نطفہ بنایا جو (رحم مادر) میں بٹھرجاتا اور اپنی جگہ قائم کر لیتا ہے۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً۔ پھر ہم نے اس نطفہ کو جو تک جیسی شکل کا لاٹھڑا سا بنا دیا۔ فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً۔ پھر اس لاٹھڑے کو گوشت کا ٹکڑا سا کر دیا۔ فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظْمًا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ پیدا کیا۔ فَخَسَّوْنَا الْعِظْمَ لَحْمًا۔ پھر اس ڈھانچے پر گوشت کی تہ منڈھ دی۔ (۱۲/۲۳) یہ وہ مراحل ہیں جن میں سے ہر حیوانی بچہ گزرتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ پیدائش کے بعد بھی زندگی کے جتنے طبیعی مراحل (PHYSICAL STAGES) ہیں، ان میں بھی یہ سب برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ حج میں ان تمام مراحل کا ذکر کرنے کے بعد جو اد پر بیان کئے گئے ہیں، فرمایا۔ ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا۔ پھر ہم تمہیں طفولیت کی حالت (ایک بچہ کی شکل میں) رحم سے باہر لے آتے ہیں۔ ثُمَّ لِيَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ۔ پھر تم اپنی جوانی کی حالت تک پہنچ جاتے ہو۔ وَ مِنْكُمْ مَّن يُّتَوَفَّىٰ ذَمُّكُمْ مِّنْ يَّسَّرٍ ۚ إِلَىٰ آثَرِ الْعُسْرِ۔ (۲۲/۵) پھر تم میں سے کوئی ایسا ہوتا ہے جو (بڑھاپے سے پہلے ہی) مرجاتا ہے اور کوئی ایسا ہوتا ہے جو بڑھاپے تک پہنچتا ہے۔ ان مراحل سے بھی تمام حیوانات یکساں طور پر گزرتے ہیں۔

یہ انسان کی طبیعی زندگی ہے جو انہی طبیعی قوانین (PHYSICAL LAWS) کے تابع گزرتی ہے، جن کے مطابق دیگر حیوانات جیتے اور مرتے ہیں۔ کھانا، پینا، سوتا، جاگنا، افزائش نسل کرنا، بیمار ہونا اور مرجانا، حتیٰ کہ جس چیز کو حیوانات کی جبلت (INSTINCT) کہا جاتا ہے، اس سطح پر انسان کے بھی کم و بیش وہی جذبات ہوتے ہیں۔ حیوانات کے جبلتی تقاضوں کی بنیادی طور پر تویب کی جلنے، تو وہ تین شعبوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔

(i) جذبہ تحفظِ خویش (SELF PRESERVATION)

(ii) جذبہ تغلب (SELF AGGRESSION)

اور (۱۱۱) جذبہٴ افزائشِ نسل . (SELF REPRODUCTION)

جوانی سطحِ زندگی پر، انسان کے تمام کاروبار کے محرکات بھی یہی جذبات ہوتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ دیگر حیوانات ان حدود کو نہیں توڑتے جو ان کے لئے فطرت نے مقرر کر دیے ہیں لیکن انسان حدود شکنی بھی کرتا ہے اور اسی لئے اس کی طبعی زندگی بھی بے حد تلخ اور سکون فراموش ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے انسان کے ان حیوانی جذبات کا ذکر متعدد مقامات پر کیا ہے۔ مثلاً سورۃ حمد سجدہ میں ہے کہ انسان کی مستقل خواہش یہ ہوتی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ مال و دولت ملتا چلا جلتے۔ اس میں وہ کسی حد پر رکنا ہی نہیں۔ (لَا يَسْتَكْمِلُ الْإِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ — ۴۹/۴۱) اس کا یہ جذبہ بڑا ہی شدید ہے۔ (وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ۸/۱۰۰) یقیناً وہ مال و دولت کو اپنی طرف کھینچنے میں بڑا ہی شدت پسند واقع ہے۔ وہ دولت کی محبت کو اپنی ضروریات تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ اس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں دیوانہ ہو جاتا ہے اور چونکہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوئی حد مقرر نہیں، اس لئے وہ مرتے دم تک اس دیوانگی میں مبتلا رہتا ہے۔ اَلْهٰكُمُ الشَّكَاوُحُ حَتّٰى تَرٰنٰتُكُمُ الْمَقَابِرَ ۲۱-۱۰۲/۱۰۲) ایک دوسرے سے بڑھ جانے کے جذبہ میں دنیا و مافیہا اور زندگی کے حقیقی مقصود سب سے غافل ہو جاتا ہے اور اس میں برابر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کسی مقام پر رکنا ہی نہیں۔ حتیٰ کہ یہ قبر تک جا پہنچتا ہے۔ اسی جذبہ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اسے ذرا سی مصیبت یا تنگی پیش آئے تو سخت مایوس ہو جاتا ہے۔ وَإِذَا مَسَّ الشُّبَّانُ خِينُوسٌ كَخُوطٍ ۴۹/۴۱) اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ناامید اور مایوس ہو جاتا ہے جہاں اس کے جذبہٴ حصولِ مال و دولت کی کوئی انتہا نہیں، وہاں اس کی مایوسی کی بھی کوئی حد نہیں۔ اس میں یہ خودکشی بھی کر لیتا ہے (حیوانات نہ اپنی ضروریات سے زیادہ سیمٹنے کی فکر کرتے ہیں نہ ہی خودکشی کرتے ہیں) یہ بے حد بے صبر واقع ہوا ہے اور اس کا کبھی پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوًّا ۱۹/۷۰) اس کی حالت یہ ہے کہ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۷۰/۷۰ جب اُسے تکلیف پہنچتی ہے تو دوا دلا مچا دیتا ہے۔ — وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۲۱-۷۰/۷۰) اور جب اسے مال و دولت حاصل ہوتا ہے تو اسے رک کر بیٹھ جاتا ہے کسی کو نہیں دیتا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ ۶/۱۰۰) یہ تنہا خور ہے اور اپنے نشوونما دینے والے کے سامانِ رزق میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتا۔ بے حد تنگ دل ہے۔

قُلْ لَّوْ اَنَّكُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْ اِذَا اَلَمَسَّكُمْ خَشِيۡةُ الْاِنۡفَاقِ

وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَشُورًا (۱۰۰/۱۴)

ان سے کہو کہ تمہاری حالت یہ ہے کہ اگر تمہارے پاس میرے رب کی رحمت کے خزانے بھی ہوتے، تو اس ڈر سے کہ وہ کہیں ختم نہ ہو جائیں تو تم انہیں روکے رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی تنگ دل واقع ہوا ہے۔

تنگ دل بھی اور ناشکر گزار بھی۔ وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا (۶۴/۱۴) اس کے ساتھ ہی اتنا جلد باز کہ جذبات کی شدت میں بعض اوقات اپنے نفع و نقصان میں بھی تمیز کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

وَيَذَعُ الْإِنْسَانُ بِأَشَدِّ دُعَاءٍ كُفًا بِالنَّصِيرِ - وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا (۱۱/۱۴)

اور انسان بھلائی کو بلانے کی جگہ اُبرائی کو آدازیں دے کر بلالیتا ہے۔ یہ ہے ہی بڑا جلد باز

اس شدت جذبات کا نتیجہ ہے کہ یہ بڑا کمزور واقع ہوا ہے۔ مقہوری سی (TEMPTATION) کا بھی

مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جھٹ پھسل جاتا ہے۔ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا (۲۸/۴) انسان بڑا کمزور پیدا کیا گیا ہے،

بہت جلد جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بڑا جھگڑا لڑا واقع ہوا ہے۔

وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرُ شَيْءٍ جَدًّا (۵۴/۱۸) اور انسان اکثر جھگڑا کرتا رہتا ہے۔ اپنے طبعی تقاضوں

کی تشکیل میں اس کی یہی حدود فراموشیاں ہیں، جس کی وجہ سے یہ ”ظالم اور جاہل“ قرار پاتا ہے۔ إِنَّهُ

كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (۲/۳۳)

یہ تمام خصوصیات انسان کی حیوانی سطح زندگی کی ہیں۔ ذہن انسانی کی یہ بہت بڑی غلطی تھی کہ اس نے ان جذبات

کو انسانی فطرت (HUMAN NATURE) قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ انسانی سطح زندگی (HUMAN LEVEL)

اس سے یکسر الگ اور ممتاز ہے۔ یاد رکھئے! یہ انسان کے حیوانی جذبات ہیں، جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا

جائے گا۔ انسان کی نہ کوئی ”فطرت“ ہو سکتی ہے نہ ”فطرت“ ہے (ان حیوانی جذبات کو بے باک چھوڑ دینے

کا نتیجہ ہے کہ انسان، نوع انسان کا شکاری ہے۔ ایک فرد دوسرے فرد کا دشمن اور ایک قوم دوسری

قوم کے خون کی پیاسی ہے۔ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۳۶/۲) اور اس کا نتیجہ

يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (۲/۲۰)

خون ریزیاں اور فساد انگیزی

حیوانی سطح زندگی پر اس کے سوا کوئی اور نتیجہ ہو نہیں سکتا۔ زندگی ”جنگل کے قانون“ کے تابع رہتی ہے۔

جس میں ہر طاقتور اپنے سے کمزور کا خون پیتا ہے اور ہر تیز پنچے والا ضیف کا گوشت نوچتا ہے۔ اس سطح پر انسان انسان نہیں، بلکہ حیوان ہوتا ہے۔ بلکہ اکثر مقامات پر ان سے بھی گزرا۔ اُولَئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (۷۱/۷۹)

اگر انسان کے متعلق یہ سمجھ لیا جاتے کہ اس کی زندگی بس یہی حیوانی سطح کی زندگی ہے، تو قرآن کریم اس تصور حیات کو کفر سے تعبیر کرتا ہے اور اس کا نتیجہ جہنم بتاتا ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ بِمَا تَأْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالسَّامِ
مَثْوًى لَهُمْ (۱۲/۷۷)

اور جو لوگ کافر ہیں، وہ سامانِ زندگی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور حیوانات کی طرح کھاپی کر رہ جاتے ہیں) ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

جہنم اس لئے کہ اس نظریہ زندگی کے ماتحت 'ہر فرد' (اور ہر قوم) اپنے طبعی جذبات کی تسکین اور حیوانی مطالبوں کے حصول کو منتہائے حیات سمجھتا ہے اور ان کے باہمی مفاد کے تصادم سے یہ دنیا جہنم میں بدل جاتی ہے۔ ان کے سامنے اس سے بلند کوئی مقصد حیات نہیں ہوتا — اور حقیقت یہ ہے کہ جب انسانی زندگی کو بس یہی طبعی زندگی سمجھ لیا جاتے تو اس سے بلند مقصد حیات کوئی ہو نہیں سکتا۔ یہی ہیں وہ جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ —
اَخْسَاءُ يَتَمَتَّعُونَ بِالْحُلَّةِ هَلُمُّهُ۔ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا، جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا معبود و مقصود بنا لیا؟ جذبات کو معبود بنالینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان علم و عقل کے باوجود، علم و عقل سے کام لینے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ اس کے جذبات اس کی فکری صلاحیتوں کو سلب کر لیتے ہیں۔ وہ اس کی عقل و خرد پر پردے ڈال دیتے ہیں۔

وَاَضَلَّهٗ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمِهٖ وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشًّا

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم و عقل کے باوجود وہ صحیح راستے پر نہیں آ سکتا۔ اس کی سننے، سوچنے کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ جب جذبات غالب آجائیں تو عقل و فکر موقوف ہو جاتی ہے۔ سو جب وہ اس قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو صحیح راستے پر کیسے چل سکتے ہیں۔ فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۲۳/۲۵) سو قانون خداوندی کے علاوہ کون سی چیز صحیح راستے کی طرف ان کی راہ نمائی کر سکتی ہے۔ کیا یہ اتنی سی بات پر بھی غور

نہیں کر سکتے؟

یہ کون لوگ ہیں؟ وہ لوگ دَقَالُوا اَمَّا هِيَ الْاَحْيَاتُ ثَنَا الدُّنْيَا ذَمُّوَتْ وَنَحْنُ مَا يَهْلِكُنَا
الَّذِي هُمْ۔ جو کہتے ہیں کہ زندگی بس اس دنیا کی زندگی ہے۔ اسی میں ہم زندہ رہتے ہیں، اسی میں مر جاتے
گے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے انسانی قویٰ مضاعف ہوتے جاتے ہیں اور اس طرح انسان رفتہ رفتہ ختم ہو جاتا ہے۔
اس کے بعد اس کا کچھ باقی نہیں رہتا۔ سو جب زندگی انسانی جسم کی طبیعی مشینری کے چلنے رہنے تک ہے، تو پھر
انسان کے طبیعی تقاضوں کی تسکین کے علاوہ مقصود حیات کیا ہو سکتا ہے؟

لیکن قرآن کہتا ہے کہ وَمَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ۔ اِنَّهُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ۔ (۲۵/۲۴)
ان کا یہ خیال علم و حقیقت پر مبنی نہیں۔ یہ محض ظن و قیاس سے کام لیتے ہیں۔
آئیے اب دیکھیں کہ علم و حقیقت کی رُود سے بات کیا ہے؟

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، قرآن کریم نے بتایا ہے کہ انسانی پختہ (جنین) بھی رحم مادر میں اُنہی طبیعی مراحل
سے گزرتا ہے، جس سے تمام حیوانی پختے گزرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ لیکن اس
کے بعد قرآن نے ایک ایسی خصوصیت کا ذکر کیا ہے جو صرف انسان کو حاصل ہے۔ اس میں دوسرے حیوان شریک
نہیں۔ سورۃ سجدہ میں ان طبیعی مراحل کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے۔ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوحِہِ۔
پھر خدا نے اسے سنوارا۔ اسے ٹھیک اعتدال پر لایا اور اس میں اپنی ”روح“ پھونک دی۔ ”روح“ کے
معنی توانائی (ENERGY) کے ہیں۔ اس کی ماہیت کیا ہے، اسے ہم نہیں جان سکتے۔ البتہ اس کا نتیجہ کیا ہے،
اس کے متعلق قرآن کریم نے بتایا کہ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ (۲۲/۹) اس نے
تمہارے لئے ”سمع و بصر و فواد“ بنائے ”سمع و بصر“ سے عام مفہوم ”ذرائع علم“ ہے اور فواد کا تعلق احسا
و جذبات سے ہے لیکن قرآن کریم نے ”سمع و بصر“ کو جس انداز سے پیش کیا ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ
اس سے اس کی مراد انسان کا اختیار و ارادہ ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر ہے۔

اِنَّ خَلْقَنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَفْشَاجٍ يَنْتَثِرِہِ فَجَعَلْنٰہُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا۔ ہم نے
انسان کو ایسے نطفہ سے پیدا کیا جو مخلوط ممکنات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ان ممکنات کی رفتہ رفتہ نمود ہوتی جاتی ہے،
تاکہ وہ ”سننے دیکھنے والا“ بن جاتا ہے۔ اس کے بعد ہے اِنَّا هَدَيْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا

كَفُّوسًا۔ (۳-۲/۷۶) ہم اسے راستہ دکھا دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ چیز اس کے اختیار میں ہے کہ اسے قبول کرے یا اس سے انکار کر دے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ”روح خداوندی“ (DIVINE ENERGY) جو بالخصوص انسان کو عطا ہوتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان صاحب اختیار و ارادہ ہو گیا ہے۔ یہ خصوصیت نہ حیوانات کو حاصل ہے نہ کائناتی قوتوں کو۔ اسی خصوصیت کی بناء پر یہ مسجود ملائکہ قرار پایا ہے۔ سورۃ ص میں ہے۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ۔ فَاِذَا اسْوٰیْتُهُۥ دَفَعْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا اِلَیْہِ سٰجِدِیْنَ۔ (۲-۷۱/۳۸)

جب تیرے پروردگار نے ملائکہ سے کہا کہ میں مٹی (غیر ذی حیات عنصر) سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں، سو جب میں اسے سنوار کر تکمیل تک پہنچا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو تم اس کے سامنے اطاعت پذیری کے طور پر جھک جانا۔

آپ داستانِ آدم میں دیکھتے۔ ملائکہ کے متعلق تو کہا کہ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۔ انھیں جو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہ اسے بجالاتے ہیں۔ وَہُمْ لَا یَسْتَعْجِلُوْنَ (۵۰-۱۶/۴۹) وہ اس سے کبھی سرتابی نہیں اختیار کرتے۔ (یہ چیز صرف ملائکہ ہی کے متعلق نہیں کہی۔ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ ذَاکِبۃٍ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَہُمْ لَا یَسْتَعْجِلُوْنَ (۱۶/۴۹) وہ اس سے کبھی سرتابی نہیں اختیار کرتے۔) یعنی تمام کائناتی اشیاء اور ذی حیات کے متعلق) لیکن جب ”آدم“ سے کہا گیا کہ ”تم اس شجر کے قریب نہ جانا“ تو اس نے اس حکم کی نافرمانی کی، یعنی آدم فرماں پذیری پر مجبور نہیں۔ یہ اس کے اختیار میں ہے کہ چاہے اطاعت کرے اور چاہے سرکشی برتے۔

قُلْ اِنِّیْٓ اِنۡحٰیۡتُ مِنْ رَّبِّیْۤ اَتَّبَعْتُ مَا یُؤْمَرُ بِہٖ وَہُمْ لَا یَسْتَعْجِلُوْنَ (۱۶/۴۹) ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے آگیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ دیگر مخلوق مشیت کے پروردگار پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے لیکن انسان سے کہا گیا ہے کہ اَعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (۱/۴۱) تم جو چاہو کرو۔ تمہیں اس کی آزادی حاصل ہے۔ جیسا تم کرو گے، اس کے مطابق تمہیں نتیجہ مل جائے گا۔

حیوانات کی مجبوری کا نتیجہ یہ ہے کہ جو کچھ کسی حیوان کو بننا ہوتا ہے، وہ پہلے دن سے بن چکا ہوتا ہے۔ (اس کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے) لیکن انسان کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ یہ بنا بنایا پیدا نہیں کیا جاتا۔ یہ

اس پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اسے جو کچھ بننا ہے، خود بنے۔ خالق فطرت نے اس کی لوح تقدیر کو خالی رکھا ہے اور قلم اس کے اپنے ہاتھ میں دے دیا ہے کہ یہ اس لوح پر جو کچھ لکھنا چاہے، خود لکھ لے۔ یہ وہی کچھ بن جائے گا جو کچھ یہ کرے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ حیوانی سطح زندگی پر انسان کے جبلی تقاضے تو ہیں لیکن انسانی سطح پر اس کی کوئی فطرت (NATURE) نہیں۔ فطرت ان بنیادی خصوصیات (CHARACTERISTICS) کو کہتے ہیں جو نہ کسی کی اپنی بنائی ہوئی ہوں اور نہ وہ ان کے بدلنے پر قادر ہو۔ فطرت اشیائے کائنات کی ہوتی ہے، حیوانات کی ہوتی ہے۔ انسان چونکہ مجبور نہیں، اس لئے اس کی فطرت کوئی نہیں۔ اس کے اندر کچھ صلاحیتیں ہیں، کچھ ممکنات (POSSIBILITIES) ہیں۔ یہ ان صلاحیتوں کو جس انداز سے استعمال کرے گا، وہی کچھ بن جائے گا۔ بلندی کی طرف جانا چاہے تو یہ أَحْسَنَ تَقْوِيْمٍ - (۹۵/۴) کا مظہر ہوگا، پستی کی طرف جائے گا تو أَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ط (۹۵/۵) کی سطح تک پہنچ جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ یہ ”بلندی“ اور ”پستی“ کیا ہے۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ زندگی جب حیوانی سطح سے اوپر اُبھرتی ہے تو اس میں اختیار و ارادہ کی خصوصیت نمودار ہو جاتی ہے لیکن اختیار و ارادہ نہ اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے نہ بجائے خویش مقصود بالذات ہے۔ جسے قرآن نے رُوحِ خداوندی کہہ کر پکارا ہے، اسے نفسِ انسانی (HUMAN PERSONALITY) اسے تعبیر کیا گیا ہے۔ اختیار و ارادہ درحقیقت نفسِ انسانی کی بنیادی خصوصیت ہے اور مقصودِ حیات، نفسِ انسانی (انسانی ذات) کی نشوونما ہے۔ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ عَمِلَ كُفًّا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا - (۹۱/۱۰) جس نے اُسے نشوونما دے لی، وہ کامیاب ہو گیا۔ جس نے اسے دبا دیا، وہ تباہ ہو گیا۔ جس طرح حیوانی زندگی کے تقاضے ہیں، جن کے پورا کرنے سے انسان کی طبعی زندگی کی نشوونما ہوتی ہے، اسی طرح اس کی انسانی زندگی کے بھی تقاضے ہیں، جن کی تسکین سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس کی ذات کے تقاضے وہ ہیں جن میں حیوان شریک ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) کے سلسلے میں جسم کی پرورش، حیوانی سطح زندگی کا تقاضا ہے۔ اس میں حیوان اور انسان (کی حیوانی سطح زندگی) دونوں برابر کے شریک ہیں۔ حتیٰ کہ بچوں کی پرورش کا جذبہ بھی دونوں میں مشترک ہوتا ہے لیکن دوسروں کی پرورش کا تقاضا حیوانات میں نہیں ہوتا۔ یہ انسانی سطح زندگی کا تقاضا ہے۔ ایک بیل مرے سے

ط لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ - ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِيْنَ -

چارہ کھا رہا ہے۔ اگر اس کے پاس دوسرا بیل بندھا ہے جو چار روز کا بھوکا ہے، تو اس بیل کو اس کی بھوک کا خیال تک نہیں آتے گا۔ وہ اگر اس کے چارہ کی طرف مٹھ کر لے گا تو یہ اسے مارنے کے لئے آگے بڑھے گا۔ اگر ایک انسان بھی دوسرے انسان کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے تو وہ حیوانی سطح کی زندگی پر ہے بلکہ اس باب میں انسان حیوان سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ بیل کا جب پیٹ بھر جائے تو اسے اس کی فکر نہیں ہوتی کہ اس کا باقیماندہ چارہ کون کھا جاتا ہے لیکن انسان ہے کہ اپنی ضروریات پوری ہونے کے بعد بھی فاضلہ سامان زیست کے پاس تک کسی کو پھینکنے نہیں دیتا۔ لیکن اس کی انسانی سطح کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسروں کی پرورش کا نہ صرف خیال کرے بلکہ اس کا انتظام کرے۔ اس تقاضے کے پورا کرنے سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور انسانی ذات کا خاتمہ جسم کی موت کے ساتھ نہیں ہو جاتا۔ یہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ اسی کو بلندی کی طرف جانا کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے جب کہا ہے کہ **لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ** — (۸۴/۱۹) انسان منزل بہ منزل اوپر کو چڑھتا جاتے گا تو اس سے یہی مقصود ہے۔ اس کی حیوانی سطح زندگی کی انتہا تو یہ ہے کہ **دَسَخَرْنَا لَكُم مَّا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ** (۲۵/۱۳) یعنی اس طبعی کائنات میں جو کچھ ہے اسے اس کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اشیائے فطرت اور کائناتی قوتوں کی تسخیر انسان کی حیوانی سطح زندگی کا منہا ہے لیکن اس کی انسانی زندگی کے متعلق کہا کہ یہ **أَفْطَارِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ** سے بھی آگے جاسکتا ہے۔ (۵۵/۳۳) یہی وہ مقام ہے جسے جنتِ اُخرویٰ کہا جاتا ہے لیکن جنت بھی اس کے ارتقائی سفر کا آخری مقام نہیں۔ وہ بھی اس کی رہ گزر ہی ہے۔ اسے اس سے بھی آگے جانا ہے، اس لئے کہ اہل جنت کے متعلق کہا گیا ہے کہ

لَوْ نَرَاهُمْ يَسْحَبُونَ أَيْدِيَهُمْ ذُرِّيَّاتِهِمْ . يَقُولُونَ سَابِقَنَا إِلَىٰ أَعْمَالِنَا
لَنَنبَغِيَنَا وَأَنفَعُنَا لَنَا (۶۶/۸)

ان کا نور ان کے آگے آگے اور دائیں چلتا ہوگا اور ان کی دُعا یہ ہوگی کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے تو ہمارے نور کو تکمیل تک پہنچا دے اور ہر قسم خطرات سے ہماری حفاظت کر۔

وَهُدُّوهُ إِلَى صِرَاطِ الْحَمِيدِ (۲۲/۲۴) ان کی راہ نمائی قابلِ تعریف راستے کی طرف کی جائے گی۔

جس معاشرہ میں حیوانی سطح زندگی کے تقاضوں کو مقصودِ حیات سمجھ لیا جائے اور انسانیت کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا جائے، وہ معاشرہ جہنمی ہوتا ہے لیکن جس معاشرہ میں حیوانی سطح کے تقاضوں کی تسکین کے ساتھ ساتھ انسانیت کے تقاضوں کا بھی خیال رکھا جائے اور جب ان دونوں کا تصادم ہو تو انسانی تقاضوں کو ترجیح

دی جاتے اسے "اسلامی معاشرہ" کہا جاتا ہے اور وہ نوع انسان کے لئے جتنی زندگی کی فضا پیدا کر دیتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما اسی قسّم معاشرہ میں ہو سکتی ہے۔

اس معاشرہ میں ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے، واجب التکریم سمجھا جاتا ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۷/۷۰) اس لئے کہ تکریم انسانیت اس "روح خداوندی" کی وجہ سے ہے جو انسان کی بنیادی خصوصیت ہے اور جو، ہر انسانی بچے کو یکساں طور پر عطا ہوتی ہے۔ اس میں انسانی زندگی — خواہ وہ عام معیاروں کے مطابق (ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کی بھی کیوں نہ ہو) — بڑی گراں بہا تسلیم کی جاتی ہے اور ایک جان کی قیمت پوری نوع انسان کے برابر قرار دی جاتی ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا۔
وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا۔ (۵/۳۲)

جو کوئی کسی انسانی جان کو بغیر جان کے بدلے کے یا فساد فی الارض کئے، ناحق مار دے تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوع انسان کو مار دیا اور جس نے کسی ایک جان کو زندہ رکھا، تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوع انسان کو زندہ رکھا کر دی۔

اس معاشرہ کے پیش نظر مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان تفریقات کو مٹا کر جمعوں نے انسانوں کو الگ الگ گردہوں، پارٹیوں اور قوموں میں تقسیم کر کے انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں، تمام نوع انسان کو ایک عالمگیر برادری بنا دیا جائے۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (۲/۲۱۳) اس کا بنیادی اصول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اسی نظریہ زندگی، اسی نظام حیات، اسی معاشرہ، اسی جماعت کو بقا اور حیات جاوید مل سکتی ہے، جس کے پیش نظر، کسی خاص جماعت، گردہ، پارٹی، ملک یا قوم کا مفاد نہیں، بلکہ پوری نوع انسانیت کا مفاد ہو۔

وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَمِنْ كَثُرٍ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)

جو چیز تمام نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہو، اسے ہی زمین میں بقا نصیب ہوتی ہے۔

وہ انسانوں کے بعض طبقوں کو پست اور کمزور رکھ کر دوسرے طبقوں کو بلند اور طاقتور نہیں بنانا چاہتا۔ وہ پوری نوع انسانیت کو جسد واحد (ایک جسم یا ایک فرد) تصور کرتا ہے کہ اگر کمزور ہے تو پورے کا پورا فرد کمزور ہے اور اگر طاقتور ہے تو پورے کا پورا فرد طاقتور ہے۔

مَا خَلَقُكُمْ وَلَا يَخْشَكُمُ إِلَّا كَنَفْسٍ ذَا حِيَّةٍ (۳۱/۲۸) تمہارا
پیدا کرنا اور اٹھانا نفسِ واحدہ کی طرح ہے۔ اس کا مقصود و منتہی ارتقائے انسانیت ہے نہ کہ کسی خاص گروہ یا
طبقہ کی ترقی اور باقیوں کی پستی۔ بَخَشْ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو موانع کسی کے راستے میں حائل ہوں، انہیں دور
کر دینا تاکہ وہ اپنی نقل و حرکت کے لئے آزاد ہو جائے۔ اس کے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ
رہے۔ قرآن کریم ان تمام موانع کو دور کر دینا چاہتا ہے، جو نفع انسان کی ترقی کے راستے میں حائل ہوں۔
کسی ایک قوم یا ملک کی ترقی کے راستے میں نہیں بلکہ پوری انسانیت کی ترقی کے راستے میں نبی اکرمؐ کا مقصد کس
مشن ہی یہ بتایا گیا ہے کہ ”وہ ان زنجیروں کو توڑ دے گا، جس میں نفع انسان جکڑے ہوئے چلی آ رہی تھی اور ان
بوجھل سلوں کو اتار پھینکے گا، جن کے نیچے انسانیت دب رہی تھی۔“ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ
وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (۷۴/۱۵۷)

یہ ہے وہ انسان جسے اکثر مخلوق پر فضیلت عطا کی گئی ہے۔

وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (۷۴/۱۵۷)

اور ہم نے انسانوں کو بہت سی مخلوق پر فضیلت دی ہے۔

”بہت سی مخلوق“ (اکثر مخلوق) اس لئے کہ، مخلوق صرف اسی کرۂ ارضی پر نہیں۔ کائنات میں نہ معلوم کہاں کہاں
اور مخلوق ہے اور وہ کس قسم کی ہے۔ ارض کے علاوہ ”سموات میں ذی حیات مخلوق کی شہادت تو خود قرآن
کریم میں موجود ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتٍّ يَوْمٍ ثَلَاثَةٍ (۲۲/۲۹)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے زمین اور سموات میں ذی حیات مخلوق پھیلا
رکھی ہے۔

اس مخلوق کا تو علم نہیں، لیکن اس ارض پر مسجود ملائکہ ”آدم“ ہی ہے۔ یہاں انسان سے افضل کوئی مخلوق نہیں لیکن
اسی انسان سے جو انسانی سطح پر زندگی بسر کر رہا ہو، حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والوں کے متعلق تو کہا گیا ہے،
کہ وہ حیوانات سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ (۷۴/۱۵۹)

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ زندگی کو محض حیوانی یا طبعی زندگی سمجھنا قرآن کریم کی رو سے کفر ہے۔ اس لئے ایسا

کا تقاضا یہ ہے کہ انسانی زندگی کو، حیوانی سطح سے بلند، انسانی سطح پر سمجھا جائے، یعنی انسان کو محض آب و گل کا طبیعی پیکر نہ سمجھا جائے جو جس کے مادی عناصر کے انتشار (DISINTEGRATION) سے ختم ہو جاتا ہے بلکہ اس پر ایمان رکھا جائے کہ انسان طبیعی جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی رکھتا ہے، جسے انسانی ذات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی سے یہ اپنے تمام اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے اور ان کے نتائج کا حامل اور اسی سے انسانی حیات کا سلسلہ موت کے بعد بھی آگے چلتا ہے۔ اس تصور زندگی سے انکار، قرآن کی رُوسے کفر ہے، یعنی انسان کا خود اپنی ذات سے انکار کفر ہے۔

دینِ خداوندی کے دشمن

جنوری ۱۹۶۲ء

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویٰ سے شرارِ بولہبی!

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے کھلے الفاظ میں کہا ہے کہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ** — (۱/۶۰) اے جماعتِ مومنین! تم میرے دشمن اور اپنے دشمن کو کبھی اپنا دوست نہ بنانا۔ اپنے دشمن کو ہر شخص جانتا ہے (یا جان سکتا ہے) اور کوئی صاحبِ ہوش، دشمن کو دوست نہیں رکھتا لیکن یہاں خدا نے ایسے دشمن کا ذکر کیا ہے جو خدا اور جماعتِ مومنین کا مشترکہ دشمن ہے۔ سوال یہ ہے کہ خدا اور جماعتِ مومنین کا مشترکہ دشمن کون ہو سکتا ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ جو دینِ خداوندی کا مخالف ہے وہی خدا اور جماعتِ مومنین کا دشمن ہے۔ اس لئے کہ مومن کی ہستی ہی دین کے ساتھ ہے۔ اس کے دین کو فروغ اور اقتدار حاصل ہے تو مومن بھی صاحبِ عزت و توقیر ہے۔ اگر اس کے دین کا غلبہ نہیں، تو مومن کی بھی دنیا میں کوئی عزت نہیں۔ دینِ خداوندی کے مخالفین کی فہرست تو لمبی چوڑی ہو سکتی ہے لیکن اصل کے اعتبار سے قرآن نے انہیں دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے اور ان کا تذکرہ ایسی بشرح و بسط سے کیا ہے کہ ان کے پہچاننے میں کسی کو دشواری نہ ہو۔ یہ دینِ خداوندی کے وہ مخالف ہیں جن کا تعلق نہ کسی خاص مقام سے ہے نہ زمان سے۔ دنیا میں جب اور جہاں بھی خدا کے دین کی آواز بلند ہوتی، یہ گروہ فوراً مخالفت کے لئے میدان میں اتر آتے۔ اس سے یہ

بھی واضح ہو جاتا ہے کہ دین کی فروعات کتنی ہی کیوں نہ بدلتی رہی ہوں، اصل کے اعتبار سے دین شروع سے اخیر تک ایک ہی رہا ہے اور اس کی زدان و دونوں گروہوں پر ہمیشہ پڑتی رہی ہے جیسی تو ان گروہوں کی طرف سے ہر جگہ اور ہر زمانے میں اس کی مخالفت ہوتی رہی ہے۔ آیتیں ہم دیکھیں کہ یہ گروہ کون سے ہیں۔

گروہ اول

قرآن کریم نے دین کے مذکرہ کی ابتداء حضرت نوحؑ سے کی ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے۔

لَمَّا آتَيْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَتَّقُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ كُفْرًا مِّنْ إِلَهِ

غَيْرِ لَا تَتَّقُوا عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ (۷/۵۹)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف (حق کا پیغام دے کر) بھیجا۔ اس نے کہا اے میری قوم! تم خدا کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ (تمہاری موجودہ روش سے) ایک بڑا ہی ہولناک عذاب تم پر مسلط نہ ہو جائے

یہ تھی حضرت نوحؑ کی دعوت، یعنی حکومت و اقتدار صرف خدا کا ہے۔

دعوت حضرت نوحؑ

اس کے سوا تم کسی اور کی محکومی اختیار نہ کرو۔ یہ دعوت صاف اور واضح ہے۔ اب دیکھتے کہ اس دعوت کی مخالفت کس گروہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے۔ قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۷/۶۰) اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ اس کی قوم کے سربراہوں نے لوگوں نے جواب دیا کہ ہمیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تم کھلی ہوئی گمراہی میں پڑ گئے ہو۔ قرآن کریم نے اس کے لئے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ اَلْمَلَأُ ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں وہ لوگ جن کے گھر بھرے ہوں، جن کی کوٹھیاں اناج سے بھری ہوں، جن کے خزانے دولت سے بھرے ہوں، جن کے برتن سامان خورد و نوش سے لبریز ہوں۔ یہی لوگ ہیں جو قوم کے سردار کہلاتے ہیں۔ یہی ان کے اکابر اور سربراہ ہوتے ہیں۔ انہی کی رائے رائے کہلاتی ہے اور ان کی عقل عقل۔ جس کے گھر کھانے کو نہ ہو، جس کے برتن خالی ہوں، وہ لاکھ سمجھ کی بات کرے، کوئی اُسے درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔ پنجابی زبان میں ایک مثل ہے کہ ”جس دی کوٹھی دچ دانے“ اُس دے کلمے دی سیانے“ جس کے گھر کھانے کو ہو، اس کے ہاگل بھی عقلمند سمجھے جاتے ہیں۔ لہذا قرآن نے کہا یہ ہے کہ حضرت نوحؑ کی دعوت کی مخالفت، قوم کے دولت مند طبقے

کی طرف سے ہوتی جن کے ہاتھوں میں اقتدار تھا۔ دوسری جگہ ان کے متعلق یہ کہہ کر بات واضح کر دی —
 وَاسْتَوْفَضْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۲۳/۳۳) یعنی یہ وہ طبقہ تھا جسے دنیا میں آسودگی اور خوشحالی حاصل
 تھی جو دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے تھے۔ یہ معاہدہ گروہ جس نے سب سے پہلے مخالفت کی آواز بلند کی۔ ظاہر ہے
 کہ یہ آسمانی دعوت ایسی تھی، جس کی زور براہ راست سرمایہ دار طبقہ پر پڑتی تھی۔ یہ محض ”پوچھا پاٹ“ کا سوال نہیں تھا۔
 یہ دعوت ایک ایسے انقلاب کی پیغامبر تھی جس سے دولت مند طبقہ کو اپنے مفاد خطرے میں دکھائی دیتے تھے۔ وہ
 اسی لئے اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے کیونکہ اس کی کامیابی میں انہیں اپنی موت دکھائی دیتی تھی۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ دولت مند طبقہ ہمیشہ اس زعم میں رہتا ہے کہ دنیا بھر کی عقل و فکر کے واحد مالک اور سمجھ بوجھ
 کے اجارہ دار وہی ہیں۔ غریب کو نہ عقل ہوتی ہے نہ تمیز۔ نہ اس کی کوئی بات ایسی ہوتی ہے جس پر کان دھرا جائے
 اور نہ کوئی فیصلہ ایسا جسے توجہ کے قابل سمجھا جاتے۔ اس کی مفلسی اسے بے وقوف اور بے سمجھ اور اس کی غریبی اسے
 پست اور ذلیل بنانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ یہی تھی وہ ذہنیت جس کا مظاہرہ قوم نوحؑ کے سربراہوں کی طرف

سے ہوا۔ جب انہوں نے کہا کہ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا
غریبوں کی طرف سے لیبیک مِثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ

أَسَاؤُنَا بِأَدْعَىٰ الشَّرَائِي نَحْنُ انہوں نے حضرت نوحؑ سے کہا کہ ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے
 کہ تم ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں ان کی تو شکلیں دیکھ کر بتا دیا جاسکتا ہے
 کہ وہ ہم میں کیسے ہیں۔ وہ داعی عقل کے مالک ہیں۔ یوں ہی بلا سمجھ بوجھ تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ ذلیل
 اور سچی سمجھ بوجھ کے لوگوں کی ایک جماعت ہے جو تمہارے ساتھ ہو گئی ہے۔ وَمَا نَرَاكَ إِلَّا عَيْنَيْنَا مِنْ فَضْلٍ
 بَلْ نَقْظُكَ كَمَا نَحْذِي بِمَيْنَا (۱۱/۲۷) ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے، نہ تم میں کوئی صواب
 دولت و ثروت، نہ عقل و فکر کا مالک، نہ معاشرہ میں اس کی اونچی پوزیشن۔ تمہارا دعویٰ کس طرح سچا ہو سکتا ہے؟
 دعوئے اس کا سچا ہو سکتا ہے جس کی تائید سوسائٹی کا اوپر کا طبقہ کرے۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔
 آپ نے غور کیا کہ ان لوگوں کے نزدیک، حق و باطل، صدق و کذب اور عزت و ذلت کا معیار کیا ہوتا ہے؟
 فقط دولت اور اس کے زور پر حاصل کردہ اقتدار، آسمانی دعوت اس معیار کو بدلنے کے لئے آتی ہے اور اسی لئے
 اس طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوتی ہے۔ اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جَعَلْنَا عَلَيْهِمَا سِافِلَهُمَا
 (۱۱/۸۲) جو طبقہ اپنے خود ساختہ معیاروں کے مطابق بلند یوں پر ہوتا ہے، وہ پستیوں میں آگرتا ہے۔ یہی خطہ اس

کی مخالفت کا محرک ہوتا ہے۔

حضرت ہود کی دعوت

حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ تشریف لائے اور انہوں نے اپنی قوم کو وہی دعوت دی جو حضرت نوحؑ نے دی تھی، یعنی

(يَقَوْمِ) اَعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَهِ غَيْرُهُ (۲۳/۲۲) اے میری قوم تم اللہ کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحب اقتدار نہیں اور اس کا رد عمل؟ وہی جو پہلے ہوا تھا۔

وَقَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَالْآخِرَةُ
وَأَشْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ لَا يَأْكُلُ مِمَّا
تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ۝ (۲۳/۲۳)

اسکی قوم کے سرداروں نے، جنہوں نے سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی اور آخرت کے پیش آنے کے منکر تھے اور جنہیں دنیا کی زندگی میں ہم نے آسودگی اور خوشحالی عطا کر رکھی تھی، (لوگوں سے) کہا کہ ”اس شخص کی اس سے زیادہ کیا حیثیت ہے کہ تمہارے جیسا عام آدمی ہے جو کچھ تم کھاتے ہو یہ بھی کھاتا ہے۔ جو کچھ تم پیتے ہو یہ بھی پیتا ہے۔“

اس کے بعد ان سے کہا کہ اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی اطاعت قبول کرنی تو بس سمجھ لو کہ تم تباہ ہوتے (۲۳/۲۴) دوسری جگہ ہے کہ ان سردارانِ قوم نے کہا کہ اِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ (۴/۶۶) ہمیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تم حماقت میں پڑ گئے ہو۔

سوال یہ ہے کہ اس قوم کی وہ کون سی غلط روش تھی جس سے باز رہنے کی انہیں دعوت دی جا رہی تھی؟ قرآن کریم کہتا ہے کہ انہیں بڑی وسعت اور توانائی حاصل تھی۔ (وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصۜطَةً ۴/۶۹)

ان کا قبیلہ بہت بڑا تھا اور مال مویشی بھی بکثرت ملے تھے۔ نیز سرسبز و شاداب باغ اور جاری چشمے۔ اَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ وَبَنِينَ وَجَنَّتِ

وَعُيُونٌ (۲۶/۱۳۳-۱۳۴) وہ ایسے رفیع الشان محلات اور محکم قلعے تعمیر کرتے تھے گویا انہیں یہاں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔ (وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ۲۶/۱۲۹) انہیں اس قدر قوت و سطوت حاصل تھی جو کسی اور کو حاصل نہیں تھی (وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي مَا آتَيْنَاكُمْ مِنْهُ لِيُثَبِّتُوا فِيهِ ۲۶/۲۶) انہیں اس قدر قوت حاصل تھی لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس قوت کو حق و انصاف اور انسانیت کی فلاح و بہبود

کے کاموں میں صرف کرتے، وہ بے حد سرکش اور متکبر ہو گئے۔ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ
الْحَقِّ وَقَالُوا آمَنَّا بِمَا نَفُوقُ (۴۱/۱۵) قوت کے نشہ میں ان کی ہستی کی حالت یہ تھی کہ جس
کمزور پر ہاتھ ڈالتے، اس کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتے۔ وَإِذَا ابْتَغَشْتُمْ، بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ (۲۶/۱۳۰)
یہ تھی وہ قوم جو دعوت خداوندی کی دشمن تھی اور جس کے اکابرین نے اس دعوت کی مخالفت کی۔ اس کا انجام کیا ہوا،
اس کے متعلق قرآن کریم نے چار لفظوں میں پوری داستان بیان کر دی۔ جب کہا کہ وَقَطَعْنَا دَابِیْنَ كَذِبُ
بِأَيِّتِنَا وَمَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ (۴/۴۲) اور جنھوں نے ہمارے قوانین کی تکذیب کی تھی، ہم نے ان کی

جڑ بنیاد تک اکھڑ دی۔ وہ کبھی ایمان لانے والے نہیں تھے۔ قوم
دعوت حضرت صالحؑ

بڑی سطوت و ثروت کی مالک تھی۔ پُر فضا باغات، شیریں پھل، لہلہاتی کھیتیاں، پھل دار درخت (فِی جَنَّاتٍ
وَعِیْنُونٍ لَا تَنْسُ رُوحٌ وَلَا نَخْلٌ طَلْعُهَا هَضْبٌ نَّیْمٌ (۲۶/۱۳۴، ۱۳۸) وہ میدانوں میں محلات اور
پہاڑوں میں قلعے بناتے (تَتَّخِذُونَ مِنْ سُكُودِهَا قُصُورًا وَتَنْجِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا (۴/۴۳)
جب انسان کو اس قدر فراوان قوت اور دولت میسر ہو اور اسے استعمال وہ اپنی مرضی کے مطابق کرے تو اس
کا نتیجہ فساد کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس قوم کے نمائندگان کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم کہتا ہے۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (۲۶/۱۳۸)

اور شہر میں نو (سربراہان) تھے جو ہمیشہ ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے اور اصلاح

کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے تھے۔

اس قوم کی طرف حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے جنھوں نے آکر وہی پیغام دیا جو اس سے پہلے حضرات انبیاء کرامؑ دیتے
چلے آ رہے تھے۔ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ (۴/۴۳) اس نے
کہا کہ اے میری قوم! تم خدا کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمھارے لئے کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ اس پیغام
پر لبیک کن لوگوں نے کہا اور اس کی مخالفت کن لوگوں کی طرف سے ہوئی، اسے قرآن کریم کے الفاظ میں سینے۔

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لِلَّذِينَ
دولت مند طبقہ کی مخالفت

استضعفوا اِلَٰمًا مِّنْهُمْ (۴/۴۵) قوم کے
جن سربراہان اور وہ لوگوں کو اپنی دولت اور قوت کا گھمنڈ تھا، انھوں نے مومنوں سے کہا، یعنی ان لوگوں سے جنھیں ان

کی چیرہ دستیوں نے کمزور کر رکھا تھا۔ آپ نے غور کیا کہ اس دعوت خداوندی کو ماننے والا غریبوں اور کمزوروں کا طبقہ تھا اور اس کی مخالفت ارباب دولت و اقتدار کی طرف سے ہوئی تھی۔ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا آتَانَا بِالَّذِي أَمْنْتُمْ بِهِ كَارْهُونَ (۷۴/۷۵) ان سرکش اور متکبرین نے کہا کہ تم جس بات پر ایمان رکھتے ہو، ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔

یہ دعوت کیا تھی اور اس کی مخالفت کس بنا پر تھی؟ اس زمانے میں مال مویشی سب سے بڑی دولت تھے۔ اس لئے چراگا ہوں اور چشموں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ قوم کا دولت مند اور صاحب اقتدار طبقہ ان ذرائع رزق پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا اور غریبوں اور کمزوروں پر ان کے راستے بند کر دیتا تھا۔ یہی کچھ قوم ثمود کے اکابرین نے کر رکھا تھا۔ وہ غریبوں کے جانوروں کو خدا کے عطا کردہ چشموں سے پانی تک نہیں پینے دیتے تھے۔ یہ تھی ان کی مفسدانہ روش جس کے خلاف حضرت صالحؑ نے آواز اٹھائی تھی۔ اس کے جواب میں پہلے تو ان سردارین قوم نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت صالحؑ اور ان کے متبعین کو ختم ہی کر دیا جائے۔

قَالُوا اتَّقَاسْمُوا يَا لَلَّهِ لِنُبَيِّنَنَّ ذَٰهَلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَعَكَ بِآيِهِ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝ (۲۷/۲۸)

”انھوں نے (آپس میں مشورہ کیا اور) کہا کہ ایک دوسرے کے سامنے خدا کی قسم کھاؤ کہ ہم رات کو (حضرت صالحؑ) اور اس کے ساتھیوں پر بیجا رگی حملہ کر کے (انہیں قتل کر دیں گے) اور پھر (جب پوچھ گچھ ہوگی تو) ہم اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے ساتھیوں کی ہلاکت کے وقت موجود ہی نہیں تھے۔ اور ہم اپنے اس بیان میں بالکل سچے ہیں۔“

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی اور انہیں حضرت صالحؑ کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑا۔ سمجھوتے کی شرط یہ تھی کہ وہ غریبوں کے جانوروں کو خدا کی زمین میں آزاد چرنے دیں اور چشموں سے ان کی باری پر انہیں پانی پینے دیں۔ (۲۶/۱۵۵، ۷۴/۷۵) حضرت صالحؑ نے ان سے کہا کہ تمھارے اس قول و اقرار کے عملی ثبوت کے لئے میں

ایک اونٹنی چھوڑتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ تم اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔ ان لوگوں نے کرنے کو تو یہ اقرار کر لیا لیکن سرمایہ دارانہ ذہنیت اسے کب گوارا کر سکتی تھی کہ جن رزق کے سرچشموں کو وہ اپنی واحد ملکیت سمجھتے تھے۔ ان میں غریب بھی برابر کے حصے دار

نَاقَةُ اللَّهِ

ہو جائیں اور اس طرح ان کی غلامی سے نکل کر آزاد انسانوں کی سی زندگی بسر کرنے لگ جائیں۔ فَخَصَّرُوا النَّاسَ وَغَتَوْا عَنْ أَمْوَالِهِمْ (۷۷/۷۷) انھوں نے اس اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ فَخَلَذَتْهُمْ مَصَاعِقُ الْعَذَابِ الْهُونِ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ۔ (۴۱/۱۷) ذلت اور رسوائی کے عذاب کی ایک کڑک نے انھیں آ پکڑا اور یہ سب کچھ ان کے ان جرائم کی وجہ سے ہوا، جن کے وہ مرتکب ہوتے تھے۔ فَتَلَكَ بَيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا (۲۴/۵۲) سو، دیکھو یہ ہیں ان کے محلات جو ان کے ظلم کی وجہ سے اس طرح ویران پڑے ہیں۔ كَانَتْ تَعْمَلُ خَفَا فِيهَا (۱۱/۶۸) گویا وہ ان میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَايَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ۔ (۲۴/۵۲) ہم نے یہ داستان محض ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے نہیں دہرائی۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو حقیقت کا علم رکھتے ہیں عبرت و موعظت کی بڑی نشانی ہے۔

قوم شعیبؑ | قوم ثمودؑ کے بعد ہمارے سامنے قوم (حضرت) شعیبؑ آتی ہے جو مدین کے علاقہ میں رہتی تھی۔ انھیں بھی حضرت شعیبؑ نے وہی دعوت دی جو اس سے پہلے انبیاء کرامؑ اپنی اپنی قوم کو دیتے چلے آ رہے تھے۔ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا لِلّٰهِ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ (۷۸/۷۸) اس نے کہا کہ اے میری قوم! تم خدا کی ٹھکومی اختیار کرو، اس کے سوا تمھارے لئے کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ قوم کیا کرتی تھی جس سے روکنے کے لئے انہیں خدا کی محکومیت اختیار کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ قرآن کریم نے اسے خود واضح کر دیا ہے۔ جب کہا کہ حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا کہ فَادْفُوا النِّكَلِ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَقْسِدُوا فِى الْاَمْنِ مِنْ بَعْدِ اِصْلَاحِهَا (۷۸/۷۸) ناپ تول پورا رکھو۔ لوگوں کو ان کی چیزیں پوری پوری دو۔ ملک میں ہمواریاں ہو جانے کے بعد ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ آپ نے دیکھا کہ ان کی کون سی غلط روش ہے، جس سے انھیں باز رہنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ وہی روش جو نظام سرمایہ داری کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ اس نظام کی بنیاد اس (باطل) اصول پر ہے کہ جب دو فرد سے چیز تو تو جو کچھ واجب ہو، اس سے زیادہ لو اور جب انہیں دو تو جو کچھ واجب ہے اس سے کم دو۔ یعنی لیتے اور دیتے وقت، ماپ اور تول کے پیمانے مختلف رکھو۔ کسی کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دو۔ یہ تھی ان کی روش جس کے متعلق حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا تھا کہ اَلَا تَتَّقُوْنَ (۲۶/۱۷۷) کیا تم اس روش کے تباہ کن نتائج سے نہیں ڈرتے؟

اس کے جواب میں انھوں نے حضرت شعیبؑ سے کہا کہ ہم نے مذہب کے متعلق اتنا ہی سنا تھا کہ اس کا تعلق پوچا پاٹ اور بندگی اور پرستش سے ہے۔ کسی نے دیوتاؤں کی پوجا کر لی، کسی نے بتوں کی۔ کوئی آگے بڑھا تو اس نے خدا کی پرستش کی دعوت دے دی لیکن یہ تمھارا ”مذہب“

یہ عجیب صلوٰۃ ہے

عجیب ہے جو یہ کہتا ہے کہ ہم اپنے مال و دولت میں بھی اپنا اختیار ادا نہ کریں۔ اسے تو تین خداوندی کے تابع رکھیں۔ قَالُوا يَشْعِبُ اَصْلُوْتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرَكَ مَا يَعْْبُدُ اٰبَاؤُنَا اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْ اَمْوَالِنَا مَا نَشَاۗءُ اِنَّكَ لَآَنْتَ الْحٰلِیْمُ الرَّسِیْمُ (۱۱/۸۴) انھوں نے کہا کہ اے شعیبؑ کیا تیری صلوٰۃ تمہیں اس کا بھی حکم دیتی ہے کہ جن کی عبادت ہمارے بڑے کرتے چلے آئے ہیں ہم ان کی عبادت کریں یا یہ کہ ہم اپنے مال و دولت میں بھی اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں (اور اسے محتاجوں اور ضرورت مندوں کے لئے کھلا رکھیں) بس تم ہی ایک غریبوں کے سردار نرم دل اور راسب بازار انسان رہ گئے ہو؟

لیکن جب حضرت شعیبؑ اپنی دعوت پر اصرار کرتے چلے گئے تو قَالَ الْمَلَا الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يَشْعِبُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَوْمِیْنٰ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا۔ (۱۱/۸۸) قوم کے سرداروں نے جنھیں اپنے مال و دولت پر گھمنڈ تھا، کہا کہ اے شعیبؑ! (دوباتوں میں سے ایک بات ہو کر رہے گی) یا تو ہم تمہیں مجبور کر دیں گے کہ ہمارے مسلک کی طرف لوٹ آؤ اور یا ہم تجھے اور تیرے ساتھیوں کو، جو تمھارے ساتھ اس دعوت پر ایمان لے آئے ہیں، اپنے شہر سے باہر نکال دیں گے۔

آپ نے دیکھا کہ اس دھمکی کے ایک ایک لفظ میں کس طرح دولت اور قوت کی دھمکیاں

بد مستیاں کسوت مینا سے چھلک کر باہر آرہی ہیں؟ اور یہ چیز آج سے تین ہزار برس پہلے بسنے والی قوم مدین ہی سے مختص نہیں۔ دولت اور قوت جب بھی حدود اللہ سے باہر نکلی ہے، اس سے اس قے کم مظاہرے ہوتے ہیں۔ چار ہزار سال پہلے بھی اور آج بھی۔

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی، نہ حریف پنجہ فلک نئے

وہی فطرتِ اسدِ الہی، وہی مرجی وہی عنبری

یہ کچھ تو حضرت شعیبؑ سے کہا اور جو غریب ان کے ساتھ ہولتے تھے انہیں یہ کہہ کر دھمکایا کہ لَبِیْ اَتَّبَعُكُمْ شُعِیْبًا اِنَّكُمْ اِذَا الْخُسُوفُ ذُحَا (۱۱/۹۰) ”اگر تم نے شعبؑ کی پیروی کی تو سمجھ لو کہ تم برباد ہوئے۔“

لیکن حضرت شعیبؑ اپنی دعوت کو برابر پیش کرتے چلے گئے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کی طرف سے اس کی مخالفت بھی بڑھتی چلی گئی۔ کبھی وہ کہتے کہ

يٰشُعَيْبُ مَا نَفَقْتَ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ (۱۱/۹۱)

اے شعیب! جو کچھ تم کہتے ہو، اس میں سے اکثر باتیں ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔ ٹھیک ہے سرمایہ دار کی سمجھ میں یہ بات آیا ہی نہیں کرتی کہ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (۵۳/۳۹) معاوضہ محنت کا ہوتا ہے پلے کا نہیں۔ روپے کا معاوضہ رلو ہے جسے نظام خداوندی حرام قرار دیتا ہے اور کبھی وہ حضرت شعیبؑ سے کہتے کہ اِنَّمَا اَنْتَ مِنَ الْمُسْتَحْسِرِينَ۔ (۲۶/۱۸۵) تم جو ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو تو یہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

لیکن ان کے ان طعنوں اور دھمکیوں سے غلط نظام کے تباہ کن نتائج رک تھوڑے سکتے تھے۔ فَآخَذْتَهُمُ التَّجْفَةُ فَاصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جثثِينَ ۖ الَّذِيْنَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَلْحَقُوْا فِيْهَا (۹۲-۹۱/۷) سو ایک لڑکا دینے والی ہولناکی نے انہیں آلیا اور جب ان پر صبح ہوئی تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے تھے۔ جن لوگوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا تھا (وہ ایسے تباہ ہوئے) گویا وہ ان بستیوں میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ وہ تھے ہی برباد ہونے والے اس لئے کہ

مدبر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو

اس کے بعد ہمارے سامنے وہ سرزمین آتی ہے جو تاریخ کے اس دور میں کشمکش حق و باطل کی سب سے بڑی رزم گاہ قرار پائی

کشمکش کلیمی و فرعون
اور جس میں عصائے کلیمی اور سحر فرعون کا بھرپور ٹکراؤ ہوا۔ مشیت ایزدی کے مطابق حضرت موسیٰؑ کی پرورش فرعون کے محلات میں ہوئی تھی، جہاں انھیں اس بات کے مطالعہ کرنے کا ہنایت عمدہ موقع مل گیا کہ سیاست کی دیسہ کاریاں، اپنے اقتدار و اختیار کو قائم رکھنے کے لئے کیا کچھ کرتی ہیں لیکن ابھی ان کے لئے یہ دیکھنا باقی تھا کہ ارباب قوت خدا کی طرف سے بلا معاوضہ عطا کردہ رزق کے سرچشموں کو کس طرح اپنے قبضے میں رکھتے ہیں۔ اس کا سب سے پہلا موقع اس وقت آیا جب وہ مصر سے بھاگ کر مدین کی طرف گئے ہیں۔ وہ راستے میں سستانے کے لئے ایک

پیاد کے قریب بیٹھ گئے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ چرواہے آتے ہیں اور اپنے جانوروں کو پانی پلا کر لے جاتے ہیں لیکن دولڑکیاں ہیں جو اپنی بھیڑوں کو لئے پیاد سے ایک طرف کھڑی ہیں پیاسی بھیڑیں لپک کر پانی کی طرف جانا چاہتی ہیں لیکن وہ انھیں بار بار روکتی ہیں کہ وہ آگے نہ بڑھنے پائیں۔ حضرت موسیٰؑ کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ وہ اپنے جانوروں کو اس طرح روک کیوں رہی ہیں؟ قَالَ مَا خَطْبُكَ هَٰذَا۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ ان کا ماجرا کیا ہے۔ وہ اپنے جانوروں کو پانی تک کیوں نہیں پہنچنے دیتیں؟

قَالَتْ لَا تَسْقِي حَتَّىٰ يُصَدِّمَ الْمَوْعَاءُ وَابْنُ شَيْخٍ كَسِيو ۝ (۲۸/۲۳) انہوں نے کہا کہ جب تک یہ چرواہے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر نہ لے جائیں، ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں۔ ہمارے گھر میں کوئی زور آور نہیں ہے۔ ہم کمزور لڑکیاں ہیں اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔ اس لئے پیاد پر کمزوروں کے جانوروں کی باری اس وقت آسکتی ہے، جب طاقتوروں کے جانور سیر ہو کر چلے آئیں۔ آخر میں تلچٹ ہمارے مویشیوں کے جھتے میں آجائے گا۔ حضرت موسیٰؑ نے ایک مرد آہ بھری اور دل میں کہا کہ مھر کو چھوڑا تھا کہ وہاں حق والہ صاف کے سچائے قوت و استبداد کا دور دورہ تھا۔ جی میں تھا کہ ایسی سرزمین میں جابوسوں، جہاں کمزوروں کو ستانے والا کوئی نہ ہو لیکن — بہرزمیں کہ رسیدیم آسمان پیدا است — یہاں حالت اس سے بھی بدتر ہے۔ آپ اٹھے۔

فَسَقَىٰ لَهُمَ مَائَهُ قَوَّيْ إِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ إِنِّي لِمَآ أَتَوَلَّيْتُ مِنَ خَيْرِ فَحْيٍ ۝ (۲۸/۲۴) ان لڑکیوں کے جانوروں کو پانی پلایا اور پھر سایہ میں آکر بیٹھ گئے اور اپنے خدا سے عرض کیا کہ (اے دنیا میں تو ہر جگہ دھاندلی ہی دھاندلی ہے) اب تیری طرف سے میری بہتری کے لئے جو کچھ بھی آئے، میں اس کا محتاج ہوں۔ اس کے بعد جب آپ فرعون کی طرف گئے تو اصل مسئلہ ابھر کر سامنے آگیا۔ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۲۶/۲۶) اور ہم نے موسیٰؑ کو اپنے واضح احکام دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔ اس نے ان سے کہا کہ میں اس خدا کی طرف سے پیغامبر ہوں جو تمام اقوام عالم کا نشودنمادینے والا ہے۔ یوں دیکھنے میں تو یہ بات "معصوم" سی نظر آتی ہے لیکن فرعون کی نگہ دور رس نے فوراً بھانپ لیا کہ خدا کی ربوبیت عالمینی پر زور دینے سے حضرت موسیٰؑ کا مقصود کیا ہے؟ چنانچہ اس نے فوراً پوچھا کہ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝ (۲۶/۲۳) رب العالمین کون ہے؟ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤَقِنِينَ ۝ (۲۶/۲۴) موسیٰؑ نے کہا رب العالمین وہ ہے جو کائنات

کی پستیوں اور بلندیوں کا اور جو کچھ اس کے درمیان ہے اس سب کا پالنا ہمارا ہے۔ اگر تم یقین کرنے والے ہو تو اس کی ربوبیتِ عالمینی ہر جگہ نظر آجائے گی۔ پھر حضرت موسیٰؑ نے اس کے درباریوں کی طرف دیکھا اور کہا کہ مَا بَشَرٌ مِثْلُكَ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ (۲۶/۲۶) تمہارا نشوونما دینے والا بھی او تمہارے آباؤ اجداد کا نشوونما دینے والا بھی۔

دربارِ فرعون

اس اجمال کی تفصیل میں انھوں نے کہا کہ

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَوَسَّكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا
وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ط فَاخْرَجْنَا بِهِ أَشْجَارًا مِّنْ ثَمَّاتٍ هَ شَتَّىٰ هَ كُلُّوْا
وَامْرَعُوا لِنَعْلَمَ كُمْ هَ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّعُولِ هَ (۵۴-۵۳/۵)
(میرا رب) وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو بھوننے کی طرح بچھادیا۔ نقل و حرکت کے لئے
اس میں راہیں نکال دیں۔ آسمان سے پانی برسایا۔ اس کی آبپاشی سے قسم قسم کی نباتات پیدا
کی تاکہ تم اسے خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ۔ سوچو کہ اس حقیقت میں عقل و فکر
سے کام لینے والوں کے لئے کیسی کھلی نشانیاں ہیں۔

جب فرعون نے دیکھا کہ حضرت موسیٰؑ کی دعوت کا مقصد یہ ہے کہ رزق کے سرچشمے، انسانوں کے ہاتھ سے چھین کر ان کے حقیقی مالک، خدا کی طرف لوٹا دیئے جائیں تاکہ ان سے نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت کا مقصدِ عظیم پورا ہو، تو اس نے اس کی روک تھام کی تدابیر سوچنی شروع کیں۔ فَخَشَسْنَا دَاوُدَ هَ فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ هَ (۲۳/۴۹) اس نے جگہ جگہ لوگوں کو اکٹھا کر کے منادی کرانی شروع کی کہ لوگو! میں تمہارا سب سے بڑا پرورش کرنے والا ہوں۔ موسیٰؑ کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ تمہارا نشوونما دینے والا کوئی اور ہے۔ دَنَاوِي
فِي قَوْمِهِ قَالَ يَقُوْهُ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكٌ مِّمَّنْ دَاوُدَ اَلَا نَحْمَدُہٗ بِحَسْبِیْ مِنْ نَّحْتِیْ ہ
اَفَلَا بُصِرُوْنَ هَ اس نے اعلانات پر اعلانات شروع کر دیئے کہ لوگو اس شخص کے فریب میں نہ آجانا جو کہتا ہے
کہ دسائیل رزقِ خدا کی ملکیت میں۔ ان پر کسی انسان کا قبضہ نہیں ہو سکتا۔ تم بتاؤ کہ کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں
اور کیا یہ نہریں جو میرے زیرِ اقتدار بہہ رہی ہیں میری ملکیت نہیں؟ کیا تم سوچ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔
اَمْ اَنَّا خَيْرٌ مِّنْ هَٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَہِیْنٌ ہ لَا یَسْکَدُ یُسَیْنٌ ہ (۵۲-۵۱/۴۳) کیا تم دیکھتے
نہیں کہ میں اس سے کہیں بہتر ہوں۔ یہ کمزور اور ذلیل سا انسان جسے کھل کر بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ فَلَوْلَا

اَلْقَىٰ عَلَيْهِ اَسْوَسَۃً مِّنْ ذَهَبٍ اَفْجَاۗءٌ مَّعَهُ الْمَلَآٰئِكَةُ مُقْتَرِنٰٓيْنِ ۝ (۵۳/۴۳)۔
 ”اگر یہ خدا کا فرستادہ اور ایسا عظیم تھا تو اسے سرداری کے نشانات کیوں نہ دیتے گئے۔ اس کے جلو میں فرشتے
 کیوں نہ آتا رہے گئے؟“ اس نے یہ پردہ پیگنڈہ اس زور شور سے کیا کہ قوم کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ ان میں سمجھنے سوچنے
 کی صلاحیت ہی نہ رہی۔ پردہ پیگنڈہ سے مقصود ہی یہ ہوتا ہے کہ عوام کو ایسا (HYPNOTIZED) کر دیا جائے
 کہ وہ نہ اپنے کانوں سے سنیں نہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں، نہ اپنے دل و دماغ سے سمجھیں۔ قرآن کریم میں ہے
 فَاسْتَمَعَتْ قَوْمٌۭۙ فَاَطَاعُوْهُ ۚ (۵۴/۴۳) اس نے اس طرح قوم کو عقل و خرد سے بیگانہ کر دیا اور ان
 کی اطاعت کرنے لگ گئے۔

آپ نے غور کیا کہ یہاں بھی کشمکش وہی تھی جسے ہم اس سے پہلے داعیانِ انقلابِ خداوندی اور ارباب
 دولت و اقتدار کے مابین دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس ضمن میں قرآن کریم نے فرعون کے علاوہ، دینِ خداوندی کے
 ایک اور مخالف کا بھی ذکر کیا ہے جو دنیا میں آج تک نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ
 کی حیثیت سے متعارف ہے، یعنی قارون۔ فرعون تو پھر بھی بنی اسرائیل پر ظلم

قَارُون

ستم کرتا تھا جو غیر قوم کے افراد تھے لیکن قارون خود بنی اسرائیل میں سے تھا اور اپنی کا خون چوستا تھا۔
 سرمایہ پرستی میں ”معبود“ پیسہ ہوتا ہے جو اپنے اور بیگانے میں قطعاً تمیز نہیں کرتا۔ قارون نے بے حد و شمار دولت
 جمع کر رکھی تھی اور اس کا اسے گنہندہ تھا (۲۸/۷۶) اس کی قوم نے اس سے کہا کہ وَتَبْتَغِ فِیْہِۭآ اٰتٰکَ
 اللّٰہُ الْمَدَآئِنَ الْاٰخِرَۃَ ۚ وَلَا تَمْسَسْ کَیْۤیۡتَۤبَکَ مِنَ الدُّنْیَا دَآخِرِیۡنَ کَمَا

اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ وَلَا تَبْتَغِ الْفَسَادَ فِی الْاٰمِنِ مِنْ طٰٓئِفَۃٍ الدُّشَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیۡنَ ۝
 (۲۸/۷۷) جو کچھ تجھے خدا نے دے رکھا ہے اسے محض اپنی طبعی زندگی تک ہی محدود نہ رکھ۔ اس سے مستقبل
 کی سرفرازی کی بھی جستجو کر۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ تم تارک الدنیا ہو جاؤ۔ دنیاوی زندگی میں بھی اپنے حصہ کا خیال رکھو۔
 لیکن اسے مقصود و منہتی نہ بناؤ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ نے تمہیں اتنا کچھ دے کر تمہاری ہر طرح کی
 کمی پوری کر رکھی ہے، اسی طرح تم دوسرے انسانوں کی کمی پوری کرنے کی فکر کرو اور دولت کو ایک جگہ اکٹھا کر کے
 معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے کے درپے نہ ہو۔ یہ چیز قانونِ خداوندی کی رو سے بڑی ہی ناپسندیدہ ہے۔

اس نے یہ سنا اور نہایت طنز آمیز لہجہ میں کہا کہ ’تم نے یہ کیا کہا کہ مجھے خدا نے یہ کچھ دے رکھا ہے؟
 اِنَّمَا اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِندِی (۲۸/۷۸) یہ سب کچھ مجھے اپنی ہنرمندی کی بدولت ملا ہے۔

اس میں خدا کا کیا ہے جو میں اسے اس کے قوانین کے مطابق صرف کروں۔

آپ نے غور کیا کہ قارون کا یہ جواب کس طرح اس ذہنیت کی آئینہ داری کر رہا ہے جو نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے۔ قرآن میں بتاتا ہے کہ جس طرح اس کشمکش میں فرعون اور اس کا لشکر غرق ہو گیا، اسی طرح قارون اور اس کی دولت بھی زمین میں دھنس گئی۔

فَخَسَفْنَا بِهِ وَابْنَهُ الْأَرْضَ صَفًّا فَمَا كَانَ لَهُ مِنْ خَشْيَةٍ
يَنْصُرُوهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُتَشَفِّعِينَ (۲۸/۸۱)

سو ہم نے اسے اور اس کی محلِ سدا کو زمین میں دھنسا دیا۔ پھر نہ تو کوئی جماعت ایسی ہوئی جو قانونِ خداوندی کے خلاف اس کی مدد کر سکتی اور نہ ہی وہ اپنی تدابیر سے اپنی ہی کچھ مدد کر سکا۔

یہ ہے ”دینِ خداوندی کے مخالفین“ کا وہ پہلا گروہ جس کا قرآن نے تفصیلی ذکر مختلف اقوامِ سابقہ کے سلسلہ میں متعدد مقامات میں کیا ہے اور جس کے متعلق اجمالی

تمام انبیاء کی مخالفت

طور پر کہا ہے کہ

وَمَا آتَيْنَا فِي قَصِيَّةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالُوا مَثَرُفُوْهُمَا لَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَاْفِرُونَ هَ ذَقَانُوا لَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالِ ذَآوِلَادَا لَا ذَمَّا نَحْنُ بِمُعَذِّبِينَ (۳۵-۳۷/۳۵)

اور ہم نے کسی بستی میں بھی اپنا پیغامبر نہیں بھیجا، جس نے ان لوگوں کو ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا ہو اور وہاں کے دولت مند طبقہ نے اس سے یہ نہ کہا ہو کہ جو دعوت تم لے کر آتے ہو، ہم اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے اس انکار کی وجہ یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس اس قدر دولت ہے اور ہمارے خاندان کے افراد بھی اتنے زیادہ ہیں۔ پھر کون ہے جو ہم پر گرفت کر کے کوئی آفت لا سکے۔

یعنی قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ خدا کی دعوت جب اور جہاں بھی آئی، سرمایہ دار طبقہ نے سب سے پہلے اس کی مخالفت کی اور مخالفت و لائل و براہین کی بنا پر نہیں، بلکہ محض اپنی دولت اور قوت کے گھمنڈ پر کی۔ یہی کچھ انبیائے سابقہ کے ساتھ ہوا اور یہی کچھ خدا کے آخری نبی اور کائنات کے عظیم القدر داعیِ انقلاب، حضورِ رسالت

نبی اکرم

نبی اکرم | مآب کے ساتھ۔ یہاں بھی مخالفت اسی گروہ کی طرف سے شروع ہوئی، جس کے گہر دلت سے بھرے ہوئے تھے۔ وَأَنْطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنْ آمَشُوا وَأَضْبُوا عَلٰی اِبْهَتِكُمْ عَطَانٌ هَذَا كَسْنَى مُتَرَادٍ عَطَانٌ (۳۸/۶) ان میں سے اکابرین قوم کہنے لگے کہ چلو اپنے معبودوں کی پرستش پر ثابت قدمی سے جمے رہو۔ یقیناً یہ کوئی سوچی سمجھی اسکیم ہے (جس کی رو سے یہاں کوئی عظیم انقلاب لانے کی کوشش کی جا رہی ہے)۔ چنانچہ اسی طبقے کا وہ نمائندہ تھا، جس کی شدید مخالفت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے کہا کہ تم اس کی چیرہ دستیوں اور وسیع کاریوں سے مت گھبراؤ۔ ذُنَابِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۚ لَا وَجَعْتُ لَهُ مَالًا هَمْدُودًا ۚ لَا ذَبِينَ شُهُودًا ۚ وَمَهَّدْتُ لَهُ تَمْهِيدًا ۚ لَا تَمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَنَابِيَدَ قَلًا ۚ اِنَّهُ كَانَ لِاٰيَاتِنَا عَيْنِدَا ۝ (۱۶۔۱۷)

یہ وہ شخص ہے کہ جب یہ پیدا ہوا تو ساتھ کچھ نہیں لے کر آیا تھا۔ پھر ہم نے اسے بڑی کثرت سے مال و دولت دیا اور وہ بیٹھے دیئے جو (امیر زادوں کی طرح) ہر وقت گھر میں بیٹھے گٹھ جوڑ کر رہتے ہیں۔ غرضیکہ ہم نے اس کے لئے زندگی کی آسائشوں کے راستے ہموار کر دیئے لیکن اس کی ہوس کی تسکین نہ ہوئی اور یہ چاہتا ہے کہ ہم اسے اور زیادہ دولت اور قوت دیتے چلے جائیں لیکن اب ایسا نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے کہ یہ اس دولت اور قوت کو ہمارے قوانین کے مطابق صرف کرنے کے بجائے، اٹا ان کی مخالفت پر اتر آیا ہے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ اسے ہمارے قانون مکافات کے حوالے کرو۔ وہ اس سے خود پرٹ لے گا۔ ان مترفین

قریش کو تنبیہ | قریش کے متعلق، جو اپنی دولت کے نشے میں بدمست، اس انقلابی دعوت

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِهِمْ ط

کیا ان لوگوں نے ادھر ادھر چل پھر کر نہیں دیکھا کہ جن قوموں نے ان سے پہلے ایسی روش اختیار کی تھی ان کا انجام کیا ہوا؟

كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَامُ الْأَثَامِ وَعَمْرُؤُهَا أَكْثَرُ مِمَّا
عَمْرُؤُهَا. وہ قومیں، قوت و شوکت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ ان کی زمینیں ان سے
زیادہ پیداوار دیتی تھیں۔ ان کی آبادیاں ان سے زیادہ معمور تھیں۔ وَجَاءَتْهُمْ مِنْ سُلَيْمٍ بِالْبَيْتِ

ان کے پاس اس کے رسول واضح قوانینِ خداوندی لے کر پہنچے۔ (انھوں نے اس کی بات نہ مانی اور اپنے جرائم کی پاداش میں تباہ و برباد ہو گئے) یاد رکھو۔ خَمَاكَانَ اللّٰهُ يَظْلِمُهُمْ وَلَٰكِن كَاذِبُ الْفٰسِقِیْنَ (۳۰/۹) خدا نے انھیں یوں ہی ناحق تباہ نہیں کر دیا۔ انھوں نے خود اپنے ہاتھوں آپ کو تباہ و برباد کیا۔

دوسری جگہ ہے۔ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ مَّ بَطَرَتْ مَعِيشَتُهَا فَتِلْكَ مَسْكَنُهَا لَمَّا تَرْكَنَ مِنْ بَعْدِ هِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ط وَكُنَّا نَخْنُ اَنْوَارِثِیْنِہ (۲۸/۵۸) ان سے کہو کہ ذرا تاریخ کے اوراق پر غور کرو اور دیکھو کہ کتنی بستیاں ایسی تھیں جو اپنی معاشی فراوانیوں پر اس قدر نازاں تھیں۔ سو دیکھو! یہ ان کے مکانات ہیں جو معدودے چند کے علاوہ ان کے بعد آج تک آباد نہیں ہوئے اور ان سب کے وارث اور مالک ہم ہی ہو گئے۔ سو جو کچھ ان کے ساتھ ہوا، وہی کچھ ان کے ساتھ ہوگا۔ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۵ (۶/۲۱) اس کا قانون یہی ہے کہ دوسروں پر زیادتی کرنے والوں کی کیفیت کبھی پروان نہیں چڑھا کرتی۔

اور دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ مترفین بھی بالآخر تباہ و برباد ہوئے۔ وَمَا اَغْنٰی عَنْہُ مَالُہٗ وَمَا کَسَبَ۔ (۱۱۱/۸) اس گروہ کا مال و دولت اور کسب و ہنر ان کے کسی کام نہ آ سکا۔

دوسرا گروہ

دینِ خداوندی کے مخالفین کے گروہ اول کے کوائف آپ کے سامنے آ گئے۔ یہ گروہ ان سربراہ پرستوں کا ہے جن کے انسانیت سوز معاشی نظام کے خلاف، آسمانی دعوت ایک کھلے ہونے چیلنج کا حکم رکھتی ہے۔

دینِ خداوندی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو علم و بصیرت کی رو سے پیش کرتا اور دلائل و براہین کی تائید سے منواتا ہے۔ وہ عقل و فکر کو دعوت دیتا اور غور و تدبر سے کام لینے کی تاکید کرتا ہے۔ یہ دعوت ان لوگوں کے مفاد کے خلاف جاتی ہے جو عوام کی جہالت اور توہم پرستیوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ عقل و فکر سے کام نہ لیں بلکہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے، آنکھیں بند کر کے اس پر چلتے جائیں۔ لہذا اس گروہ کی طرف سے بھی دینِ خداوندی کی سخت مخالفت ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اس گروہ کا ذکر

بھی بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ حسب معمول اس کشمکش کی ابتداء حضرت نوحؑ کی دعوت سے کرتا ہے۔

قوم نوحؑ | اَعْلُوهُ ۙ اَعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهِ غَيْرُهُ (۲۳/۲۳) اے میری قوم! تم اللہ کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا۔ مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ۔ (۲۳/۲۴) ہم نے اپنے آباؤ اجداد میں سے کسی سے یہ بات نہیں سنی۔ اس لئے ہم اسے سنے کے لئے تیار نہیں یعنی انہوں نے یہ نہیں کہا کہ جو کچھ تم کہتے ہو، اس میں ہمیں فلاں غلطی یا سقم نظر آتا ہے۔ کہا یہ کہ جس راستے کی طرف تم بلا تے ہو، وہ راستہ ہمارے اسلاف کے راستے کے خلاف ہے۔ اس لئے ہم اسے اختیار کرنا نہیں چاہتے۔ آپ سے یہ کہا اور عوام میں مشہور کر دیا کہ (معاذ اللہ) اس شخص کا دماغ خراب ہو گیا ہے جو یہ اس قسم کی ہلکی ہلکی باتیں کر رہا ہے۔ إِنَّ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ كِبَرَتْ جَنْتُهُۥ فَتَوَلَّوْا بِهِ حَتَّىٰ حَبِطَ (۲۳/۲۵) انہوں نے کہا کہ یہ شخص پاگل ہو گیا ہے۔ سو تم کچھ دنوں تک انتظار کر کے دیکھ لو کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ قَالُوا مَجْنُونٌ وَاتَّبَعَهُ دُجْرٌ (۵۴/۹) لوگوں میں مشہور کر دیا کہ یہ پاگل ہے اور پھر اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے، اسے ڈانٹ کر نکال دیا۔

حضرت ہودؑ | حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ آتے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی قوم کو خدا کی محکومیت اختیار کرنے کی دعوت دی۔ اس کے جواب میں انہوں نے بھی یہی کہا کہ اَجِئْنَا لِنَعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ تَحْتِ بَنَاتِنَا يَعْْبُدُ آبَاؤُنَا (۱۱/۶۱) کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہم اکیلے خدا کی عبادت اختیار کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں، جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے تھے؟ حضرت ہودؑ نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا وہ علم و بصیرت اور عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اَتُجَادِلُونِي فِيْ اَسْمَاءِ سَمِيْعَتُهُمْ هَآ اَنْتُمْ وَاَبَاؤُكُمْ قَالُوا نَزَّلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ط (۱۱/۶۱) جن چیزوں کی بنا پر تم مجھ سے جھگڑتے ہو، ان کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ چند نام ہیں جو تم نے یا تمہارے بزرگوں نے وضع کر رکھے ہیں۔ ان کے لئے خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ آپ غور کیجئے کہ کتنی بڑی حقیقت ہے جسے چند الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے؟ قرآن کہتا ہے اس طبقہ کے ہاں جس چیز کو روایتی عظمت اور موثر ترقیوں کہا جاتا ہے وہ کیا ہے؟ فقط اس قدر کہ ابتداء میں جہالت اور توہم پرستی سے کوئی عقیدہ قائم ہو گیا اور اسے کسی

کی طرف منسوب کر دیا۔ جب وہ دو چار نسلوں تک متواتر آگے بڑھا تو وہ نام اس قدر مقدس ہو گئے کہ ان کے خلاف ایک لفظ سننا بھی گوارا نہ رہا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ کسی عقیدہ یا روش کے صحیح ہونے کی یہ کوئی دلیل نہیں سوال یہ ہے کہ اسے خدائی سند بھی حاصل ہے یا نہیں؟

حضرت صالحؑ | حضرت ہوؤ کے بعد قوم ثمود کی طرف حضرت صالحؑ تشریف لاتے۔ انہوں نے بھی وہی دعوت خداوندی پیش کی۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا۔ قَالُوا لِيُصْلِحْ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَذَا۔ انہوں نے کہا اے صالحؑ! پہلے تو تو ایسا آدمی نہیں تھا۔ تجھ سے ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن اب یہ ایک دم تجھے کیا ہو گیا کہ اَنْتُمْ لَنَا اَنْتُمْ لَنَا نَعْبُدُ مَا يَعْْبُدُ اَبَادُؤُنَا۔ کہ تو ہمیں ان کی محکومی و اطاعت، بھگتی اور پرستش سے روکتا ہے، جن کی پرستش و اطاعت ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں۔ قَرَأْنَا لَيْفِي شَجَرَةٍ مِمَّا تَدْعُوْنَكَ اِلَيْهِ هَرَبْنَا مِنْ هَرَبْنَا (۱۱/۶۳) جس بات کی طرف تم دعوت دیتے ہو، اس کی صداقت میں ہمیں بڑا شک ہے۔ وہ ہمارے دل میں اُترتی نہیں۔ ہم اس کے سوا اور کیا سمجھیں کہ اِنْحَا اَنْتَ مِنَ الْمُسْحَرِيْنَ (۲۶/۱۵۳) تجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہے جو تو اس قسم کی باتیں کرنے لگ گیا ہے۔

معمارِ حرمؑ | حضرت صالحؑ کے بعد ہمارے سامنے 'سما ہر حرم' حضرت ابراہیمؑ کا تذکرہ جلیلہ آتا ہے۔ بُت پرستی ان کی قوم کا شعار تھا۔ انہوں نے اس کے خلاف دعوت توحید دی۔ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ دَعُوْهُ مَا هِيَ اِلَّا اَتِيْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَ (۲۱/۵۲) انہوں نے اپنے والد اور قوم سے کہا کہ یہ کیا مورتیاں ہیں جن پر تم اس طرح جھے بیٹھے ہو؟ خدا کا نام تو ایک طرف، کیا تمہیں اپنے مقام کا بھی کچھ اندازہ نہیں؟ اس کے جواب میں انہوں نے کہا۔ قَالُوا اَوْجَدْنَا اَبَاءَنَا لَهَا عَابِدِيْنَ (۲۱/۵۳) انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو انہی کی پوجا کرتے دیکھا ہے۔ اس لئے ہم بھی انہی کی تقلید کر رہے ہیں۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے کہا۔ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاَبَاؤُكُمْ فِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (۲۱/۵۴) یقین جانو تم اور تمہارے ابا و اجداد سب کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اَفَرَأَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ اَنْتُمْ وَاَبَاؤُكُمْ الْاَوْثَادُ مَوْنٌ (۲۶/۵۵-۵۶)

انہوں نے کہا کہ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ جن چیزوں کی تم اور تمہارے آباؤ اجداد پرستش کرتے ہو، ان کی حقیقت کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ مذہب کے معاملات ہیں۔ ان سے غور و فکر کا کیا واسطہ؟ قَالُوا بَلْ وَحَدَّثَنَا آيَا عَنَّا كَذَلِكَ يَفْعَلُونَ (۲۶/۴۴) ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا کہ وہ ایسا کیا کرتے تھے۔ ہم بھی ویسے ہی کرنے لگ گئے۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے ان "مقدسین" کی دکھتی رگ کو چھیڑا اور کہا کہ میں خوب جانتا ہوں کہ تم نے یہ مسلک کیوں اختیار کر رکھا ہے۔ تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ جو مسلک تمہارے اسلاف سے چلا آرہا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور جن معبودوں کی تم، ان کے نام کی نسبت سے پرستش کرتے ہو ان کی حیثیت کیا لیکن اِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (۲۹/۲۵) ان کی وجہ سے تمہارا جھگڑہ قائم رہتا ہے اور جھگڑے کے قائم رہنے سے تمہیں دنیاوی مفاد حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ہے سارا راز اس تقدیس و تعظیم کا۔ آپ نے غور کیا کہ حضرت ابراہیمؑ نے ان چند الفاظ میں کتنی بڑی حقیقت کو واشگاف کیا ہے؟

جب ان مقدسین کے طائفہ نے دیکھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں ان کی تقدیس کے پرے چاک ہو رہے ہیں تو انہوں نے قوم کے جذبات کو بھڑکایا۔ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ اِلَّا اَن قَالُوا اَقْتُلُوْهُ اَوْ حَبِّسُوْهُ (۲۹/۲۴) انہوں نے عوام سے کہا کہ ابراہیمؑ کو مار ڈالو، اسے زندہ جلادو۔ حَبِّسُوْهُ وَالْاَنْصُرُوْا آلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ۔ (۲۱/۶۸) اگر تم میں کچھ بھی ہمت ہے تو اسے جلادو اور اس طرح اپنے معبودوں کا بول بالا کرو۔

کوئی دلیل نہیں، کوئی برہان نہیں۔ بس عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیا اور خوش ہولتے کہ ہم نے میلان مار لیا ہے۔

حضرت شعیبؑ | حضرت ابراہیمؑ کے بعد ہمارے سامنے حضرت شعیبؑ آتے ہیں۔ انہوں نے بھی وہی دعوتِ خداوندی پیش کی اور اس کے جواب میں ان کے سامنے بھی وہی

مسلک اسلاف کی دلیل لائی گئی۔ قَالُوا اِلٰهَ شُعَيْبٍ اَصْلٰوْتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ تَشْرَكَ مَا يَغْبُدُ اَبَاؤُنَا (۱۱/۸۴) انہوں نے کہا کہ اے شعیبؑ! کیا تیری صلوٰۃ تجھے اس کا بھی حکم دیتی ہے کہ تم ہم سے آکر کہو کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں، جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ (معاذ اللہ) تمہارا

دماغ ٹھکانے نہیں رہا۔ قَالُوا اِنَّكُمْ اَنْتُمْ مِنَ الْمُنْصَحِينَ (۲۶/۱۸۵) تم پر کسی نے جادو ٹونہ کر دیا ہے جادو! اپنا علاج کراؤ۔

حضرت موسیٰؑ کشمکش کلیسی و فرعون میں یہ چیز ایک اور ہی پہلو سے سامنے آتی ہے، جس سے نظر آتا ہے کہ ملوکیت کی دسیہ کاریاں اپنی مطلب برآری کے لئے کیا

کیا حربے اختیار کرتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

(اَنْ) اَمْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَآءِیْلَ (۲۶/۱۷)

بنی اسرائیل کو اپنی محکومی کی زنجیروں سے آزاد کر کے ہم دونوں بھائیوں کے ساتھ بھیج دے۔

فرعون نے پہلے تو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اور ہنج سے گفتگو شروع کی لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس طرح وہ قابو میں نہیں آسکتے تو اس نے ایک تدبیر اور سوچی۔ فرعون کے ارد گرد اس کے امراء اور وزراء اور دیگر سردار قوم جمع تھے۔ وہ قوم خود بھی مشرک تھی اور اس کے آباء و اجداد بھی باطل پرست تھے۔ فرعون کو اس کا اچھی طرح علم و احساس تھا کہ ان کے متعلق حضرت موسیٰؑ کا خیال کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے جھٹ سے پہلو بدلا اور حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ یہ باتیں تو بعد میں ہولیں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ خَمَابَالُ انْقَرُؤِنِ الْاَوَّلٰی (۲۰/۵۱) جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں وہ کس حال میں ہیں؟ یعنی ان لوگوں کے آباء و اجداد جنت میں ہیں یا جہنم میں؟ سوال آپ نے دیکھ لیا اور یہ بھی بھانپ لیا کہ فرعون کا اس سے مطلب کیا تھا؟ لیکن اسے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ اسے معاملہ کس شخص سے پڑ رہا ہے! وہ خدا کے پیغمبر تھے۔ انہوں نے کہا۔ قَالَ عَلِمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ کِتَابٍ لَا یُضِلُّ اَنْ کَالْعِلْمِ مِیْرَ رَبِّیْ کے پاس نوشتہ کے اندر ہے۔ ان کا معاملہ میرے ساتھ نہیں، خدا کے ساتھ ہے اور خدا وہ ہے کہ لَا یُضِلُّ رَبِّیْ دَلَالَیْنَسٰی۔ (۲۰/۵۲) وہ غلطی کر سکتا ہے اور نہ ہی کچھ بھول سکتا ہے۔ اس لئے اس بات کو چھوڑو اور مجھے یہ بتاؤ کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیجتے ہو یا نہیں؟

جب فرعون نے دیکھا کہ اس کا یہ تیر بھی خطا گیا تو اس نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ آپ کی دعوت کا متعلق مذہب سے ہے، سیاست سے نہیں۔ اس لئے کہ آپ بار بار خدا کو پنج میں لارہے ہیں۔ لہذا آپ کا مقابلہ ہماری مملکت کے (HEAD- PRIEST) ہامان کے ساتھ ہوگا۔ چنانچہ ہامان اپنے تمام لاؤشکر سمیت مقابلہ کے لئے آیا۔ اس نے قوم کے جذبات اسلاف پرستی کو مشتعل کرنے کے لئے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ

أَجْنَدْنَا لَتَلْفِتَنَّا عَمَّا وَحَيْدًا نَاعِلِيْهِ اِيَّا عَنَا - (۱۰/۷۸) کیا تم اس لئے ہمارے پاس آتے ہو کہ جس راستے پر ہم نے اپنے باپ دادا کو چلتے دیکھا ہے اس سے ہمیں ہٹا دو۔ انہوں نے یہ کچھ کہا اور ادھر فرعون نے اہل دربار میں یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ اِنَّ سَؤْلَكُمْ الَّذِيْ اَمْرًا سِيْلَ اِلَيْكُمْ لَمْ يَجْتُوْا (۲۶/۲۷) یہ جو تمہاری طرف پیغامبر بنا کر بھیجا گیا ہے، یہ (غاکم بدین) پاگل ہے۔
اُسی ساز کہن کی صدائے بازگشت

حضور خاتم النبیین اب آپ اس دور کی طرف آتے جس میں خدا کا آخری پیغام، ہر قسم کی غلامی کے لئے پیامِ مرگ بن کر آیا تھا جو دعوتِ حضرت نوحؑ سے لے کر مختلف انبیائے کرامؑ کی وساطت سے وقتاً فوقتاً دی جاتی رہی تھی، اسے اس کی مکمل شکل میں، نبی اکرمؐ نے پیش کیا اور اس گروہ کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ اس کی مخالفت کی ”دلیل“ بھی وہی تھی۔ یعنی مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي الْاِمْلَةِ الْاٰخِرَةِ۔ اِنَّ هٰذَا اِلَّا اَخْتِلَافٌ (۳۸/۷) ہم نے اسے پچھلے مذہب و ملت میں کہیں نہیں سنا۔ یہ محض بتائی ہوئی بات ہے۔ یعنی سچائی وہی ہوگی جو اس روش کی تائید کرے جو ان کے اسلاف سے متوارث چلی آرہی تھی۔ جو بات اس روش کے خلاف ہوگی، وہ وضعی اور جھوٹی ہوگی۔ جب نبی اکرمؐ اپنی قوم کے سامنے قوانینِ خداوندی پیش کرتے تو یہ گروہ آگے بڑھتا اور لوگوں سے کہتا کہ مَا هٰذَا اِلَّا سَاجِلٌ يُؤْتٰنَا اَنْ يَقُوْلُوْا كَمَا عَمَّا كَانَ يَعْْبُدُ اٰبَاؤُكُمْ (۳۲/۲۳) اس شخص کا ارادہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ جن چیزوں کی پرستش تمہارے آباؤ اجداد کرتے چلے آ رہے ہیں، تمہیں ان سے روک دے۔ اس لئے تم اس کی کوئی بات نہ ماننا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کسی نے ایک مرتبہ اس پیغامِ خداوندی کو دل کے کانوں سے سُن لیا تو وہ اس کی صداقت کا قائل ہو جائے گا۔ اس لئے وہ اپنے متبعین کو تاکید کرتے تھے کہ

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقَوْمِ اِنْ وَاخَذُوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ — (۲۶/۲۷) تم اس قرآن کو ہرگز نہ سنا۔ یہ جہاں بھی پیش کیا جا رہا ہو، تم شور مچا دو۔ نہ خود سنو نہ کسی اور کو سننے دو۔ بس یہی ایک طریقہ ہے، جس سے اس کا امکان ہو سکتا ہے کہ تم اس آواز کو دبا سکو۔ قرآنِ کریم بار بار اس حقیقت کو دہراتا ہے کہ وہ لوگ، اس پیغامِ خداوندی کی مخالفت کسی دلیل و برہان کی بنا پر نہیں کرتے بلکہ صرف یہ کہہ کر کرتے ہیں

کہ یہ ان کے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا آتَيْنَا عَلَيْنَا

”جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس کی پیروی کرو جسے خدا نے نازل کیا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی کی پیروی کرتے رہیں گے، جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا ہے“

اور قرآن کہتا ہے کہ

أَذْكُرَكَ أَنْ آتَاؤُهُمْ لَا يَخْلَتُونَ شَيْئًا وَلَا يَحْتَدُونَ (۲/۱۷۰)

خواہ ان کے اسلاف نہ کچھ عقل و فکر رکھتے ہوں اور نہ ہی صحیح راستے پر چل رہے ہوں، یہ پھر بھی انہی کا اتباع کرتے جائیں گے۔ یہ اس لئے کہ اسلاف پرستی کی ذہنیت اسے تسلیم کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتی کہ ان کے آباؤ اجداد عقل و فکر نہیں رکھتے تھے یا غلط راستے پر چلتے تھے۔ غلط اور صحیح راستے پر چلنے کا اختیار تو وہ کرے جو عقل و فکر سے کام لے۔ جب انہیں عقل و فکر سے کام لینے کے لئے کہا جاتا تو ان کا وہی ایک جواب ہوتا کہ إنا وجدنا آباءنا على أمةٍ وانا على آئمتهم فمحدثون (۴۳/۲۲) ہم کچھ سننا نہیں چاہتے۔ ہم نے جس طریقے پر اپنے اسلاف کو پایا ہے، ہم اسی پر چلتے جائیں گے۔ حَسْبُنَا مَا دَجَبَدْنَا عَلَيْهِ أَبَاؤُنَا ط _____ (۵/۱۰۴) ہمارے اسلاف کا طریقہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اس پر پھر قرآن یہ کہتا کہ أَذْكُرَكَ أَنْ آتَاؤُهُمْ لَا يَخْلَتُونَ شَيْئًا وَلَا يَحْتَدُونَ ۵ (۵/۱۰۴) خواہ تمہارے اسلاف کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور نہ ہی خدا کے تجویز کردہ راستے پر چلتے ہوں، پھر تم بھی انہی کے نقش قدم پر چلتے جاؤ گے؟ ان کے پاس اس کا جواب (معاذ اللہ) گالیوں کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟۔ (خاکم بہ دہن) ”پاگل“ ہے۔ (۶۸/۵۱) اُس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ (۱۴/۲۴) بَلْ قَالُوا أَتُحَدِّثُ أَخْلَاقًا بَلْ أَتُوا لِيُفْتَرُوا عَلَىٰ كُنْهُوَ شَاعِرٌ ۚ (۲۱/۵) یہ اس کے خواب و خیال کی باتیں ہیں۔ اس کے من گھڑت دعوے ہیں۔ محض شاعری ہے۔ یہ کذاب ہے۔ (۳۸/۴) یہ جہاں کوئی بات کرے اس کا مذاق اڑاؤ (۴۱/۲۶) لوگوں سے کہو کہ۔ أَهْلَكَ الَّذِي بَحَثَ اللَّهُ مَسْئُولًا۔ (۲۵/۲۱) ذرا دیکھنا! یہ ہے وہ جو کہتا ہے کہ مجھے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟

یہ ہے وہ اندازِ مخالفت جو حق و صداقت کی آواز کے خلاف اس گروہ کی طرف سے اختیار کیا جاتا رہا ہے۔

_____ ہر زمانے میں اور ہر مقام پر۔ _____

مترفین کے دونوں گروہ | دینِ خداوندی کے مخالفین کے دونوں گروہ آپ کے سامنے آگئے ایک گروہ سرمایہ داروں کا جو دولت کی بنا پر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے

لیتے ہیں اور دوسرا گروہ ان لوگوں کا جو عوام کو جہالت کی تاریکیوں سے نکلنے نہیں دیتے۔ قرآن کریم نے ان دونوں کو مترفین کہا کہ پکارا ہے، یعنی وہ لوگ جو دوسروں کی کمائی پر خوش حالی اور تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہیں چنانچہ ان میں سے پہلے گروہ کے متعلق کہا کہ

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ۚ وَقَالُوا إِنَّا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَطَرَا
نَحْنُ بِمُعَذِّبِينَ - (۳۵-۳۴/۳۳)

اور ہم نے کسی بستی میں بھی کوئی نذیر نہیں بھیجا مگر اس کے مترفین نے یہ کہا کہ جو کچھ تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے، ہم اس سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے کہ ہمارا اتنا بڑا قبیلہ اور جتھے ہمارے پاس اس قدر مال و دولت ہیں کون سزا دے سکتا ہے۔

یہ سرمایہ داروں اور اربابِ اقتدار کا طبقہ ہے۔ دوسرے گروہ کے متعلق فرمایا۔

وَكَذَٰلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ مُّقْتَدُونَ ۚ (۳۳/۳۳)

اور اسی طرح (اے رسول!) ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا مگر وہاں کے مترفین نے کہا کہ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک طریقہ پر چلتے دیکھا ہے اور ہم انہیں کے نقوشِ قدم پر چلتے جائیں گے۔

اس مخالفت کا مطلب | واضح رہے کہ اسلام سرمایہ داری کی مخالفت کرتا ہے تو اس لئے

انہیں کہ یہ بھک منگوں، سادھوؤں، سنیاسیوں، سارک الدنیا راہبوں، مفلسوں، ناداروں، فاقہ کشوں کا مذہب ہے۔ اسلام کائنات کی تمام قوتوں کو مستحضر کرنے کی تعلیم دیتا ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ ان قوتوں کے ماحصل کو قوانینِ خداوندی کے مطابق، نفع انسان کی منفعیت عامہ کے لئے صرف کیا جائے۔ وہ زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرنے کا حکم دیتا ہے لیکن وہ دولت کی تقسیم اس طرح کرتا ہے کہ نہ افراد کے پاس ان کی ضروریات سے زیادہ دولت جمع رہتی ہے اور نہ ہی کوئی فرد ضروریاتِ زندگی سے محروم رہتا ہے۔

وہ ایسا نظام متشکل کرتا ہے، جس میں وسائلِ رزق، نوعِ انسان کی عالمگیر بوبیت، (پرورش) کے لئے وقف ہوتے ہیں۔ یہی وہ نظام ہے، جس کی مخالفت سرمایہ داروں کی طرف سے ہوتی ہے۔

دوسری طرف جب وہ گردہ ثانی کی مخالفت کرتا ہے تو اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ جو کچھ چلا آرہا ہے، اس کی محض اس بنار پر مخالفت کرو کہ وہ پیچھے سے منتقل ہو کر کیوں آرہا ہے؛ وہ اس ضمن میں جو کچھ کہتا ہے، وہ اس کے ایک نکتہ میں پنہاں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ** (۳۱/۳۱) — جب ان سے کہتا جاتا ہے کہ اس کا اتباع کرو جو خدا نے نازل کیا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس کا اتباع کریں گے، جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ مطلب صاف ہے کہ جو کچھ تمہارے آباؤ اجداد سے منتقل ہو کر آیا ہے، اسے **مَا أَنْزَلَ اللَّهُ** کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھو۔ جو اس پر پورا اترے اسے قبول کر لو، جو اس کے خلاف جائے اسے مسترد کر دو۔ قرآن کریم کا لفظ **مَا سَكَمَ** یہ ہے کہ ہر فرد اور ہر نسل اپنے اعمال کی خود ذمہ دار ہے۔ اس لئے ہر وہ روش جس میں اس ذمہ داری کو دوسروں کی طرف منتقل کرنے کا رجحان پایا جائے، غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ہر دور کے افراد سے ان کے آباؤ اجداد کے متعلق کہہ دیا کہ **تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ. لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ. وَلَا تَسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ** (۲/۱۴۱) یہ لوگ اس دنیا سے چلے گئے۔ جو کچھ انہوں نے کیا اس کی ذمہ داری ان پر ہے، جو تم کرو گے اس کی ذمہ داری تمہارے سر ہوگی۔ تم سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا تھا۔ یہ قطعاً نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے آباؤ اجداد نے کیا کیا اور کیا کہا تھا؛ لہذا تم یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکو گے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کی پیروی کرتے رہے، اس لئے ہم اپنے بکنے کے ذمہ دار نہیں۔ جو کچھ تم کرو گے اس کی ذمہ داری تمہارے سر ہوگی۔ اس لئے تمہیں خود سوچنا چاہیئے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، وہ کتاب اللہ کے مطابق ہے یا نہیں۔ قرآن کریم کو ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھنے سے مقصد ہی یہ تھا کہ ہر شخص پرکھ سکے کہ اس کا عمل اس کے مطابق ہے یا نہیں؟

اسلام کیلئے؟

(تقریر)

اپریل ۱۹۶۲ء

اسلام نام ہے قوانین خداوندی کے سامنے سیر تسلیم خم کرنے کا، ان کی اطاعت کرنے کا، ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔ اس کے برعکس، ان قوانین سے انکار، انحراف اور سرکشی کا نام کفر ہے۔

۲۔ آپ اس عظیم القدر اور میسر العقول کارگاہ کائنات پر نگاہ ڈالتے۔ اس میں ہر شے لگے بندھے قانون کے

مطابق مصروف عمل ہے۔ کسی کو ان قوانین سے یا راستے انحراف

کائنات کی سجدہ ریزی | نہیں، مجال سرکشی نہیں۔ کوئی اس راستے سے ذرا ادھر ادھر نہیں ہٹ سکتا جو اس کے لئے متعین کر دیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ

وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَّآبُ ط (۲۲/۱۸)

کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ ارض و سما میں جو کچھ ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ

اور درخت اور جاندار سب قوانین خدا کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔

ط اس مقام پر آیت کا باقی حصہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کا مقام آگے چل کر آئے گا۔

یہ سب اس کے قوانین کے سامنے سر تسلیم خم کتے ہیں اور ان میں سے کسی کو ان سے مجال سرکشی نہیں۔
 وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ
 لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (۱۶/۴۹)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (ارض و سموات) میں جو کچھ ہے، خواہ وہ جاندار مخلوق ہو یا فطرت کی قوتیں، سب قوانین خداوندی کے سامنے سر بہ سجود ہیں اور اس سے کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے۔

ان کا منصب زندگی اور پنج حیات یہ ہے کہ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْتُوْنَ صُوْرًا (۱۶/۵۰) جو حکم انہیں دیا جاتا ہے، اس کے مطابق کام کتے جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے اوپر کہا ہے کہ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ارض و سموات میں جو کچھ ہے سب دابین خدا کے سامنے سجدہ ریز ہے؟ اس حقیقت پر غور کرنا تو بہت بڑی بات ہے کہ وہ کون سے قوانین ہیں جن کے مطابق کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے سرگرم عمل ہے اور وہ چیزیں ان قوانین کی اعلیٰ کس طرح کرتی ہیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ جنہیں قرآن کریم ”سموات“ (بلندیاں) کہہ کر پکارتا

سموات کی تھیرانگیزی

ہے۔ وہ کس قدر تھیرانگیز مظاہر فطرت کا گہوارہ ہیں۔ اس زمانہ میں وسائل رسل و رسائل کی کثرت اور ذرائع آمدورفت کی فراوانی سے، اس حقیقت کو تو ہم سمجھ گئے ہیں، کہ ہماری زمین ایک عظیم الجثہ کرہ ہے جو ہر وقت گردش میں مصروف ہے لیکن ہم میں سے بہت کم ہوں گے جنہیں اس کا علم ہو گا کہ کائنات کی ان حدود فراموش بلندیوں میں جس قدر اجرام فلکی تیر رہے ہیں، ان میں ہماری زمین کی حیثیت اتنی ہی ہے، جتنی مہرے اعظم میں ریت کے ایک ذرے کی۔ یہ مثال شاعری نہیں، حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ سورج جو ہمیں ایک طشت سے زیادہ بڑا نظر نہیں آتا اور جو ہم سے زیادہ دور بھی نہیں، صرف نو کروڑ انیس لاکھ (۹,۲۹,۰۰۰,۰۰۰) میل دور ہے۔ اس کا قطر ہماری زمین سے ۱۰۹ گنا بڑا ہے، یعنی آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار میل (۸,۶۴,۰۰۰) میل۔ اس کی جسامت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس میں ہماری زمین جیسی ۱۳ لاکھ زمینیں سما سکتی ہیں۔

لیکن یہ اس قدر عظیم کرہ، بایں ہمہ ضخامت و جسامت، دیگر اجرام سماوی کے مقابلہ میں اتنی ہی حیثیت رکھتا ہے جتنی سمندر میں ایک قطرہ۔

یہ ستارے جو شب کی تاریکیوں میں ٹمٹماتے چراغ دکھائی دیتے ہیں، ان میں سے جو ستارہ ہم سے قریب ترین ہے، وہ ہم سے کتنی دُور ہے، اس کا اندازہ اس سے لگاتے کہ جتنی دُور ہم سے سورج ہے، اسے دو لاکھ ستر ہزار سے ضرب دیجئے تو اس کا ہم سے اتنے میلوں کا فاصلہ ہے۔ ہمارا قریب ترین ستارہ ہم سے اتنی دُور ہے۔

اجرام فلکی کے فاصلے ہماری سڑکوں کے میلوں سے نہیں ماپے جاتے۔ انہیں ”روشنی کے سالوں“ سے ماپتے ہیں۔ روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ وہ ایک سال میں کس قدر مسافت طے کرتی ہوگی۔ ایسے ستارے بھی ہیں جن کی روشنی ہم تک ... ۸۵۰ سال میں پہنچتی ہے۔ پھر سمجھ لیجئے کہ روشنی، ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل کی مسافت طے کرتے ہوئے اس ستارے سے ہم تک ایک لاکھ ۸۵ ہزار سال کے عرصے میں پہنچتی ہے۔ یہ تو خیر دُور کے ستاروں کی بات ہے۔ یہ کہکشاں جسے ہمارے شاعر گزدر مریم کہہ کر آگے گزر جاتے ہیں، لاتعداد ”ستاروں کی دنیا“ کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے قریب ترین ستارے کی روشنی ہم تک اٹھارہ ہزار چار سو روشنی کے سال میں پہنچتی ہے۔ آسمان میں ستارے کتنے ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگاتے کہ اگر ہم ڈیڑھ ہزار ستارہ فی منٹ کے حساب سے گنے لگیں تو سات سو سال میں اس کی گنتی پوری ہو۔

اور ”ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں“ اس دنیا کو ہیولی کائنات (NEBULA) کہا جاتا ہے۔ ہماری دُور میں جس بعید ترین ہیولی کو اس وقت تک پاسکی ہے، وہ ہم سے پچیس کروڑ روشنی کے سال (LIGHT-YEARS) کے فاصلے پر ہے، یعنی وہاں سے روشنی، ایک سیکنڈ میں، ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی مسافت طے کرتے ہوئے، ہم تک پچیس کروڑ سال میں پہنچ سکتی ہے۔

آپ نے سموات کی وسعتوں اور بلندیوں کا اندازہ فرمایا؟ یہ ہیں وہ سموات جن میں ہر شے، قوانین خداوندی کے مطابق سرگرم عمل ہے اور کسی کو اس کی مجال نہیں کہ اپنے مقررہ راستے سے بائچ کا ہزارواں حصہ بھی ادھر ادھر ہو جائے یا اس کی رفتار میں سیکنڈ کے کروڑوں حصے کا بھی فرق پڑ جائے۔

یہ تمام اجرام فلکی، کائنات کی فضا میں معلق ہیں۔ یعنی ایسے ستونوں سے جکڑے ہوئے جنہیں قرآن کریم ”غیر مرنی“ کہہ کر سمجھاتا ہے۔ جہاں کہتا ہے کہ اللہ الَّذِیْ سَافَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَوَدُّنَهَا۔ (۱۳/۲)

اللہ وہ ہے جس نے ان تمام عظیم القدر اجرام سماوی کو بلندیوں میں محکم رکھا ہے، بغیر ایسے ستونوں کے جنہیں تم دیکھ سکو۔ یہ غیر مرنی ستون، وہ کشش ثقل

(GRAVITATIONAL PULL)

ہے جو ایک دوسرے کو تھامے ہوئے ہے۔

آپ نے فضائے آسمانی کی وسعتوں اور اجرام سماوی کی تعداد کے متعلق کچھ سُن لیا ہے اور یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ ان مختلف اجرام میں فاصلہ کس قدر ہے اور پھر یہ بھی معلوم ہے کہ ان تمام اجرام فلکی کو ایک دوسرے کی کشش ثقل سے ملے ہوئے ہے۔ اس کشش ثقل سے متعلق قانون کی ہمہ گیری کا اندازہ اس سے لگائیے کہ سر جیمس جینز کے الفاظ میں اگر ہم اپنی ایک انگلی بھی ہلائیں تو اس کا اثر اجرام فلکی میں سے ہر ایک پر پڑتا ہے۔ اجرام فلکی کے وزن، جسامت، فاصلہ وغیرہ کے متعلق جس قدر معلومات حاصل کی جاتی ہیں، ان کی بیشتر بنیاد کشش ثقل کا میجر العقول قانون ہے اور یہ قانون ایسا اٹل ہے کہ اگر کسی ستارے یا کُوتے کی کشش کے تناسب میں غیر محسوس سا فرق بھی آجائے تو کائنات کا سارا سلسلہ درہم برہم ہو جاتے۔

یہ تو اس بے پایاں فضا میں تیرنے والے عظیم الجثہ اجرام فلکی کی میجر العقول عظمتوں اور وسعتوں کا ہلکا سا تصور ہے۔ دوسری طرف ذرات کی طرف آئیے تو ایک قطرہ پانی میں کروڑوں سالمات (MOLECULES) ہوتے ہیں اور ہر سالمہ میں ایک ایٹم آکسیجن اور دو ایٹم ہائیڈروجن کے ہوتے ہیں۔ ہائیڈروجن کے ایک ایٹم کا قطر، ایک سینٹی میٹر کا دس کروڑواں حصہ ہوتا ہے۔ اس ذرۂ ناچیز پر نگاہ رکھتے اور پھر اس کی اس عظمت پر کہ نظام شمسی کی طرح اس کا اپنا نظام ہے، جس میں ایک مرکزی سیول ہوتا ہے اور اس کے گرد ایک برقیہ (ELECTRON) گردش کرتا ہے۔ یہ برقیہ سالمہ کے لاکھویں حصے کے برابر ہوتا ہے۔ اس کی رفتار کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یہ اپنے محور کے گرد ایک سیکنڈ کے دس لاکھویں حصے میں، سات ارب دفعہ گردش کرتا ہے اور یہ گردش ایک غیر متبدل قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ بے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی نہایت خفیف سی جھلک۔

قرآن کریم نے اس تجرۂ انگیز نظام کائنات کو ایک لفظ میں بیان کر دیا ہے اور وہ لفظ ہے، اسلام۔ اور اسی کو اس نے دین اللہ کہا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے۔

یہ کائناتی اسلام ہے

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا ذٰلِكَ

يُؤْجِبُوْنَ ۝ (۳/۸۴)

کیا یہ لوگ دین اللہ (نظام خداوندی) کے خلاف کوئی اور نظام زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ارض و سموات میں جو کچھ ہے، سب طوعاً و کرہاً اس نظام کے سامنے سر تسلیم خم کتے ہیں اور ہر ایک کی گردش اسی محور کے گرد ہے۔

یعنی وہ نظام زندگی جسے خدا نے تجویز کر رکھا ہے، دین اللہ کہلاتا ہے اور کائنات کی ہر شے اسی دین کو اختیار کرتے ہوئے ہے۔ اس نظام زندگی کو اختیار کرنے کا نام الاسلام ہے۔ یہی انداز زندگی صحیح منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔

وَمَنْ يَتَّبِعْ عَنِ الْإِسْلَامِ دِينًا قَلْبًا يَفْقِهْ مِمَّا هُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَيْرِ

(۲/۸۳)

جو کوئی الاسلام کے علاوہ کوئی اور نظام زندگی چاہتا ہے، تو وہ نظام کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا اور وہ آخر الامر نقصان اٹھائے گا۔

اس سے ظاہر ہے کہ کائنات کی ہر شے کا دین (نظام زندگی) اسلام ہے۔ ہر شے قوانین خداوندی کی اطاعت کر رہی ہے۔ یہ اطاعت، ایک مقصد عظیم کے حصول کے لئے ہے جسے خدا نے تجویز کر رکھا ہے۔ ہر شے کی تگ و تاز اور جدوجہد، خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے۔ بَلِّغْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مِنْ كُلِّ لَٰهٍ قَلِيْلًا ۝ (۲/۱۱۶) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، سب خدا کے تجویز فرمودہ پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروف عمل ہے اور ہر ایک نے اپنی تمام صلاحیتوں کو اسی مقصد کے لئے محفوظ اور وقف کر رکھا ہے۔ ”قَارِنَتُوْنَ“ کا لفظ بڑا معنی خیز ہے۔ ”سِقَاءٌ قَرِيْنَتٌ“ اس مشیکرے کو کہتے ہیں جو پانی کا ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہونے دے اور اسے بر محل صرف کرنے کے لئے روک کر رکھے۔ ایشائے کائنات میں لامحدود قوتیں ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہیں۔ ایک سوز کی توانائی ہی کو دیکھئے۔ وہ حرارت اور روشنی کا کیسا عظیم (RESERVOIR) ہے لیکن کیا مجال جو اپنی توانائی کی ایک رتق بھی اس مقصد کے علاوہ کسی اور مقصد میں صرف کر جائے جو اس کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس کے ذمے ایک فریضہ عائد کر دیا گیا ہے اور وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں رات دن سرگرواں ہے اسے عربی میں ”تَسْبِيْحٌ“ کہتے ہیں۔ سَبِّحْ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۵۴/۱) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، سب نظام خداوندی کی تکمیل میں پوری شدت اور تیزی سے سرگرم عمل ہے۔ اس خدا کے نظام کی تکمیل میں جو بڑی قوتوں اور عمدہ تدبیروں کا مالک ہے، نظام خداوندی کا یہی وہ دھاگہ ہے، جس میں اس نے ایشائے کائنات کے ”تسبیح کے دانوں“ کو اس حسن و خوبی سے پروار رکھا ہے کہ کوئی ذرا ادھر اُدھر نہیں ہٹ سکتا۔ ان عظیم عناصر کو اس طرح قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھنے سے مقصد یہ ہے کہ انسان ان سے کالے۔

تسخیر کائنات

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۴۵/۱۳)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے خدا نے اس سب کو تمہارے فائدے کے لئے قانون کی زنجیروں سے مسخر کر رکھا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَانْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الشَّجَرٰتِ رِیْثًا قَالَتْ لَكُمْ ۝

اللہ وہ ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو پیدا کیا۔ وہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے پھل پیدا ہوتے ہیں جو تمہارے لئے سامانِ زینت ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْکَ لِتَجۡسِیَ فِی الْبَحۡرِ بِاَمۡرِہٖ ۝

اس نے تمہارے لئے جہازوں کو قانون کی زنجیروں میں مسخر کر رکھا ہے جو اس کے قانون کے مطابق

تیرتے پھرتے ہیں۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهَارَ ۝ اور اس نے تمہارے لئے دریاؤں کو بھی قانون کی

زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآِیۡمَیۡنَ ۝ کشتیاں، سمندر اور نہریں

ہی نہیں، اس نے تمہارے لئے سورج اور چاند تک کو قانون کے حلقوں میں باندھ رکھا ہے اور وہ مسلسل اور متواتر

چل رہے ہیں۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۝ (۳۳-۳۲/۱۴) اور اسی طرح اس نے دن اور رات

کو تمہارے فائدے کے لئے ایک نظام کے تابع رکھ چھوڑا ہے۔

ابر و باد و مه و خورشید و فلک در کار اند

تا، تو نے بکف آری و بغفلت نخوری

وہ قوانین جن کے مطابق اشیائے کائنات نے اپنے اپنے فرائض کو

سراپنا دینا ہے، ان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیے گئے ہیں مابقی

کائنات کی طفرہ وحی

کو قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ وحی خداوندی ہے جو ان میں سے ہر ایک کی

طرف براہِ راست ہوتی ہے۔ وَ اَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَّمَآءٍ اَمْرَہَا (۴۱/۱۲) اور اس نے ہر سماء (بلندی) میں

اس کے قانون کو وحی کر دیا اور اسی طرح ارض میں بھی رِبَآتٌ مَّا بَیۡکَ اَوْحٰی لَهَا (۹۹/۵) یہی وہ وحی ہے۔

جس کی رو سے کائنات کی ہر شے اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح سے واقف ہے۔ کُلُّ شَيْءٍ عَالِمٌ بِصَلَاتِهِ وَ تَسْبِيحِهِ ط (۲۴/۴۱) ہر شے یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے فرائض زندگی کیا ہیں اور یہ بھی کہ ان کی ادائیگی کے لئے اس کے دوا ترنگ و تاز کون سے ہیں۔ اسی کو خدا نے اپنی طرف سے عطا کردہ ہدایت یا راہ نمائی سے تعبیر کیا ہے۔ جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا کہ تمہارا رب کون ہے؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ سَابُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ (۲۰/۵۰)، ہمارا نشود نمادینے والا وہ ہے جس نے ہر شے کو تخلیق ہی کر عطا کیا، اسے پیدا کیا اور پھر اسے وہ راہ نمائی عطا کر دی جس کے مطابق اس نے سفر زندگی طے کرنا ہے۔ اشیائے کائنات میں خدا کی یہ راہ نمائی کس معیار العقول انداز سے کارفرما ہے، اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں، جنہوں نے ان چیزوں کی زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ کرنے میں اپنی عمریں صرف کی ہیں۔ ان کے مشاہدات کے نتائج ایسے تحیر انگیز ہیں کہ انہیں دیکھ

اس راہ نمائی کی مثالیں

کر انسان و رطہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ (مثلاً) یورپ اور شمالی افریقہ کی جھیلیں اور ندیوں میں ایک مچھلی پائی جاتی ہے جسے ریل (EEL) کہتے ہیں۔ ایک خاص عمر کو پہنچ جانے کے بعد یہ مچھلیاں اپنے اپنے ماسکن سے باہر نکلتی شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ رات کی تاریکیوں میں دلدل اور گھاس میں سے گزرتی ہوئی ایک سے دوسری جھیل اور ندی میں پہنچتی ہیں اور اس طرح آہستہ آہستہ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے، بحر اطلانتک میں جزیرہ برمودا کے قریب پہنچ جاتی ہیں، جہاں سمندر بہت گہرا ہے۔

دوسری طرف امریکہ کی ایل مچھلیاں بھی اسی طرح پہنچ جاتی ہیں۔ یہ مچھلیاں گہرے سمندر میں انڈے دے کر مر جاتی ہیں۔ ان کے بچے انڈوں سے نکلنے کے بعد اپنے اپنے آبائی وطن کی طرف چل نکلتے ہیں اور انہی راستوں سے ہوتے ہوئے، جن سے ان کے ماں باپ گزے ہیں، اپنی اپنی جھیلوں اور ندی نالوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ ان میں سے نہ کوئی راستہ بھولتا ہے اور نہ ہی کسی غلط جگہ پہنچتا ہے۔ اس سفر میں انہیں تین سال کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ یہ سب اسی طرح جاری ہے۔ مشاہدہ کرنے والے ان کے حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن یہ راز کسی پر نہیں کھلتا کہ وہ کون سی قوت ہے جو ان انڈوں سے پیدا ہونے والے بچوں کو جن کے ماں باپ ان کی پیدائش سے پہلے مر چکے تھے، ان کے آبائی وطن کی طرف راہ نمائی کرتی ہے اور وہ ہزاروں میل کی مسافت میں کہیں راستہ نہیں بھولتے۔

یہی کیفیت سا تین مچھلی کی ہے۔ ہر نوزائیدہ سامن، کچھ وقت کے لئے سمندر میں جا کر رہتی ہے۔ پھر واپسی پر سمندر سے اس دنیا میں پہنچتی ہے جس سے وہ سمندر میں داخل ہوئی تھی۔ اس دریا سے اس معاون ندی کا رخ

کر لیتی ہے جو اسے اس دریا میں لائی تھی اور اس ندی سے پھر اپنی مرزبوم تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر آپ اسے راستے میں پکڑ کر کسی غلط ندی میں چھوڑ دیں تو وہ آگے بڑھنے کے بجائے فوراً پیچھے کی طرف لوٹ کر بڑے دریا میں پہنچ جاتی ہے اور وہاں سے اپنی صحیح ندی میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہ اس میں کبھی غلطی نہیں کرتی۔

یہی کیفیت مہاجر پرندوں (MIGRATORY BIRDS) کی ہے۔ بحر الکاہل میں بہت سے جزیرے ہیں جہاں خاص قسم کے پرندوں کے سوا کوئی جاندار نہیں ملتا۔ یہ پرندے سردی کے موسم میں جزائر ہوائی (HAWAZ) میں چلے جاتے ہیں۔ انہیں یہ دو ہزار تین سو میل کا سفر سمندر کے اوپر، ایک ہی اڑان میں کرنا ہوتا ہے۔ وہ وہاں انڈے دے کر واپس آ جاتے ہیں۔ اس کے بعد جب ان کے بچے اڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے ماں باپ کے ”نقش قدم“ پر (جن کا کوئی نشان نہیں ہوتا اور جنہیں انہوں نے دیکھا تک نہ تھا) سیدھے اپنے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ فضا کی پہنائیوں میں سمندر کے اوپر، وہ کون سے نشانات راہ میں جو ان کی راہ نمائی، ان کے مستقر کی طرف کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ راہ نمائی وہی ہے جو خدا کی ”وحی“ نے ان کے اندر رکھ دی ہے۔

مَا مَنَّا الَّذِيْ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰى۔ اسی سلسلہ میں ایک مبہر شعر (MR C.T HUDSON) نے اپنی کتاب (BIRDS AND MAN) میں اس قسم کے مہاجر پرندوں کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان مہاجرین کا قافلہ اڑ گیا تو پیچھے دو پرندے رہ گئے۔ ان میں سے ایک زمین پر چلتا تھا اور دوسرا اس سے ذرا آگے فضا میں اڑتا تھا۔ اڑنے والا پرندہ، تھوڑی دور جا کر پیچھے مڑ کر دیکھتا، چلنے والے پرندے کو آواز دیتا لیکن جب وہ اپنی رفتار میں تیزی نہ کرتا، تو وہ بھی نیچے اترتا تاہم آنکھ وہ اس کے ساتھ آملتا۔ وہ پھر اڑتا۔۔۔ دونوں اس طرح افتاب و خیزاں، اپنے قافلے کے رُخ پر چلے جاتے۔ اس نے قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک نر اور دوسری مادہ ہے۔ مادہ کا ایک بازو ٹوٹا ہوا ہے اور وہ اڑنے کے قابل نہیں۔ نر اسے تنہا چھوڑ کر اکیلا نہیں جانا چاہتا، اس لئے کہ وہ اس کی رفیقہ حیات ہے۔ (انسان کا بچہ ہوتا تو اپنی پر شکستہ بیوی کو لات مار کر الگ کر دیتا اور خود دوسری لے آتا)

بہر حال یہ ضمنی بات تھی۔ کہا یہ جارہا تھا کہ کائنات میں ہر شے کو خدا کی طرف سے راہ نمائی ملتی ہے اور وہ بلا چون و چرا اس راہ نمائی کا اتباع کرتی چلی جاتی ہے۔ اس میں سے کسی کو اس راہ نمائی سے مجال انکار یا رائے کشی

نہیں۔ اسی سے یہ عظیم القدر سلسلہ کائنات اس حسن و خوبی سے سرگرم عمل ہے کہ اس میں کہیں کوئی سلوٹ،

کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتی۔ مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ
کوئی سلوٹ یا جھول نہیں مِنْ تَقْوِيَةٍ۔ تم خدا سے رحمن کی تخلیق میں، کسی قسم کا عیب

متناسب نہیں دیکھو گے۔ فَاتَّجِيعَ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِنْ فُطُورٍ — ذرا نگاہ کو پلٹ کر دیکھو تو یہی۔ کیا
 کہیں کوئی نقص، کوئی شکاف، کوئی عیب نظر آتا ہے؟ ثُمَّ اتَّجِيعَ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ۔ ایک بار نہیں
 عقاب نگاہ کو بار بار، کائنات کی پہنائیوں میں چھوڑ دو۔ يَنْقَلِبُ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ۔
 (۳۰-۳۱) اُسے کہیں کوئی نقص نظر نہیں آئے گا اور وہ خاسر و نامراد بار تھک کر کاشانہ چشم میں لوٹ آئے گی۔

یہ اس لئے کہ ساری کائنات دینِ خداوندی — الاسلام — کے مطابق چل رہی ہے۔ اس لئے
 ہو نہیں سکتا کہ اس میں کوئی غلطی، کوئی فساد، کوئی فتنہ، کوئی فتور ہو۔ فتنہ و فساد تو غیر اسلامی زندگی میں
 ہوتا ہے۔ اسلامی پنج زندگی میں فتنہ و فساد کا کیا کام!

جب عالم موجودات کی ہر شے کے لئے ایک قانون زندگی اور ضابطہ حیات متعین ہے تو کیا انسان جو اس

خطہ ارض پر سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی اور نظم کائنات کا حسین مقطع ہے، اس
انسانی دنیا ضبط و آئین سے مستثنیٰ ہوگا؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ نظام کائنات کے خلاف

ہوگا۔ جب کائنات کی ہر شے ایک پنج و اسلوب کے مطابق زندگی بسر کر رہی ہے تو انسان کے لئے بھی فرضی
 ہے کہ ایک خاص ضابطہ حیات کے مطابق دنیا میں رہے۔ یہ طریق حیات اور پنج زندگی وہی ہے جسے ہم نے
 ابھی ابھی الاسلام کہہ کر پکارا ہے۔ ایشائے کائنات کے متعلق کہا گیا تھا کہ قُلْ أَسْلَمْتُ مَفِ
 فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ — (۳/۸۲) انسانوں کے متعلق بھی کہا گیا کہ بَلَّغْ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ
 لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ..... (۲/۱۱۲) اشیائے کائنات کے متعلق کہا گیا تھا کہ كُلُّ لَّهُ قَائِمُونَ (۲/۱۱۲)
 انسانوں سے کہا گیا کہ قَوْمُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ۔ (۲/۲۳۸)

انسان کی زندگی کے دو حصے یا دو سطحیں ہیں۔ ایک سطح وہ ہے جسے طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE)

کہا جاتا ہے۔ یہ اس کے جسم کی زندگی ہے اور اس پر وہی قوانین نافذ ہیں،
جسمانی زندگی جن کے ماتحت حیوان زندگی بسر کرتے ہیں، کھانا، پینا، سونا، افزائش نسل

وغیرہ — پانی جس طرح ایک بیل کی پیاس بجھاتا ہے، اسی طرح انسان کے لئے وجہ تسکین ہوتا ہے۔ اچھی غذا جس طرح ایک گھوڑے کی پرورش کرتی ہے، اسی طرح انسان کے لئے بھی فرہی اور تقویت کا موجب بنتی ہے۔ سنگھیا جس طرح ایک کتے کو ہلاک کر دیتا ہے، اسی طرح انسان کو بھی مار دیتا ہے۔ یہ بھی قوانین خداوندی ہیں، جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کو طبعی زندگی کی آسائشیں حاصل ہوتی ہیں اور جن کی خلاف ورزی اس کے لئے مضرت رساں ہوتی ہے لیکن انسانی زندگی کی دوسری سطح وہ ہے جو اسے حیوانات سے بکھرا لگ اور ممتاز کر دیتی ہے۔ اگر پہلی سطح کی زندگی کو اس کی حیوانی زندگی (ANIMAL LIFE) کہا جائے تو اس دوسری سطح کی زندگی کو اس کی انسانی زندگی (HUMAN LIFE) سے تعبیر کرنا مناسب ہوگا۔ اس کی حیوانی سطح کا مدار اس کے طبعی جسم

پر ہے لیکن اس کی انسانی زندگی کا قیام اس کی ذات سے وابستہ ہے جسے —
انسانی زندگی (HUMAN PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ جس طرح اس کے جسم کی

پرورش کے لئے قوانین مقرر ہیں، اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما کے لئے بھی اصول و ضوابط متعین ہیں۔ اگر ان اصول و ضوابط کے مطابق انسانی ذات کی نشوونما ہو جائے تو جسم کی موت کے بعد بھی انسان زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ اصول و قوانین جن کے مطابق انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے، مستقل اقدار کہلاتے ہیں۔ یہ انسان کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملے ہیں لیکن اس وحی اور اس وحی کے طریق میں بنیادی فرق ہے جو اشیائے کائنات کی طرف کی جاتی ہے اور جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت، اس کا صاحب اختیار ارادہ ہونا ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس سے انسان حیوانات سے متمیز ہوتا ہے اور جو اس کے لئے باعثِ صد شرف و افتخار ہے۔ اسی اختیار و ارادہ کا نتیجہ ہے کہ انسان کی طرف وحی بھیجنے کا طریق الگ تجویز کیا گیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بے جان اشیائے کائنات میں سے ہر شے کے اندر اور جانداروں کی ہر نوع کے ہر فرد کے اندر پیدائشی طور پر وہ راہ نمائی رکھ دی گئی ہے، جس کے متعلق انہوں نے اپنی زندگی بسر کرنی ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ چیز ان کی جبلت میں داخل ہے اور جبلت کے معنی یہ ہیں کہ اس کی پیروی مجبوراً کی جائے۔ اس سے گریز اور مفر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ (انسان کے علاوہ) کائنات کی ہر شے ان قوانین کی اطاعت از خود کئے جا رہی ہے جو اس کے لئے خدا کی طرف سے تجویز کر دیئے گئے ہیں۔ اگر انسانی ذات سے متعلق اصول و قوانین بھی 'ہر انسانی بچے کے اندر' پیدائش کے ساتھ ہی ودیعت کر دیئے جاتے تو انسان بھی ان قوانین کی اطاعت پر مجبور ہو جاتا اور یہ چیز اس کے صاحب اختیار ارادہ ہونے کے بکھرنا ہی ہوتی۔

اس کے لئے مشیت نے یہ پروگرام مقرر کیا کہ یہ قوانین انسانوں میں سے ایک منتخب ہستی کو بذریعہ وحی دے دے جاتے اور اس سے کہہ دیا جاتا کہ اسے ان کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ چاہے انہیں اختیار کر لیں اور چاہے تو ان سے انکار کر کے اپنے لئے کوئی اور راستہ تجویز کر لیں لیکن اتنا سمجھ لیں کہ ان قوانین کے اتباع سے انہیں زندگی کی خوشگواریاں نصیب ہو جائیں گی اور ان کی خلاف ورزی کرنے سے وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ مشیت کی اس اسیم کا نتیجہ ہے کہ جہاں کائنات کی تمام اشیاء قوانین خداوندی کے آگے تسلیم خم کئے ہیں، انسانوں میں سے بعض ان قوانین کو مانتے ہیں اور بعض ان سے انکار کرتے ہیں۔

سلسلہ نبوت

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ مِنَ السَّمٰوٰتِ وَالْجِبَالِ وَالشَّجَرِ وَالدَّابِّ -

کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت اور جاندار۔

لیکن جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے، ان میں سے بعض ان قوانین کے سامنے جھکتے ہیں اور بعض ان سے انکار کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان پر تباہی مسلط ہو جاتی ہے۔ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ط وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ط

..... (۲۲/۱۸) یہی وجہ ہے کہ جہاں (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) اشیاء

اختیار و ارادہ

کائنات کے متعلق کہا ہے کہ وَلَهُ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط

طَوْعًا وَّكَرْهًا (۳/۸۲) یہ سب طوعاً و کرہاً قوانین خداوندی کے سامنے جھکی ہوئی ہیں۔ انسانوں کے متعلق کہا کہ

بَلٰی قَا مِّنْ اَسْلَمَ وَّجْهًا لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهٖ ط لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ط (۲/۱۱۲)

ہاں! جو کوئی ان میں سے اپنے آپ کو قوانین خداوندی کے سامنے جھکا دے اور حسن کارنامہ انداز سے زندگی بسر کرے تو اس کا اجر اس کے نشوونما دینے والے کے قانونِ مکافات کے مطابق ملے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن۔

دوسرے مقام پر اشیائے کائنات کے متعلق کہا کہ كُلُّ لَهٗ قَانِتُوْنَ (۲/۱۱۶) سب اس کے قوانین کی اطاعت

کرتی ہیں لیکن انسانوں سے کہا گیا کہ قُومُوا لِلّٰهِ قَانِنِیْنَ (۲/۲۳۸) تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو۔ اسی کو حسین ترین نظامِ زندگی کہا گیا، یعنی انسانوں کا برضا و رغبت بطیبِ خاطر اپنے اختیار و ارادہ کو کام میں لا کر علی و جہ البصیرت، قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنا۔ وَمَنْ أَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ (۴/۱۲۵) انسان کو یہ اختیار طبعی دنیا میں بھی حاصل ہے اور انسانی دنیا میں بھی مثلاً پانی کے لئے قانون یہ مقرر ہے کہ اگر اس پر کوئی خارجی دباؤ نہ ہو تو وہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ زمینیں، ندی کے نشیب کی طرف بھی ہوتی ہیں، فراز کی طرف بھی۔ جو کسان اپنا کھیت نشیب کی طرف بناتا ہے، وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت کرتا ہے۔ یا یوں کہتے کہ وہ اپنی کوششوں کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھتا ہے اور اس کا پھل پاتا ہے۔ یہ قوانین چونکہ انسان کی حیوانی سطح سے متعلق ہیں، اس لئے یہ انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں

طبعی زندگی کے مفاد

ا کرتے۔ وہ لوگ جو انسانی ذات کو تسلیم کریں، نہ مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین رکھیں، نہ مستقل اقدار کو مانیں اور زندگی صرف اس دنیا کی طبعی زندگی کو سمجھیں، وہ بھی اگر ان قوانین کی اطاعت کریں تو انہیں ان کے نتائج اسی طرح ملیں گے جس طرح ان لوگوں کو جو مذکورہ بالا تمام امور پر یقین رکھیں۔ قرآن کریم نے اول الذکر طبقہ کو صرف ”حیات الدنیا“ کے ماننے والے اور دوسرے طبقہ کو ”دنیا اور آخرت“ دونوں کے ماننے والے قرار دیا ہے۔ پہلے طبقہ کی ساری کوششیں دنیاوی مفاد کے حصول میں صرف ہو جاتی ہیں اور ان میں انسانی اقدار کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ وہ ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ

فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا دَمَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِّنْ خَلَاقٍ (۲/۲۰۰)
لوگوں میں وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں سب کچھ دنیاوی زندگی میں مل جائے۔ ان کا آخری مفاد میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

وَمِنْهُمْ مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً (۲/۲۰۱)
اور وہ لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں اس دنیا کی خوشگواریاں بھی نصیب ہوں اور حیاتِ آخری کی خوشگواریاں بھی۔

یہ لوگ قرآن کریم کی اصطلاح میں ”مومن“ کہلاتے ہیں، یعنی وہ لوگ جو خدا کے مقرر فرمودہ قوانینِ طبعی کی بھی اطاعت کرتے ہیں اور مستقل اقدار کی نگہداشت بھی۔ ان کے برعکس جو لوگ صرف قوانینِ طبعی کو تسلیم کرتے ہیں اور وحی کی رؤ

سے عطا شدہ مستقل اقدار کو نہیں مانتے، انہیں کافر۔ یعنی نہ ماننے والے۔ کہا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قوانینِ طبیعی کا ماننا اور ان کے مطابق کوشش کرنا، مومن اور کافروں کے لئے ضروری ہے۔ جو بھی ان کے مطابق کوشش کرے گا، وہ ان کے نتائج سے بہرہ یاب ہوگا۔ قرآنِ کریم نے

مومن و کافر

اس حقیقت کو بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا ۝

جو کوئی اس طبعی زندگی کے مفادِ عاجلہ چاہتا ہے، ہم اسے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق یہ مفاد دے دیتے ہیں لیکن اس کا مستقبل تباہ و برباد ہوتا ہے۔

وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ۝

اور جو (دنیاوی مفاد کے ساتھ) مستقبل کے مفاد بھی چاہتا ہے اور اس کے لئے پوری پوری کوشش کرتا ہے اور خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار پر ایمان رکھتا ہے تو ان لوگوں کی کوششیں بھرپور نتائج پیدا کرتی ہیں۔

كُلًّا نُّمِدُّهُمُ أَهْلًا وَهُوَ لَا يَعْلَمُ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ۖ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ۝ (۲۰-۱۸/۱۴)

ہم دونوں گروہوں کو ان کی کوششوں کے مطابق بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ ہماری عطا کردہ نعمتوں کا دروازہ ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے۔ ہم نے ان کے سامنے کوئی بند نہیں لگا دیا کہ فلاں لوگ اس کے اندر آ سکیں گے اور فلاں نہیں۔

ہست این میکہ و دعوتِ عام است این جا

قسمت بادہ باندازہٗ جام است این جا

قرآنِ کریم نے جب کہا ہے کہ وَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا قَنَدُ ۖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۴۵/۱۳) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، سب کو خدا نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، تو اس میں خطاب کسی خاص گروہ سے نہیں، خطاب تمام انسانوں

سے ہے جو قوم بھی غور و فکر سے کام لے کر فطرت کی قوتوں کو اپنے کام میں لائے گی، وہ ان سے متمتع ہو جائے گی۔

مومن اور کافر کا فرق

مومن اور کافر کا فرق اس سے آگے چل کر سامنے آتا ہے۔ کافر فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں اپنے فیصلوں کے مطابق صرف کرتا ہے۔

اس کا نتیجہ تباہیوں اور بربادیوں کا وہ جہنم ہے جس میں اس وقت دنیا مبتلا ہے۔ جس قدر فطرت کی قوتوں کی تسخیر بڑھتی جاتی ہے، اسی قدر اس جہنم کی آگ میں وسعت اور شدت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے لیکن مومن فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں خدا کی متعین فرمودہ مستقل اقدار کے مطابق صرف کرتا ہے جس سے یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ اسی کو حدود اللہ کے اندر رہنا کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنی صلاحیتوں اور فطرت کی قوتوں کو ان حدود کے اندر رہتے ہوئے صرف کرنا، جنہیں خدا نے تمام نوع انسان کے عالمگیر مفادِ کلی کو سامنے رکھ کر متعین کیا ہے۔ مثلاً جب ”قوم کافر“ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہے تو وہ انہیں اپنے مفاد اور دوسری اقوام کی تخریب کے لئے استعمال کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مختلف اقوام عالم ان قوتوں کو اپنے مفاد اور دوسروں کی تخریب کے لئے استعمال کریں گی، تو اس سے دنیائے انسانیت میں عالمگیر فساد برپا ہو جائے گا لیکن جب ”قوم مومن“ ان قوتوں کو مسخر کرے گی، تو وہ انہیں تمام نوع انسان کی پرورش اور نشو و نما کے لئے صرف کرے گی، کیونکہ ربوبیتِ عالمیٰ ایک مستقل قدر ہے جسے یہ ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتی۔ یا مثلاً جب حکومت ”قوم کافر“ کے ہاتھ میں آئے گی، تو وہ معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرے گی، اسے مختلف طبقات میں تقسیم کر دے گی، جس سے غریب، غریب تر اور امیر امیر تر ہوتے چلے جائیں گے۔ عدل و انصاف مٹ جائے گا اور تمام فیصلے حکمران طبقے کے مفاد کے ماتحت ہوں گے۔ لیکن جب یہی حکومت، قوم مومن کے ہاتھ میں آئے گی، تو وہ معاشرہ میں ہمواریاں پیدا کرے گی۔ تمام افراد معاشرہ کے لئے سامانِ زیست اور اسبابِ نشو و نما ضرورت کے مطابق مہیا ہوں گے۔ ہر انسان کی بحیثیت انسان عزت و تکریم ہوگی۔ ہر معاملہ کا فیصلہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔ اس میں نہ کسی کی رعایت ہوگی نہ کسی کے خلاف زیادتی، اس لئے کہ ان تمام امور کے لئے خدا کی طرف سے دیئے ہوئے اصول و قوانین پر ان کا ایمان ہوگا اور انہی کے مطابق زندگی بسر کرنا ان کا نصب العینِ حیات۔ اس سے جہاں اس دنیا میں جنتی معاشرہ قائم ہو جائے گا، اس کے ساتھ ان کی اپنی ذات کی نشو و نما ایسے انداز سے ہوتی جائے گی، جس سے وہ مرنے کے بعد کی زندگی میں ارتقاء فی منازلِ طے کرنے کے قابل ہو جائیں گے، یعنی یہاں بھی جنت وہاں بھی جنت۔ اس لئے کہ انسانی ذات کی نشو و نما کا راز، نوع انسان کی عالمگیر ربوبیت اور نظامِ عدل و احسان میں پوشیدہ ہے۔

اسلام کیا ہے | تصریحات بالا سے واضح ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اسلام نام ہے طبعی دنیا سے متعلق قوانین خداوندی سے ہم آہنگی اور وحی کی رو سے عطا شدہ مستقل

اقدار و اصول حیات کے مطابق زندگی۔ بالفاظ دیگر، فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں تو زمین خداوندی کے مطابق صرف میں لانا اسلام ہے۔

اب ہمارے سامنے تین قسم کے گروہ آگئے۔

(۱) پہلا گروہ ان لوگوں کا جو قوانین فطرت کی متابعت سے (جسے فزیکل سائنس کہتے ہیں) کائناتی قوتوں کو مسخر کر لیتے ہیں لیکن مستقل اقدار پر ایمان نہیں رکھتے۔ انہیں دنیا کے مادی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں لیکن ان کا معاشرہ جہنمی ہوتا ہے اور جن لوگوں کا یہاں معاشرہ جہنمی ہو، ان کا مستقبل بھی جہنمی ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا گروہ ان لوگوں کا جو فزیکل سائنس کی رو سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیتے ہیں اور پھر انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کرتے ہیں۔ ان کی زندگی یہاں بھی جہنمی ہوتی ہے اور آخرت میں بھی جہنمی۔

(۳) تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو فطرت کی قوتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی موجودہ دنیا کی زندگی، ذلت و خواری اور محتاجی و کس مہر سی کی زندگی ہوگی۔ وہ سامان زیست تک کے لئے دوسری قوتوں کے دست نگر ہوں گے۔

اس سے یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اگر یہ گروہ 'خدا، وحی، آخرت پر ایمان کا مدعی ہو تو کیا ان کی اُخروی زندگی کامیاب و کامران ہو جائے گی؟ اس کا جواب واضح ہے۔ خدا، وحی، آخرت، یا مستقل اقدار پر

ایمان کے معنی یہ ہیں کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کیا جائے۔ اب جو قوم فطرت کی قوتوں سے محروم ہے اس

کے لئے ان قوتوں کے صرف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا خدا، وحی، آخرت، یا مستقل اقدار وغیرہ پر اس کا ایمان محض لفظی دعویٰ ہے جو کبھی عمل میں نہیں آتا اور جو ایمان عمل میں نہیں آتا، وہ اپنے نتائج کیا پیدا کرے گا۔ یہ خیال غلط ہے کہ اس دنیا میں یہ لوگ خواہ تباہ حال ہی کیوں نہ ہوں، ان کی عاقبت بہر حال سنوہ جلے گی۔ یہ خیال رہبانیت کا پیدا کردہ ہے جو انسانی ذہن کی اپنی اختراع ہے۔ اس سے انسان اس فریب میں مبتلا رہتا ہے کہ یہاں کی تباہ حالی اور ربوں حالی کا عاقبت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بلکہ جو یہاں 'جتنا زیادہ ربوں حال ہوگا' وہ عاقبت میں اتنا ہی خوش بخت ہوگا۔ قرآن کریم اس کی کھلے الفاظ میں تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس تو پر اس دنیا

میں مادی سامان زیست کے دروازے نہیں کھلتے، اس کی عاقبت کبھی سنور نہیں سکتی۔ وہ کھلے الفاظ میں بتاتا ہے کہ
 وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا۔ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتنا ہے
 اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے۔ یہ یہاں کی بدعالی ہے۔ وَلَنَحْشُرَنَّ لَكَ يَوْمَ الْإِقْلَامَةِ أَغْمًى۔ (۲۰/۱۲۴)
 اور اسے ہم قیامت میں بھی اندھا اٹھائیں گے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ قوانین فطرت بھی خدا ہی کے متعین کردہ قوانین
 ہیں۔ ان کی خلاف ورزی کرنے، یا ان سے اعراض برتنے کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہے۔ قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ
 ان قوانین کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ اگر ہم قرآن کریم کے اس حصے سے انکار کرتے ہیں تو دوسرے حصے کا زبانی
 اقرار ہمیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ قرآن کریم کے الفاظ میں اخْتَوُ غُصُونٌ يَبْغِضُ الْكِتَابَ وَتَكْفُرُ ذُنُ
 يَبْغِضُ۔ کیا تم ایسی روش اختیار کرنا چاہتے ہو کہ قوانین خداوندی کے ایک حصے پر ایمان رکھو اور دوسرے
 حصے سے انکار کرو۔ حَمَازَ آءُ مَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ مِنْكُمْ الْآخِرُ فِي الْعِلْوَةِ الدُّنْيَا وَ
 يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُؤَذِّنُ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) جو کوئی ایسا کرے گا تو اس کا
 نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اسے اس دنیا میں بھی ذلت و خواری نصیب ہوگی اور وہ قیامت میں شدید ترین
 عذاب میں مبتلا ہوگا۔ آپ نے دیکھا کہ قوانین خداوندی کے ایک حصے سے انکار کرنے اور دوسرے حصے پر ایمان رکھنے
 کا نتیجہ صرف اسی دنیا کی ذلت و خواری نہیں بلکہ آخرت کی تباہی اور بربادی بھی ہے۔ یہ اس لئے کہ (جیسا کہ پہلے کہا
 جا چکا ہے) دوسرے حصے (یعنی مستقل اقدار) پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اسے پہلے حصے (دنیاوی معاشرہ) میں
 عملاً نافذ کیا جائے۔ قرآن کریم کے احکام و قوانین 'دنیاوی زندگی کو وحی الہی کے مطابق صحیح خطوط پر متشکل کرنے کے لئے
 ہیں۔ حتیٰ کہ صلوٰۃ جیسی "عبادت" بھی اسی حقیقت کی یاد تازہ کرانے اور اس آرزو کو بیدار کرنے کے لئے ہے کہ ہم زندگی
 کے ہر گوشے میں قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کریں گے، ہم اس کے قوانین کے سامنے جھکیں گے۔ لہذا دنیاوی
 زندگی کو قابل اعتناء نہ سمجھنا اور خیال کرنا کہ ہم قوانین خداوندی کی اطاعت کر رہے ہیں، اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔
 یاد رکھیے! جسے اس دنیا کی خوشگواریاں حاصل نہیں یا وہ ان کے حصول کی کوشش نہیں کرتا، وہ قوانین خداوندی کی
 اطاعت نہیں کرتا اور اسی لئے اسے اس دنیا کی خوشگواریاں بھی حاصل نہیں ہو سکتیں۔ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا
 حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً۔ مومن کا صحیح شعار زندگی ہے اور جس روش کا نتیجہ یہ نہیں، وہ اسلام
 نہیں، کچھ اور ہے۔ ایمان و عمل صالح کا لازمی نتیجہ اس زمین کی سرفرازی و سر بلندی، حکومت و سطوت ہے۔
 (۲۴/۵۵) یہ خدا کا اہل وعدہ ہے۔ جس کی دنیا خراب ہے اور وہ اس خرابی کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا، اس

کی آخرت بھی تباہ و برباد ہے۔

وہ کل کے غم و عیش پر کچھ حق نہیں رکھتا جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے

وہ قوم نہیں لائق ہنگامہ فردا جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

دین اس لئے آتا ہے کہ وہ انسان کے دنیاوی معاملات سنوار دے۔ اپنی معاملات کے سنورنے سے اس کی عاقبت سنورتی ہے۔ جس قوم کے دنیاوی معاملات سنورے ہوئے نہ ہوں اور وہ عالم انسانیت کے بگڑے ہوئے معاملہ کو سنوارنے کی فکر نہ کرے، سمجھ لیجئے کہ اس قوم کی عاقبت سنوری ہوئی نہیں۔ دین ایک ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جو انسانی زندگی میں حُسن پیدا کر دیتا ہے۔ آپ انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ یہاں سے وہاں تک ایک سلسلہ صید و صیاد نظر آئے گا، جس میں ہر فرد اور ہر قوم کی کوشش یہ ہوگی کہ وہ دوسرے فرد اور دوسری قوم کو اپنا شکار بنائے۔ اس کے لئے طرح طرح کی تدبیریں اختیار کی جائیں گی۔ قسم قسم کے جال بچائے جائیں گے۔ کوئی ہرنگ زمین، کوئی مقدس پردوں کی اوٹ میں۔ ہر طاقتور کمزوروں کا خون چوسے گا۔ ہر زیرک، دوسروں کو بے وقوف بنا کر ان کے گاڑھے پیسنے کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرے گا۔ یوں تو ان شکاریوں کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن اگر ان کی اصولی تقسیم کی جائے تو تین بڑی بڑی شاخیں ہمارے سامنے آئیں گی۔

دین کی غایت

مستبد حکومت — باطل مذہبی پیشوائیت اور خون آشام نظام سرمایہ داری — دین، ان تینوں لعنتوں کو مٹا کر ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے، جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم اور محتاج نہ رہے۔ وہ ایک ایسا معاشرہ متشکل کرتا ہے جس میں ہر فرد وہ کچھ بن سکے جو کچھ بن سکے گا اس میں امکان ہے۔ غلط معاشرے میں جو ابر انسانیت کے کروڑوں غنچے بن کھلے مر جھا جاتے ہیں لیکن دین کی رُو سے قائم کردہ معاشرے میں ایک فرد بھی ایسا نہیں رہتا، جس کی مضر صلاحیتیں نشوونما پا کر برومند نہ ہوں۔ آپ غور کیجئے کہ کتنا بڑا انقلاب ہے جو عالم انسانیت میں دین کی رُو سے برپا ہوتا ہے۔ وہ پہلے اس معاشرہ کو ایک خطہ زمین میں متشکل کرتا ہے اور پھر اس کے دائرے کو وسیع کرتا چلا جاتا ہے تاکہ یہ پوری عالمگیر انسانیت کو اپنی آغوش میں لے لے۔ اس لئے کہ اس کے سامنے پورے کے پورے صفحہ ارض سے، سلب و نہب اور ظلم و جور کو مٹا کر، عدل و احسان کا نظام قائم کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ساری نوع انسان کو ایک عالمگیر برادری بنا کر اسے اخوت کے رشتے میں پروردیتا ہے۔ یہ ہے دین کا مقصود، علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

نبوتِ محمدیہؐ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایسی ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے، جس کی تشکیل

اس قانونِ الہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہتے کہ بنی نوع انسان کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان و اَلسنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے، انہیں ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جاتے جو زمان، مکان، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے، جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہمکنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدی، یہ ہے نصب العینِ ملتِ اسلامیہ کا (مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے نام)

یہ تھا وہ اسلام جسے نبی اکرمؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور اپنے بے مثال عمل سے اسے مشکل کر کے دکھا دیا۔ اس ”بے مثال عمل“ کا مفہوم یہ ہے کہ حضورؐ اس دین کو لوگوں کے سامنے علی و جر البصیرت پیش کرتے تھے۔ اس کی غایت اور حکمت کو دلائل و براہین سے سمجھاتے تھے۔ مخالفین کے اعتراضات کا علم و دانش کی رو سے جواب دیتے تھے۔ انہیں اس پر مدبر و متفکر کی رو سے غور کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ جو اس طرح دل و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ اسے بہ طیب خاطر قبول کرتا تھا اسے اپنی جماعت میں شامل کر لیتے تھے۔ یہ تھی وہ جماعت جس نے دین کا معاشرہ تشکیل کیا۔ اس جدید معاشرہ نے چند دنوں میں ایسے انسانیت ساز و درخشنده نتائج پیدا کئے جو اس کی صداقت کا زندہ ثبوت بنتے چلے گئے۔ اس طرح اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور دنیا نے ایک ایسا نظام دیکھ لیا، جس میں نہ کوئی انسان دوسرے انسان کا محکوم تھا نہ محتاج۔ ہر فرد قوانینِ خداوندی کے حدود کے اندر رہتے ہوئے، سرفرازی اور آزادی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ یہی وہ آزادی ہے، جس سے اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما اس انداز سے ہو جاتی تھی کہ وہ اس زندگی سے اگلی زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا تھا۔ اسی کو عاقبت سنو نا کہتے ہیں۔ دین کے اس نظام میں نہ ملوکیت کا کوئی تصور تھا نہ سرمایہ داری کا، نہ خانقاہیت کا کوئی دخل تھا نہ مذہبی پیشوائیت کا۔ احترامِ آدمیت اس کا شعار تھا اور شرفِ انسانیت، سوسائٹی میں ملجس کا معیار اس میں، (حضرت عمرؓ کے الفاظ میں) بڑے سے بڑا طاقتور کمزور ترین انسان تھا، جب تک اس سے مظلوم کا حق نہ دلوایا جائے اور کمزور سے کمزور انسان، سب سے زیادہ طاقتور تھا، جب تک اس کا چھینا ہوا حق اسے واپس نہ مل جائے۔

اسلامی معاشرہ

یہ تھا وہ اسلام جسے خدا نے انسانوں کے لئے بطور نظامِ حیات تجویز کیا تھا لیکن اس کے بعد اس قوم نے اس اسلام کی ایک ایک شق کو پس پشت ڈال دیا اور اس کی جگہ انسانوں کے خود ساختہ مذہب نے لے لی، جس میں ملوکیت

اسلام کی ایک ایک شق کو پس پشت ڈال دیا اور اس کی جگہ انسانوں کے خود ساختہ مذہب نے لے لی، جس میں ملوکیت

سرمایہ داری، خانقاہیت، پیشوائیت، غرضیکہ وہ تمام عناصر ایک ایک کر کے آگئے، جنہیں اسلام نے آکر مٹایا تھا۔

علامہ اقبال کے الفاظ میں، اس قوم میں یہ عجیب انقلاب آیا کہ

بعد کا اسلام

خود طلسم قیصر و کسری شکست

خود سر تخت ملوکیّت نشست

ان کے دنیاوی معاملات، ارباب حکومت نے اپنے زیرِ اقتدار لے لئے اور مذہب نام رہ گیا چند نظری عقائد اور بے جان رسومات کے مجموعے کا۔ معتقدات میں اسی قسم کی بحثیں شروع ہو گئیں (اور ان کے اختلاف پر خون کی ندیاں بہنے لگیں) کہ آدم کی روح درحقیقت خدا کی رُوح ہے یا اس سے الگ ہے۔ خدا کی صفات قدیم ہیں یا حادث، قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ خدا اپنی معلومات کے خلاف بھی ارادہ کر سکتا ہے یا نہیں۔ انسان اپنے اعمال کے آپ خالق ہیں یا نہیں۔ خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں۔ اہل جنت کو خدا کا دیدار ہو گا یا نہیں۔ کیا خدا کو اس کی قدرت ہے یا نہیں کہ اہل بہشت کی نعمتوں اور اہل دوزخ کے عذاب میں کمی بیشی کر سکے۔ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں۔ عذاب و ثواب کا دیا جانا خدا کی مرضی پر ہے یا انسان اپنے عمل سے اس میں تبدیلی کر سکتا ہے۔ حوض کوثر کی لمبائی چوڑائی کتنی ہے۔ جنت کے آنچوروں کی ضخامت کتنی بڑی ہے۔ وہاں کے انگوروں کا خوشہ کتنا کتنا بڑا ہے۔ یہ معتقدات کی بحثیں مسائل اس قسم کے داخلِ تعلیم ہو گئے کہ مسواک کو مٹھی بھر پکڑنے سے بوسیر ہو جاتی ہے۔ مسواک کو چوسنے سے انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ دودھ حوض میں آدمی کا پیشاب پڑ جائے تو وہ پاک رہتا ہے؟ کنوئیں میں چوبے کی دم کٹ کر گر جائے تو اس کا پانی کس قدر نکالنا چاہیے؟ چوبے کا پیشاب پاک ہے یا نہیں؟ سوراگر نمک سار میں گر کر نمک بن جائے تو اسے کھالینا چاہیے یا نہیں؟ لونڈی کا دودھ فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں۔

یا اس قسم کے مسائل کہ غسل، پانی کے کتنے لوٹوں سے کرنا چاہیے۔ سر کے مسح میں ہاتھ کہاں تک پہنچے چاہئیں۔ اگر قرائت میں ض اور ظ، ص اور س، ط اور ت میں فرق نہ کیا جائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے یا نہیں وغیرہ۔

یہ ہیں وہ معتقدات، نظریات اور مہمات مسائل جن کے حل کرنے میں قوم کی ساری توانیاں، وقت اور روپیہ صرف ہونے لگا۔ آج تک اُمتِ انہی مباحث میں اُلجھے چلی آ رہی ہے اور اس کا نام دین کی خدمت اور جہادِ عظیم قرار پا چکا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی آخری کتاب ”ارمغانِ حجاز“ میں (جوان کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی)۔ ابلیس کی

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ مجلسِ شوریٰ کے عنوان سے ایک طویل، لیکن بڑی دل چسپ اور پُر معنی نظم لکھی ہے، جس میں قوم کی اس حالت پر خون کے آنسو بہاتے گئے ہیں۔ ابلیس

اپنے تمام مشیروں کو جمع کر کے ایک کانفرنس منعقد کرتا ہے تاکہ اس سوال پر غور کیا جائے کہ ابلیسی پروگرام کو کس گوشے کی طرف سے سب سے زیادہ خطرہ ہے اور اس خطرہ کی روک تھام کس طرح کی جائے۔ ابلیسی چوڑی بحث کے بعد ابلیس اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
اس کے بعد وہ اپنا مطلب ذرا تفصیل سے بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآن نہیں ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری راتیں بے یار و بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستین
عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہے لیکن یہ خوف ہونہ جالتے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
وہ شرعِ پیغمبر جو ہر طاغوتی قوت کے لئے سامانِ موت ہے۔

الحذر آئینِ پیغمبر سوارِ الحذر حافظِ ناموسِ زن، مرد، آزما، مردِ آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے نئے کوئی فغفور و غاقاں نے فقیرہ نشیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
اس کے بعد وہ مشیروں سے کہتا ہے کہ

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں
مشیروں نے پوچھا کہ اس کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا کہ اس کا علاج بہت سہل ہے۔ تم اس قوم کو اس قسَم مسائل میں الجھائے رکھو کہ

ابنِ مریمؑ مرگیا یا زندہ جاوید ہے ہیں صفاتِ ذاتِ حقِ حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلامِ اللہ کے الفاظِ حادث یا قدیم اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیقہ میں بخات
کیا مسلمان کے لئے کافی نہیں اس دور میں یہ الہیات کے ترشے ہوئے لات و منات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کرم سے تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہر ہوں ملت
خیر اسی میں ہے قیامت تک ہے مومن غلام چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

تمہارے کرنے کا کام یہ ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اُسے پختہ ترکہ دو مزاج خانقاہی میں اُسے

برادرانِ عزیز! ایک اسلام وہ تھا جسے محمد رسول اللہ والذین معہہ نے پیش کیا تھا، جس سے اقوامِ عالم کی امامت ہمارے حصے میں آگئی تھی اور ایک اسلام ہمارا آج کا ہے، جس سے ہمارا (یعنی مسلمانانِ عالم) کا شمار دنیا کی بہت ترین قوموں میں ہوتا ہے۔

یا وسعتِ افلاک میں تبکیہ مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدامست یہ مذہبِ کلا و نباتات و جمادات
لیکن وہ اسلام جس نے اس وقت ہمیں وہ سرفرازیں عطا کی تھیں، ہمارے پاس آج بھی خدا کی زندہ و پائیدہ کتاب میں محفوظ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسے ایک نظام کی شکل میں مشکل کرنے کی سعادت کس کے حصے میں آتی ہے۔

والسلام

شُرک

(ایک درسِ قرآن)

دسمبر ۱۹۶۲ء

شُرک کو اللہ تعالیٰ نے جرمِ عظیم قرار دیا ہے۔ ایسا جرم جس کی بخشش نہیں ہو سکتی۔ سوال یہ ہے کہ شُرک کیا ہے اور وہ کیوں اس قدر سنگین جرم ہے؟ شُرک کے متعلق عام تصور یہی ہے کہ خدا کے سوا دوسروں کی پرستش کرنا شُرک ہے اور اس کی محسوس اور بین مثال بُت پرستی ہے۔ اور چونکہ مسلمان بُتوں کو نہیں پوجتا، اس لئے وہ

شُرک کا عام تصور

مطمئن رہتا ہے کہ میں شُرک کا مرتکب نہیں ہوتا۔ یہ ہوا شُرک۔ اب رہی یہ بات کہ اسے اللہ تعالیٰ نے ایسا سنگین جرم کیوں قرار دیا ہے تو اس کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ خدا بھلا اسے کس طرح برداشت کر سکتا ہے کہ اس کے ساتھ اوروں کی بھی پرستش کی جائے، یعنی اس سے چونکہ (معاذ اللہ) خدا کا کچھ بگڑتا ہے یا اس کی غیرت اسے گوارا نہیں کر سکتی کہ کسی کو اس کا ہمسر بنا دیا جائے، اس لئے وہ اس جرم کو کبھی نہیں بخشا۔ آپ غور کیجئے کہ اس توجہہ کی رُو سے خود خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایک شُرک پر ہی کیا موقوف ہے، خدا کی عبادت، اس کے احکام کی فرماں برداری، حقوق اللہ کی ادائیگی وغیرہ کے سلسلے میں جو عام عقیدہ ہمارے ہاں رائج ہے، اس کی رُو سے خدا کے متعلق تصور ہی یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے کچھ اپنے مقاصد ہیں، جنہیں وہ اس طرح ہم سے پورے کرانا چاہتا ہے۔ جب ہم قرآن کریم کی وہ آیت سنتے ہیں، جس میں کہا گیا ہے کہ ہم نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں۔

(وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ) (۵۱/۵۶) تو اس سے ہمارے اس عقیدہ کو اور پختگی حاصل ہو جاتی ہے کہ خدا کے سامنے کوئی اپنا پروگرام تھا جس کی تکمیل کے لئے اس نے ہمیں پیدا کر کے یہ فریضہ عائد کر دیا کہ ہم اس کی عبادت کرتے رہیں۔ خدا کے متعلق یہ تصور صحیح نہیں۔ وہ اپنے کسی پروگرام کی تکمیل کے لئے کسی کا محتاج نہیں۔ (فَإِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ مِنَ الْعَالَمِينَ)۔ (۳/۹۶) وہ جو احکام ہمیں دیتا ہے اس لئے نہیں کہ ان کی بجا آوری سے کچھ اس کا سہوتا ہے۔ اور اگر ان کی تکمیل نہ کی جاتے تو اس سے کچھ اس کا بگڑتا ہے۔ قطعاً نہیں۔ ان

خُ کے متعلق تصور | احکام کی بجا آوری سے کچھ ہمارا ہی سہوتا ہے اور ان کی خلاف ورزی سے

ہمارا ہی نقصان ہوتا ہے۔ اس طرح خدا پر ایمان لانے سے بھی ہمارا ہی ایک عظیم مقصد حاصل ہوتا ہے اور اس سے انکار کرنے سے ہمارا ہی نقصان ہوتا ہے۔ خدا تو اس وقت بھی خدا تھا جب اسے کوئی ماننے والا نہیں تھا اور اگر آج بھی دنیا کے تمام انسان اس کی استی سے انکار کر دیں تو اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ (بلا تمثیل) سورج اس زمانے میں بھی اسی طرح روشنی دیتا تھا جب کوئی آنکھ اسے دیکھنے والی نہیں تھی اور آج اگر ساری دنیا کے انسان اپنی آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائیں تو اس سے سورج کا قطعاً کوئی نقصان نہیں ہوگا، خود انسان ہی کا نقصان ہوگا۔ لہذا خدا کو وعدہ لا شرک ماننے سے بھی خدا کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، نہ ہی اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کرنے سے اس کا کچھ بگڑتا ہے۔ "ایک خدا" ماننے میں ہمارا ہی فائدہ ہے اور اس کے ساتھ اوروں کو شریک کرنے سے ہمارا ہی نقصان۔ اور یہ نقصان اتنا بڑا ہے کہ اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ یہی مفہوم ہے اس ارشاد خداوندی کا کہ شرک بخشا نہیں جاسکتا۔ شرک کے اس "نقصان عظیم" کی تفصیل تو طول طویل ہے لیکن قرآن نے اپنے مخصوص معجزانہ انداز سے اس تفصیل کو دو لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا۔ جب کہا کہ سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الشُّكَّ بِمَا أَشْرَكُوا يَا اللَّهُ مَا لَمْ يَنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا (۳/۵۰) جو لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں، ہم ان کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے۔ ان پر خوف طاری ہو جائے گا۔ اس لئے کہ وہ خُ کے ساتھ اسے شریک ٹھہراتے ہیں، جس کی کوئی سند خدا نے نازل نہیں کی۔ بات بالکل واضح ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ شرک سے انسان کے دل میں خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں۔

ہر کہ ریز مصطفیٰ فہیہ است شرک را در خوف مضمر دید است

اس کے برعکس ایک خدا کو ماننے والے (مومنین) کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲/۳۸)

ان پر کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوتا۔ یعنی شرک سے خوف پیدا ہوتا ہے اور توحید کا لازمی نتیجہ بے خوفی ہے اور یہ مومن اور مشرک کا بنیادی خط امتیاز ہے۔ آیت ہم قرآن کریم سے اس اجمال کی تفصیل دیکھیں۔

مظاہرِ فطرت کی پرستش | جب ذہن انسانی عہدِ طفولیت میں تھا (اور اب بھی دنیا کی بیشتر آبادی کا ہی عالم ہے) تو وہ فطرت کی مختلف قوتوں کو دیوی دیوتا

سمجھ کر ان کے حضور جھکتا اور گڑا کرتا تھا۔ بجلی چمکی اور وہ سہم کر ہاتھ باندھنے لگ گیا۔ بادل گر جا اور وہ ڈر کر سجدے میں گر گیا۔ دریا کی طغیانوں کو دیکھا تو وہ کانپ اٹھا۔ چیچک یا طاعون جیسی دہائی بیماریاں بھوٹیں اور اس نے کسی ان دیکھی قوت کے سامنے ڈنڈوٹ بجالانا شروع کر دیا۔ غرضیکہ ایک انسان تھا اور اسے چاروں طرف بلاؤں کا ہجوم نظر آتا تھا، جن سے وہ ہر وقت ڈرتا، کانپتا رہتا تھا۔ خوف، ہر طرف سے خوف، ڈر، چاروں طرف سے ڈر، یہ تھی اس وقت انسان کی زندگی۔ اس سے بچنے کے لئے اسے اس کے سوا کچھ نہیں سوچتا تھا کہ وہ ان دیکھی قوتوں کو "خدا" سمجھ کر انہیں راضی رکھنے کے لئے کوشش کرے۔ انہی ان دیکھی قوتوں کو اس نے محسوس شکلوں میں تراش کر بت پرستی شروع کر دی۔

انسان یہ کچھ کیوں کرتا تھا؟ اس کے لئے کہ وہ اپنے مقام سے آشنا نہیں تھا۔

قرآن آیا اور اس نے انسان سے کہا کہ **وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَعَلْنٰہٗٓ اٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّرٰہٗ** (۲۵/۱۳) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، وہ سب قانون کی زنجیروں میں جکود **قرآن کا پیغام** | دیا گیا ہے تاکہ انسان ان سے کام لے سکے۔ اس نے داستانِ آدم کے تمثیلی انداز

میں بتایا کہ طائفہ سب انسان کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ فطرت کی کوئی قوت ایسی نہیں جو انسان کے سامنے نہ جھک سکے۔ قرآن کی اس ایک انقلابی آواز نے ساجد کو مسجود اور مسجود کو ساجد بنا دیا۔ اس نے بتا دیا کہ جو انسان اپنے آپ کو فطرت کی ان قوتوں سے فردِ ترا اور کمزور سمجھتا ہے، وہ مقامِ آدمیت سے گرا ہوا ہے۔ انسان ان قوتوں (دیوی، دیوتاؤں) کو اپنے سامنے جھکانے کے لئے آیا ہے، ان کے سامنے جھکنے کے لئے نہیں آیا۔ جو ان کے سامنے جھکتا ہے، اپنی تذلیل کرتا ہے۔ جو انہیں اپنے سے بڑا مانتا ہے، اپنے شرف اور فضیلت سے انکار کرتا ہے۔

اس سے آپ نے دیکھا کہ فطرت کی قوتوں کو خدا ماننے والا اور ان کے محسوس مظاہر (مٹی اور پتھر کی مورتیوں، بتوں) کے سامنے جھکنے والا خدا کا کچھ نہیں بگاڑتا، اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے۔

فطرت کی قوتوں سے آگے بڑھے تو بعض انسانوں نے دوسرے انسانوں کے سامنے جھکنا شروع کر دیا۔ راجہ کو

ایشور کا اوتار، سلطان کو ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) بادشاہوں کو خدائی اختیارات کا حامل سمجھ کر ان کے حضور گڑا کر انا شروع کر دیا۔ انہیں ان داتا (رزق دینے والا) تصور کر کے

انسانوں کی پرستش

ان سے ڈرنے اور کاہنے لگا۔ راجہ اور بادشاہ تو خیر پھر بھی محسوس قوتوں کے مالک تھے، اس نے مذہبی پیشواؤں اور رومانی مقتداؤں کو قضا و قدر کے احکامات کا مالک سمجھ کر ان کی پرستش شروع کر دی۔ وہ انہیں راضی رکھنے کے لئے ان کے آستانوں پر جتہ سائی کرنے لگا اور ان کے احکام کی خلاف ورزی کے تصور تک سے کاہنے لگا۔ "خلاف ورزی احکام" تو ایک طرف اگر ان کی شان کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی خیال گزرا تو سہم گیا کہ نہ معلوم اب کیا قیامت آجائے گی۔ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ یہاں تک بڑھ گیا کہ زندہ انسان تو ایک طرف مردوں تک کے متعلق یہ عقیدہ قائم کر لیا گیا کہ وہ بڑی قوتوں کے مالک ہیں۔ ان کے اختیارات بڑے وسیع ہیں۔ ان کو خوش کر

مردوں کی پرستش

دینے سے انسان کی مرادیں برآتی ہیں۔ ان کی ناراضگی سے مہبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں، جن سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔

قرآن آیا اور اس نے کہا کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کو خدا بنا کر اس سے ڈرنا اور کانپنا انسانیت کی انتہائی تذلیل ہے۔ کسی انسان کو دوسرے انسان پر کسی قسم کا اختیار و اقتدار حاصل نہیں۔ انسان ہونے کی ہمت سے سب برابر اور یکساں طور پر واجب التکریم ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَلُكُمْ — (۱۹۴/۷) جن لوگوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ تمہارے جیسے (خدا کے) بندے

ہیں۔ تم انہیں جن قوتوں کا مالک سمجھتے ہو ان کی حیثیت کڑی کے جالے سے زیادہ کچھ نہیں۔ کڑی کے جالے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے سے کمزور

مساواتِ انسانیت

کو پھانس لیتا ہے لیکن صاحبِ قوت کے سامنے ایک سیکنڈ کے لئے نہیں ٹھہر سکتا۔ مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَاءَ كَمَثَلِ الْعَنَكَبُوْتِ اِذَا أَخَذَتْ بَنِتًیً وَاِذَا وَهَنَ الْبُیُوتُ لَبِیْتُ الْعَنْكَبُوْتِ (۲۹/۴۱) جو لوگ اللہ کے سوا اوروں کو اپنا کارساز و کار فرما سمجھ لیتے ہیں ان کی مثال کڑی سی ہے۔ وہ ایک گھر بناتی ہے لیکن کیسا گھر؟ دنیا میں سب سے زیادہ کمزور گھر۔ انسان جن اپنے جیسے انسانوں کو اپنا "خدا" بنا لیتا ہے، ان کی اپنی قوت کچھ نہیں ہوتی۔ جب تک انہیں خدا مانتے رہتے وہ خدا بننے بیٹھے رہتے ہیں۔ جب انہیں ایسا ماننا چھوڑ دیجئے ان کی خدائی ختم ہو جاتی ہے۔

ایں خدا تا سجدہ اشش کردی خداست چو یکے اندر قیام آئی فناست
لہذا کسی انسان کو خدا بنا کر اس کے سامنے جھکنا شرفِ انسانیت کی انتہائی تذلیل ہے اور جب زندہ انسان کے
سامنے جھکنے کی یہ کیفیت ہے تو مردہ انسان کے حضور زندہ انسان کا جھکنا اور اس کے سامنے گڑاٹانا انسانیت کی ایسی
ذلت ہے، جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اس سے ظاہر ہے کہ انسانوں کو خدا بنالینے والا خدا کا کچھ نہیں بگاڑتا، اپنے ہاتھوں آپ ذلیل ہوتا ہے۔
قرآن نے انسان سے کہا کہ تیری دنیا میں تجھ بلکہ مقام کسی کا نہیں۔ فطرت کی قوتیں سب
مقامِ آدم تیری غلام ہیں، تو ان کا مخدوم اور مسجود ہے۔ باقی رہے انسان، سو انسان ہونے کی حیثیت

سے سب ایک جیسے ہیں۔

ہاں! انسان سے بلند اور بالا مقام صرف ایک ہستی کا ہے اور وہ ہے ذاتِ خداوندی، جس نے تمام کائنات
کو پیدا کیا اور خود انسان کو بھی، لیکن خدا کی ذات بھی ایسی نہیں جس سے انسان ڈرے اور سہمے۔ ڈرنا اور کانپنا اس سے
ہوتا ہے جس کے پاس قوت بے پناہ ہو لیکن وہ کسی قاعدے اور قانون، ضابطے اور
قانون والا خدا اصول کا پابند نہ ہو۔ جس کے متعلق معلوم ہی نہ ہو کہ وہ کس بات سے ناراض ہو جائے

گا اور کس سے خوش، وہ کب خلعت بخش دے گا اور کب کھال کھینچو ادے گا۔ قرآن نے بتایا کہ خدا کی ذات ایسی
نہیں۔ اس کی قوتیں بے شک لامحدود ہیں لیکن وہ ان کا استعمال (معاذ اللہ) اندھا دھند نہیں کرتا۔ ان اصولوں کے
ماتحت کرتا ہے جو اس نے خود وضع کئے ہیں اور جن پر وہ خود اپنی مرضی سے پابند ہے اور پابند بھی ایسا کہ ان سے کبھی
ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا۔ (۳۵/۴۳) اور تم خدا کے اصولوں میں کبھی تغیر و
تبدیل نہیں دیکھو گے۔ اگر تم اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق کام کرتے جاؤ گے تو تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے
گا اور اگر ان کی خلاف ورزی کرو گے تو اس کے تباہ کن نتائج سے تمہیں کوئی بچا نہیں سکے گا۔ وَإِنْ يَحْسَبِ اللَّهُ
بِضُرَّتِكُمْ لَا يَافِكُمْ إِلَّا هُودٌ وَإِنْ يُرِيدُ أَنْ يَمُوتَ فَلاَ سَآءَ لِفَضْلِهِ (۱۰/۱۰۷) اگر قانون
خداوندی کے مطابق تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچ رہا ہو تو کوئی نہیں جو اسے رفع کر سکے اور اگر اس کے قانون کے مطابق کچھ
فائدہ پہنچ رہا ہو تو کسی کی طاقت نہیں جو اس شفع کو تم تک پہنچنے سے روک لے۔

خو رکھئے۔ جس صاحبِ اقتدار کی کیفیت یہ ہو کہ اس نے ہر کام کے نتیجے کے لئے
خوف سے مامون غیر متبدل قوانین مرتب کر دیئے ہوں اور اس میں کبھی کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوتی ہو،

اس کی مملکت میں رہنے والے انسان کس قدر خوف سے مامون ہوں گے۔ انہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت ہی نہیں ہو گی۔ وہ ڈریں گے تو قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے ڈریں گے۔ (اس کو خَشْيَةَ اللَّهِ - یا خدا سے ڈرنا کہتے ہیں)۔ جیسے ہم آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ڈرتے ہیں۔ اگر ہم ان قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتے تو ہماری لئے ڈرنے اور خوف کھانے کی کوئی بات نہیں۔ اور چونکہ ساری کائنات میں قانون صرف خدا کا کارفرما ہے، اس میں کوئی اور قوت شریک نہیں۔ (وَلَا يُشْرِكْ فِي حُكْمِهِ أَحَدٌ - ۱۸/۲۶) اس لئے قوانین خداوندی کا اتباع کرنے والے کو نہ کسی سے ڈرنے کی ضرورت ہے نہ کسی کے سامنے جھکنے اور گڑگڑانے کی حاجت۔ خواہ وہ فطرت کی کوئی قوت ہو یا کوئی مردہ یا زندہ انسان، وہ کسی سے نہیں ڈرتا، کسی سے خوف نہیں کھاتا۔ وہ کائنات میں سر اٹھا کر چلتا ہے اور دنیا کی بڑی سے بڑی جو کھٹ سے مستانہ دار گزر جاتا ہے۔ اس کے شرفِ انسانیّت کو کہیں ٹھیس نہیں لگتی۔ کسی مقام پر اس کی تذلیل نہیں ہوتی۔ وہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کی زندہ شہادت ہوتا ہے۔ اسے ہر طرح کا امن حاصل ہوتا ہے۔ (ایمان کا لازمی نتیجہ امن ہے۔ اس کا مادہ ہی ا۔ م۔ ن ہے۔ مومن وہ ہے جو خود بھی امن میں ہو اور دوسروں کو بھی امن میں رکھے۔ وہ نہ خود کسی کے سامنے جھکے، نہ کسی کو اپنے سامنے جھکاتے) لوگوں کے سامنے عام طور پر شرک کی ایک ہی شکل تھی یعنی بت پرستی لیکن قرآن کریم کی ننگہ دور رس اور جز گیر نے ان محسوس پیکروں سے آگے بڑھ کر ان "خداؤں" کی بھی نشاندہی کر دی جو انسان کے قلب کی گہرائیوں میں پوشیدہ اور اس کے خون کے ذرات میں حلول کردہ ہوتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ توحید نام ہے خالصتاً قوانین خداوندی کے اتباع کا۔ آپ کو معلوم ہے کہ انسان کو قانون کے اتباع سے کون سی چیز روکتی ہے؟ اس کے جذبات، لہذا جو انسان قوانین خداوندی کو چھوڑ کر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے، قرآن کریم اس کو بھی مشرک قرار دیتا ہے۔ وہ کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ (۲۵/۴۳) کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا، جس نے خود اپنے جذبات ہی کو اپنا الہ بنا لیا۔ جب انسانی جذبات قوانین خداوندی سے سرکش برت کر اپنی من مانی کرنے لگیں تو قرآن اسے شیطنیت سے تعبیر کرتا ہے اور شیطان کے متعلق واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ اس کا غلبہ مشرکین پر ہوتا ہے۔ (۱۶/۱۰۰) یعنی انسان کا قوانین خداوندی کو چھوڑ کر خود اپنے جذبات کے پیچھے لگ جانا شرک ہے اور ایسا کرنے والا مشرک۔

اسی طرح قرآن نے فرقہ پرستی کو بھی شرک قرار دیا ہے۔ (۳۰/۳۱) اس لئے کہ اس میں بھی انسان قوانین خداوندی کے اتباع کی بجائے اس انسان یا انسانوں کے گروہ کا اتباع کرتا ہے، جن کی طرف وہ فرقہ منسوب ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے

کہ ایسا شخص خدا کے احکام کی خلاف ورزی سے اس قدر نہیں ڈرتا جس قدر اپنے فرقہ کے بانی یا اس کے نمائندے کے کسی حکم کی نافرمانی سے خوف کھاتا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم کی رو سے شرک کیا ہے؟ کسی چیز کو اس کے صحیح مقام پر نہ رکھنا شرک ہے۔ مثلاً ۱۔ فطرت کی قوتوں کا مقام یہ ہے کہ وہ انسان کی خادم اور تابع تسخیر میں، انہیں انسان سے بلند و بالا سمجھنا انہیں ان کے صحیح مقام سے ہٹا دینا ہے۔

۲۔ تمام انسان، انسان ہونے کے اعتبار سے یکساں طور پر واجب التکلیف ہیں۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان کو اپنے سامنے جھکائے۔ لہذا کسی انسان کو یہ حیثیت دے دینا کہ دوسرے انسان اس کے سامنے جھکیں اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینا ہے۔

۳۔ ”مردہ بدست زندہ“ عام محاورہ ہے اور حقیقت پر مبنی لیکن مردوں کو ایسا صاحب اقتدار سمجھ لینا کہ وہ زندہ انسانوں کے مقدرات کو بنا اور بگاڑ سکتے ہیں، مردہ کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینا ہے۔

۴۔ خدا کی ذات ایسی ہے کہ انسان اس کے قوانین کا اتباع کرے اور اس میں کسی اور کو شریک نہ کرے۔ اس اطاعت اور اتباع میں کسی اور کو شریک سمجھ لینا خدا کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینا ہے۔

”کسی شے کو اس کے اصلی مقام پر نہ رکھنے“ کو عربی میں خلم کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ قرآن کریم کی رو سے سب سے بڑا ظلم شرک ہے اور اسی حقیقت کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے، جب کہا ہے کہ

إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (۳۱/۱۳)

شرک ظلم عظیم ہے۔ اس میں کوئی شے اپنے اصلی مقام پر نہیں رہتی۔ باقی چیزوں کو تو چھوڑیے، اس میں انسان اپنے بلند اور رفیع مقام سے اس بُری طرح گرتا ہے کہ اس کے شرف و مجد کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ دیکھئے قرآن نے اس حقیقت کو کیسے دل نشیں انداز سے بیان کیا ہے، جہاں کہا ہے کہ

وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنْ سَمَاءٍ ————— جو اللہ سے شرک کرتا ہے، اس کی مثال یوں سمجھو جیسے کوئی شخص آسمان کی بلندیوں سے

زمین کی پستیوں پر آگے۔ فَنَحْطَطُهُ الْاُطْرُفَ۔ پھر اسے کوئی عقاب یا چیل اُچک کر لے جائے۔ اَوْ تَهْوِي بِدِلْسٍ يُعِي فِي مَكَانٍ سَجِيٍّ (۳۲/۳۱)

یا جیسے گھاس کا کوئی تنکا ہوا جسے تند دیز ہوا ادھر ادھر اڑائے پھر اسے اور کسی دھڑ دھڑاز مقام پر لے جا کر پھینک دے۔ آپ نے دیکھا کہ شرک انسان کو کیا سے کیا کر دیتا ہے۔ یہ اس کے مقام آدمیت سے گرا کر ذلت و خواری

کی انتہائی پستیوں میں پہنچا دیتا ہے۔ وہ یوں ڈرا سہما ہوا رہتا ہے جیسے چڑیا کا نوزائیدہ بچہ گھونسلے سے نیچے گر پڑا ہو اور جس تیز جنگل والے پرندے کا جی چاہے اسے اچک کر لے جائے۔ وہ اس قدر بے وزن اور بے حقیقت ہو جاتا ہے کہ ہوا کا ہر تیز و تند جھونکا اسے ہدھر چاہتے اڑاتے اڑاتے پھرتا ہے۔ شرک سے یہ کیفیت ہو جاتی ہے اس انسان کی جسے خالق کائنات نے ایسا بلند اور مستحکم مقام عطا کیا تھا۔

اختیار و ارادہ

قرآن کریم نے انسان کا سب سے بڑا شرف یہ بیان کیا ہے کہ اللہ نے اسے صاحب اختیار و ارادہ بنایا ہے اور پھر اس کے اس شرف کا اس قدر احترام کیٹا کہ وہ اس کے اس اختیار و ارادہ کو اس سے کبھی نہیں چھینتا۔ وہ اس کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ اَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ (۲۰/۴۱) تم اپنے دائرۂ اختیارات میں اپنی "مشیت" کے مطابق کام کرو۔ تم اپنے فیصلوں کے مطابق جس طرح جی میں آئے کرو۔ یہ ہے انسان کا مقام بلند۔ لیکن شرک میں انسان اپنے اختیار و ارادہ کو دوسروں کے سپرد کر دیتا ہے اور اس طرح شرف انسانیت سے عاری ہو جاتا ہے۔ دیکھنے کہ اس باب میں قرآن کہاں تک آگے جاتا ہے اور انسان کو کس قدر بلند مقام تفویض کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شرک سے انسان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے فیصلوں اور کاموں کی ذمہ داری لینے سے ڈرتا ہے۔ اس میں اتنی جرأت نہیں رہتی کہ وہ مزید اُنکے کہ ہاں! میں نے یہ کیا ہے اور میں اس کا خمیازہ بھگتنے کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔ اس کے برعکس وہ چاہتا ہے کہ اپنے اعمال کی ذمہ داری دوسروں کے سر تھوپ دے۔ سورۃ نحل میں ہے۔ وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ (۱۶/۲۵) اور جو لوگ شرک کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کی عبودیت اختیار نہ کرتے۔ دیکھا آپ نے! شرک سے انسان کے حوصلے کس قدر پست ہو جاتے ہیں۔

شرک کی خرابیاں

تصویحات بالا سے یہ نکتہ واضح ہو گیا ہو گا کہ شرک سے مفہوم کیا ہے اور اس سے قرآن کریم نے اس شدت سے کیوں منع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کائنات میں بہت بلند مقام عطا کیا ہے لیکن شرک سے انسان اپنے آپ کو اس بلند مقام سے گر کر ذلت و پستی کے عمیق گڑھے میں جا پہنچتا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے۔ وَكَذَٰلِكَ نَكْذِبُ عَنْ قُلُوبِنَا ذِكْرَ آلِهَتِنَا لِئَلَّا نَكْذِبَ عَنْ قُلُوبِنَا ذِكْرَ اللَّهِ وَلَكِنْ لَّعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ (۷/۱۷) یعنی ہمارے قلوب کا اتباع کہہ کے دنیا میں سرفرازی سے چلنے کے بجائے اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے اور یوں شرف و

مجد کی بلندیوں سے گر کر ذلت و خواری کی پستیوں میں جا پہنچتا ہے۔ یہ ہے شرک کا نتیجہ، یعنی اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا، خود انسان اپنے بلند مقام کو کھو دیتا ہے اور یہ بہت بڑا نقصان ہے اور کوئی نقصان بھی ہو اس کی تلافی ہو سکتی ہے لیکن جب انسان اپنے مقام انسانیت ہی سے گر جائے تو اس نقصان کی تلافی کس طرح ہو سکتی ہے۔ یہی مطلب ہے قرآن کے اس ارشاد کا کہ **إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَخْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ط** (۴/۱۱۶) خدا کے قانون مشیت کے مطابق انسان کے ہر غلط اقدام کے نقصان رساں نتیجہ سے حفاظت کا سامان مل سکتا ہے لیکن جو نقصان شرک سے مرتب ہوتا ہے اس سے حفاظت نہیں مل سکتی۔ انسان اپنے مقام کو نہ کھوئے تو اس کی لغزشوں کی تلافی ہو سکتی ہے لیکن جب وہ اپنے مقام بلند ہی کو کھو بیٹھے تو اس نقصان کی تلافی کس طرح ہو سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ انسانیت کی دنیا میں شرک سے بڑا کوئی جرم نہیں۔ اس سے انسان اپنے بلند مقام سے گر جاتا ہے۔ قرآن کی ساری تعلیم کا مقصود و منہی انسان کو اس کے صحیح مقام تک پہنچا دینا ہے اور یہ توحید کے سوا ممکن ہی نہیں۔ یعنی اس ایمان کے سوا کہ جھکنا صرف تو ایمن خداوندی کے سامنے ہے، کسی اور کے سامنے نہیں۔

یہ ہے صحیح مقام انسانیت۔ !